پیمانۂ غزل

جلد اول

تالیف

محمد شمس الحق

پیمانۂ غزل

(جلد اوّل)

تالیف

محمد شمس الحق

کتاب : پیمانۂ غزل

تالیف : محمد شمس الحق

طبع اول : 2008ء

تعداد : ایک ہزار (1000)

مطبع : مارشل پرنٹنگ پریس، راولپنڈی

ناشر : نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

قیمت : 300-00 روپے

ISNB: 978-969-37-0278-1

انتساب

اپنے چچا شیخ محمد ابراہیم (مرحوم)

کے نام

جو بھوج پوری زبان میں شاعری کرتے تھے

فہرست

☆......☆☆......☆

مقدّمہ

تقریباً ہر بک اسٹال پر مجموعہ اشعار کی متعدد ایسی کتابیں دستیاب ہیں جن میں مرتب/ مرتبین نے مختلف موضوعات پر حروفِ تہجی کے اعتبار سے اپنی پسند کی غزل کے اشعار قارئین کی دلچسپی کے لیے درج کر دیے ہیں۔ ان مجموعوں میں نہ تو معیار پر توجہ دی گئی ہے اور نہ ہی غزل کے پورے ذخیرے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ وہ اشعار جو غلط ناموں سے منسوب ہو گئے ہیں یا جن اشعار میں تصرف ہو گیا ہے، مرتب/ مرتبین نے بغیر تحقیق کے ان اشعار کو جوں کا توں انتخاب میں شامل کر دیا ہے۔ بازار میں ایسی کتابیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں ان کتابوں کے مؤلفین نے اپنی پسند کے شعرا کی چند غزلیں جمع کر دی ہیں۔ ان مجموعوں سے کچھ شعرا کی چند غزلیں تو قارئین کے پڑھنے کو مل جاتی ہیں، لیکن ان کے بہترین اشعار تک رسائی نہیں ہوتی کیوں کہ پانچ سات یا اس سے زیادہ اشعار کی غزل میں عموماً ایک یا دو شعر ہی اچھے نکلتے ہیں اور باقی اشعار اوسط درجے اور بھرتی کے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت بھی ہوتی ہے کہ پوری غزل میں تمام اشعار سطحی ہوں۔ سالانہ بنیاد پر بھی شاعری کے انتخابات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کسی خاص دَور یا عہد کے شعرا کے کلام کا انتخاب بھی کیا جاتا ہے۔

۲) ہندوستان میں ایک ضخیم کتاب ''روحِ غزل'' (پچاس سالہ انتخاب) کے نام سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی جس میں مرتب نے ۶۹۳ شعرا کی تین تین غزلیں اور بعض شعرا کی تین سے زیادہ غزلیں شامل کر دی ہیں۔ ''بیسویں صدی کی اردو شاعری'' (نظمیں، مزاحیہ اشعار، غزلیں) کے نام سے ہندوستان سے ۲۰۰۰ء میں ایک ضخیم کتاب ۶۷۷ صفحات پر مشتمل شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پاکستانی ایڈیشن ۲۰۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ دونوں انتخابات بھی متذکرہ بالا سقم سے پاک نہیں ہیں۔ اردو غزل کے منتخب اشعار کے کئی اور مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں، مگر ان میں کسی مجموعہ میں بھی دَورِ قدیم سے دَورِ جدید تک صفِ اوّل، دوم اور اوسط درجے کے غزل گو شعرا کے بہترین اشعار درج نہیں ہیں۔

۳) ایک عرصے سے راقم الحروف کی خواہش تھی کہ ایک ایسا مجموعہ ترتیب دیا جائے جو دَورِ قدیم سے تا حال غزل گو شعرا کے منتخب معیاری اشعار پر مشتمل ہو۔ ''پیمانۂ غزل'' کے نام سے یہ انتخاب پیش خدمت ہے۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال اُبھرے کہ نظم کے مقابلے میں غزل کو کیوں ترجیح دی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو لطف اور شیرینی غزل میں ہے وہ نظم میں نہیں۔ نظم کو شروع سے اخیر تک پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے اور جو کچھ اس نے کہا ہے وہ صحیح طور پر اپنے مافی الضمیر کو ادا بھی کر سکا ہے یا نہیں۔ اس کے برخلاف غزل کا ہر شعر ایجاز و اختصار کا مکمل نمونہ ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کے گوناگوں مسائل مختصر الفاظ میں بیان کیے جاتے ہیں۔ غزل ایسی دل میں گھر کرنے والی اور مقبول صنفِ سخن ہے جو شدید مخالفتوں کے باوجود نہ صرف زندہ ہے بلکہ روز بروز ترقی کر رہی ہے:

غمِ دَوراں میں کہاں بات غمِ جاناں کی
نظم ہے اپنی جگہ خوب، مگر ہائے غزل

(فضل احمد کریم فضلی)

۴) اردو شاعری میں جتنی بھی اصناف سخن ہیں ان میں غزل سب سے زیادہ ہردلعزیز رہی ہے۔ دو مصرعوں میں کسی بات کو بیان کرنا آسان کام نہیں۔ نئے خیال کو نئے انداز سے مختصر الفاظ میں قلم بند کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ غزل میں اچھا شعر نکالنا نہایت مشکل کام ہے۔ اس میں طبع آزمائی کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ چونکا دینے والا شعر تو خال خال ہی شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دَور میں سیکڑوں غزل گو شعرا میں صرف چند کو قبول عام کی سند ملی ہے۔ بظاہر غزل ایک آسان صنف سخن معلوم ہوتی ہے مگر شاعر جب شعر کہنے بیٹھتا ہے، تب اُسے اصلیت کا پتا چلتا ہے:

کہتے ہیں، غزل قافیہ پیمائی ہے ناصرؔ
یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

(ناصر کاظمی)

بہ استثنائے چند اشعار اردو کے تمام زباں زدِ خاص و عام اشعار غزل ہی کے ہیں۔ غزل میں شروع ہی سے ہر طرح کا مضمون بیان ہوتا رہا ہے۔ غزل رمز و ایما کی شاعری ہے۔ غزل کا ہر شعر جداگانہ مضمون کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے ایک شعر میں بڑی سے بڑی تاریخی حقیقت محض ایک علامت یا استعارے کی شکل میں ظاہر کی جا سکتی ہے۔ بشرطے کہ شاعر زبان اور بیان پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ اشعار میں ہمہ گیری انھی علائم کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ غزل کی شاعری کا یہی کمال ہے جس نے غزل کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ روز بروز شعرا

اسے اپنا رہے ہیں۔

۵) نیاز فتح پوری نے لکھا ہے:

شاعری فی الجملہ اپنی جگہ مشکل ہو یا آسان لیکن اس کی وہ مخصوص صنف جسے غزل کہتے ہیں ایسی سخت امتحان گاہ ہے کہ اس سے کسی شاعر کا کام یاب گزرنا صرف فطرت کے فیضان پر موقوف ہے اور یہ دولت وسعادت بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔

پروفیسر نظیر صدیقی اپنی کتاب ''جدید اُردو غزل-ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

غزل اردو شاعری کی ایک ایسی دل آویز صنف ہے جس کی طرف کٹر سے کٹر نظم نگار بھی مائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جوش اور راشد اس بات کی اچھی مثالیں ہیں۔

نیاز فتح پوری نے غزل کو اردو شاعری کی روح، رشید احمد صدیقی نے اردو شاعری کی آبرو، ڈاکٹر یوسف حسن خاں نے موسیقی کا رس اور فراق گورکھپوری نے شاعری کا عطر کہا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی غزل صنف سخن ہی نہیں معیارِ سخن بھی ہے۔

۶) مختلف شخصیتوں نے اچھے شعر کی تعریف اپنے انداز میں بیان کی ہے۔ ایک تعریف یہ بھی ہے کہ اچھا شعر وہ ہوتا ہے جو متکلم کی زبان سے نکلتے ہی سامع کے دل تک فوراً پہنچ جائے۔ اس خیال کی تائید حسرت موہانی کے حسب ذیل شعر سے بھی ہوتی ہے:

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

کسی صاحب نے علامہ نیاز فتح پوری سے پوچھا، ''آپ کو غالب کا کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟''

نیاز نے جواب دیا، ''بڑا مشکل سوال ہے۔ میں کیا اگر آپ خود غالب سے پوچھتے کہ اس کا بہترین شعر کون سا ہے تو وہ بھی اس کا جواب نہ دے سکتا۔ کیفیات کے ساتھ پسندیدگی کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے، لیکن آپ یہ پوچھیں کہ اس کا بدترین شعر کون سا ہے تو بے شک میں بتا سکتا ہوں اور وہ یہ ہے:

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے''

پہلا مصرع بہت اچھا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں لفظ 'بھوں' طبیعت پر بہت گراں گزرتا ہے اور اسی ایک لفظ نے شعر کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس قسم کی دو ایک مثالیں ذیل میں درج ہیں:

برائے سیر مجھ سا رند مے خانے میں گر آئے
گرے ساغر، لنڈھے شیشہ، ہنسے ساقی، بہے دریا

(واجد علی شاہ اختر)

یہ شعر بذاتِ خود اچھا نہیں ہے۔ دوسرے مصرعے میں لفظ ''لنڈھے'' نے شعر کو اَور بھی پست کر دیا ہے:

چُنی تُو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستاروں میں کیا کیا چناں اور چنیں ہے

(ذوق)

غالباً پہلے مصرع میں لفظ ''چنی'' کے اعتبار سے دوسرے مصرع میں الفاظ ''چناں'' اور ''چنیں'' لایا گیا ہے۔ ''چناں'' اور ''چنیں'' نے شعر کو تیسرے درجے کا بنا دیا ہے:

سلوک غیر سے اتنا ضرور میں نے کیا
کہ اس پہ تھوپ دیا جو قصور میں نے کیا

(بیخود دہلوی)

پہلے مصرعے کا یہ مطلب ہے کہ جو قصور مجھ سے ہوا اسے میں نے غیر کے ذمے ڈال دیا لفظ ''تھوپ'' بروزن ''توپ'' پڑھ کر دل مکدر ہو جاتا ہے۔ ''تھوپ'' غزل کی زبان نہیں ہے۔

۷) بعض اشعار کسی خاص لفظ کی مناسبت سے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اسی ایک لفظ سے شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

زندگانی تو ہر طرح کاٹی
مر کے پھر جیونا قیامت ہے

(شاہ مبارک آبرو)

لفظ ''جیونا'' پرانی اردو ہے، جو اَب متروک ہے مگر یہاں یہ لفظ بہت اچھا معلوم ہو رہا ہے اور یہی لفظ شعر کی جان ہے:

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکے تجھ بغیر
اس گفتگو سے فائدہ، پیارے، گزر گئی

(سودا)

لفظ 'پیارے' سے شعر میں حُسن پیدا ہو گیا ہے۔

مصائب اَور تھے، پر دل کا جانا
عجب اِک سانحہ سا ہو گیا ہے

(میر تقی میرؔ)

لفظ ''سانحہ'' نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

گالیاں غیر سے سناتے ہو
ہاں میاں، اَور تم سے کیا ہو گا

(خواجہ امین الدّین امینؔ)

اس شعر میں لفظ ''میاں'' کا جواب نہیں:

ساقی گھٹا ہے، صحنِ چمن ہے، بہار ہے
اب کارِ خیر میں تجھے کیا انتظار ہے

(تمنّا عمادی)

''کارِ خیر'' کے ٹکڑے سے شعر بہت ہی پُر لطف ہو گیا ہے۔ مصرعِ ثانی آپ جتنی بار پڑھیں گے، اُتنی بار لطف اندوز ہوں گے:

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

(فیض احمد فیضؔ)

لفظ ''پیوند'' نے شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔

۸) ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب ''تحقیق وتنقید'' میں لکھتے ہیں:

یہ سچ ہے کہ کلام میں گیرائی و اثر کی متوازن ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے شاعرانہ فطانت کے ساتھ وسعتِ مطالعہ اور کہنہ مشقی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر بھی چوں کہ شاعری براہِ راست عبارت ہے شدّتِ خلوص وتاثّر سے، اس لیے کبھی کبھی متوسط اور ادنیٰ درجے کا شاعر بھی نہ صرف ہمیں چونکا دیتا ہے بلکہ اپنی بے مائیگی ونومشقی کے باوجود ایسی بات کہہ جاتا ہے کہ بڑے بڑے کہنہ مشق مُنہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ چناں چہ اگر سنجیدگی کے ساتھ

معمولی سے معمولی درجے کے شاعر کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو کچھ نئی باتیں ضرور ہاتھ آجائیں گی۔ مگر آج کل کی مصروف زندگی میں کسے فرصت ہے کہ سنگ ریزوں کے ڈھیر میں ایک دو موتیوں کے لیے جان کھپاتا پھرے اور نتیجہ یہ ہے کہ معمولی یا اوسط درجے کے شاعر کے غیر معمولی نشتر بھی منظرِ عام پر نہیں آجاتے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ٹھیک کہا ہے کہ آج کل مصروف زندگی میں کسے فرصت ہے کہ اوسط اور معمولی درجے کے شعرا کے غیر معمولی اشعار کو منظرِ عام پر لائے۔ ''پیمانۂ غزل'' (جلد اوّل وجلد دوم) ۸۷۰ رسے زائد شعرا کے کلام پر مشتمل ہے۔ ان دونوں جلدوں میں صفِ اوّل کے تقریباً ۳۰ رشاعر شامل ہیں۔ درجۂ دوم کے شاعروں کی تعداد ۱۳۵ رکے لگ بھگ ہے۔ باقی اوسط درجے کے شاعر ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اوسط درجہ کے شعرا کے غیر معمولی اور اچھے اشعار انتخاب میں ضرور آجائیں۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ کسی شاعر کا نمائندہ شعر چھوٹنے نہ پائے۔ اس میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ اہلِ ذوق کریں گے۔

۹) معروف نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے:

ہر دَور کا ادب صفِ اوّل کے شاعروں اور ادیبوں سے نہیں بنتا۔ اس کی تعمیر میں اوسط درجے اور چھوٹے شاعروں کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کسی بڑے شاعر کا۔ ایک مجموعی ادبی فضا ہوتی ہے جو چھوٹے بڑے شاعروں میں مل کر پیدا ہوتی ہے۔ کسی دَور کے ادب کے اچھے یا برے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس دَور کے چھوٹے شاعروں کا کلام اچھا یا برا ہے؟ اس دَور کی مجموعی فضا کیسی ہے؟ فضا چھوٹے بڑے تمام ادیب مل کر بناتے ہیں۔ یہ کسی ایک ادیب یا شاعر کے بس کی بات نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو۔

مجتبیٰ حسین اپنی کتاب ''آغا شاعر۔ حیات وشاعری'' میں مزید فرماتے ہیں:

ادبی تاریخ تین چار شاعر اور ادیب کے وجود سے مل کر نہیں بنتی۔ اس کی ترتیب اور ارتقا میں چھوٹے بڑے تمام شعرا اور ادبا کی کوششیں شامل رہتی ہیں۔ داغ کو سمجھنے اور پسند کرنے کے لیے صرف اس کے دواوین کو پڑھنا کافی نہیں ہے۔ ہمیں استاد ذوق کو بھی پڑھنا ہوگا۔ داغ کے عہد کو بھی سمجھنا ہوگا اور ان کے مشہور شاگردوں کے کلام کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔

''پیمانۂ غزل'' میں سودا، میر، اور درد کے کلام کے علاوہ اس دَور کے دیگر شعرا کے اشعار بھی شامل ہیں۔

مصحفی اوران کے مشہور تلامذہ کے اچھے اشعار بھی درج ہیں۔ ناسخ، آتش، ذوق، غالب، مومن، امیر مینائی، داغ اور ان کے شاگردوں کا کلام بھی مجموعے کی زینت ہے۔ شاد عظیم آبادی، ریاض خیر آبادی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، یگانہ چنگیزی اور اس عہد کے اوسط درجے کے شاعروں کا کلام بھی اس انتخاب میں شامل ہے۔ فراق گورکھ پوری، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیار پوری، ناصر کاظمی، احمد فراز اور ان کے ہم عصر شعرا کا کلام بھی قاری کے پڑھنے کو ملے گا۔ نئی نسل کے ہندوستان اور پاکستان کے شعرا بھی کافی تعداد میں شامل ہیں۔ اس انتخاب میں خاصی تعداد میں اشعار ایسے شعرا کے بھی ملیں گے جن کے متعلق موجودہ دَور میں لوگوں کو بالکل علم نہیں یا بہت کم علم ہے مگر وہ اشعار اپنی جگہ خوب ہیں۔

۱۰) اس زمانے میں دولت کی بے پناہ طلب نے انسان کی تخلیقی صلاحیت اور ادبی مذاق کو مضمحل کر دیا ہے۔ کسی جانب سے کسی ایسی کتاب کی تصنیف وتالیف جس میں انسان کی تہذیب، دل ودماغ کی آبیاری کی گئی ہو، قابلِ ستائش ہے۔ یہ سچ ہے کہ شعر سے کوئی مالی منفعت حاصل نہیں ہوتی ہے لیکن اگر دل کی شگفتگی، ذہن کی جودت اور اخلاق کی درستی بھی فائدے میں شمار ہے تو اشعار کے مفید ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔

۱۱) اگر دنیا کے مختلف ممالک کے ادب کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ زمانے اور ماحول کے مطابق ادیب اور شاعر اپنے جذبات اور خیالات ظاہر کرتے رہے ہیں۔ کسی ملک کے باشندوں کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی جیسی ہوگی، ویسا ہی وہاں کے شاعروں اور دانشوروں کے جذبات ہوں گے۔ ہر زمانے کا ادب اپنے وقت کے اعتبار سے ترقی پسند رہا ہے۔ آج جو شعر وادب جدید ہے، آئندہ وہ قدیم ہو جائے گا۔ فیض احمد فیض، ناصر کاظمی، احمد فراز، شکیب جلالی یا دوسرے اس عہد کے شعرا اگر سودا اور میر تقی میرؔ کے زمانے میں پیدا ہوتے تو ویسا ہی شعر کہتے جیسا کہ اس زمانے کے دوسرے شعرا نے اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ سودا، میرؔ اور درد اپنے زمانے کے ترقی پسند شعرا تھے۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر انھی شعرا سے فیض حاصل کیا ہے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ ماضی سے حال کا اور حال کا مستقبل سے گہرا تعلّق ہے۔ ماضی سے بے تعلّق رہ کر ہم حال اور مستقبل کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں نئی نسل کے شعرا کے کلام کے ساتھ اساتذہ اور بزرگ شعرا کے کلام کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔ جبھی ہم جان سکتے ہیں کہ ایک شاعر نے دوسرے شاعر سے کس حد تک استفادہ کیا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ زبان اور خیالات میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اور خیال کا ارتقا کس نہج پر ہوا ہے۔

۱۲) قلی قطب شاہ، غواصی، بحری اور دوسرے قدیم شعرا کے صرف چند عام فہم اشعار انتخاب میں شامل کیے گئے

ہیں کیوں کہ قدیم زبان اور متروک الفاظ کی بنا پر ان کا کلام ایک عام قاری بغیر فرہنگ کے نہیں سمجھ سکتا۔

۱۳) کتاب کی ضخامت کو پیش نظر رکھتے ہوئے شعرا کے حالات زیادہ تفصیل سے نہیں لکھے گئے ہیں۔ کچھ شعرا کے حالات بہت مختصر درج ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے حالات تفصیل سے نہ مل سکے۔

۱۴) شعرا کی تاریخ ہائے ولادت و وفات مستند مآخذ سے اخذ کی گئی ہیں۔ بعض اوقات خودنوشت حالات میں بھی تاریخ ولادت صحیح نہیں ہوتی کیوں کہ سرٹیفکیٹ میں کچھ اندراج ہوتا ہے اور اصل تاریخ پیدائش کچھ اَور ہوتی ہے۔

۱۵) یہ تذکرہ غزل کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے مگر نظم اور دوسرے اصنافِ سخن کے ایسے چیدہ چیدہ اشعار انتخاب میں شامل کر لیے گئے ہیں جو غزل کے اشعار کی طرح آزاد اکائی کی حیثیت رکھتے ہوں، جن میں شعریت اور کیف و اثر ہو اور جن میں خیال اور احساس بھرپور طریقے سے تکمیل پا گئے ہوں۔ ایسے اشعار بھی اس تذکرے کی زینت ہیں، جن کا کوئی ایک مصرع زباں زدِ خاص و عام ہو گیا ہو۔

۱۶) میرے ایک فاضل دوست نے تذکرے کی شکل میں قدیم اور جدید شعرا کے حالات اور ان کے منتخب اشعار پر مشتمل ایک مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے بڑے سے بڑے شاعر کے زیادہ سے زیادہ نو اشعار درج کیے ہیں۔ میر، مصحفی، آتش، غالب، مومن، داغ، حالی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، یگانہ چنگیزی، فراق گورکھ پوری، فیض احمد فیض اور دوسرے درجۂ اوّل اور درجۂ دوم شعرا کے نو اشعار سے ایک طالبِ علم اُن کے مرتبے کا کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔ میں نے اشعار کے انتخاب کے سلسلے میں کسی تعداد کی کوئی قید نہیں رکھی۔ ''پیمانۂ غزل'' (جلد اوّل) میں ایسے بھی شاعر ہیں جن کے سو اور دو سو سے زیادہ اشعار شامل ہیں اور بعض شعرا کا ایک ہی شعر انتخاب میں آ سکا ہے۔

۱۷) ادب میں کوئی کام حرفِ آخر کا درجہ نہیں رکھتا۔ اس میں اختلاف مذاق کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ ممکن ہے ایک شعر مجھے پسند ہو اور آپ کو ناپسند ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شعر آپ کو کسی وقت پسند نہ آیا ہو اور اسی شعر کو دوسرے وقت سن کر آپ تڑپ گئے ہوں۔ لوگوں کو عموماً وہ شعر زیادہ سکون بخشتا ہے جس میں ان کے مزاج کی ترجمانی کی گئی ہو اور وہ شعر ان کے حسب حال ہو۔ شعر کے انتخاب کا معاملہ ہر شخص کے ذوق اور وجدان سے اتنا وابستہ ہے کہ مشکل ہی سے دو اشخاص ایک جیسا انتخاب کر سکتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی اچھے ذوق سلیم کے مالک ہوں۔ میں نے روایتی اشعار کو انتخاب میں جگہ نہیں دی ہے۔ ''پیمانۂ غزل'' (جلد دوم) میں جدید غزل گو شعرا کے ان اشعار کو خصوصیت سے شامل کیا گیا ہے، جنھوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے احسن طریقے سے

اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور جن کی شاعری عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

۱۸) اس زمانے میں فرصت کی عدم دستیابی نے زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے۔ معاشی، معاشرتی اور دیگر مسائل کے سبب ایک عام قاری اساتذہ کے ضخیم کلیات و دواوین اور دَورِ حاضر کے شعرا کے سیکڑوں شعری مجموعے پڑھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مزید برآں ان کتابوں تک رسائی بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اربابِ علم و اہلِ ذوق اس انتخاب کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔

یکم مارچ ۲۰۰۸ء

محمد شمس الحق

مکان نمبر اے-۱۳۶

بلاک ۱۴، گلستان جوہر

کراچی

رابطہ: ۴۶۱۸۵۲۱ (۰۲۱)





بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ٥

قطب/ معانی، قلی قطب شاہ

نام محمد قلی قطب شاہ۔ ولادت ۱۵۶۵ء، والیِ گولکنڈہ، ہم عصر شہنشاہ اکبر۔ کُلّیات میں قلی قطب شاہ نے مختلف تخلّص استعمال کیے ہیں، مگر زیادہ تر قطب، قطب شہ اور معانی استعمال کیے ہیں۔ ایک ضخیم دیوان اُن کی یادگار ہے۔ قلی قطب شاہ اردو زبان کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ پہلے یہ سہرا عدمِ تحقیق کی وجہ سے ولی دکنی کے سر تھا۔ قدیم زبان اور متروک الفاظ کی بنا پر اُن کا کلام ایک عام قاری نہیں سمجھ سکتا۔ قلی قطب شاہ نے محبوب کے لیے تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ انھیں عمارتوں کی تعمیر کا بہت شوق تھا۔ مشہور ہے کہ قطب شاہ نے اپنی ایک محبوبہ بھاگ متی سے شادی کرلی اور اسے حیدر محل کا خطاب دیا۔ بھاگ متی نگر نامی شہر کا نام بدل کے اپنی محبوبہ کے خطاب کی مناسبت سے حیدر آباد رکھ دیا۔ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے صرف چھیالیس برس کی عمر میں ۱۶۱۱ء میں قلی قطب کا انتقال ہوگیا۔

منتخب اشعار

پیا باج پیالہ پیا جائے نا — پیا باج یک پل جیا جائے نا

کہے تھے، پیا بن صبوری کروں — کہیا جائے امّا، کیا جائے نا

قطب شہ نہ دے منج دِوانے کو پند — دِوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ وَمے خانے کوں — دیکھتا ہوں، ہر کہاں دِستا ہے تج مُکھ کا صفا

تج بن پیارے نیند ٹک نیناں میں منج آتی نہیں — رینی اندھاری ہے کٹھن، تج بن کٹی جاتی نہیں

غوّاصی/غوّاص

غواصی سلطان قطب شاہ کے والد ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے غوّاصی اور غوّاص، دو تخلّص استعمال کیے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں ان کی شاعری نے شہرت حاصل کی۔ بادشاہ کی عنایت وجہی پر تھی جس کی وجہ سے وہ قلی قطب کی نوازشوں سے محروم رہے۔ قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد محمد قطب شاہ تخت پر بیٹھے،

لیکن یہ جلد ہی وفات پا گئے۔ ان کی جگہ سلطان عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوئے۔ غواصی کی ابتدائی زندگی تنگ دستی میں گزری۔ سلطان عبداللہ کے عہد میں ان کو شاہی تقرب حاصل ہوا اور وہ عزت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ غواصی نے غزل، قصیدہ اور مثنوی میں طبع آزمائی کی ہے۔ غواصی اپنے زمانے کے صفِ اوّل کے غزل گو شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ غواصی کے قصائد بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غواصی کی تاریخ وفات کا علم نہیں۔ تاہم قرائن سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۶۵۶ء سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔

منتخب اشعار

اے پری پیکر! ترا مکھ آفتاب — دیکھتا ہوں تو رہے مجھ میں نہ تاب

آج منج دل کو کچ قرار نئیں — کیا کروں میں، نزِک وو یار نئیں

آرام نئیں ہے منج کوں، بغیر یار کیا کروں — دل ٹھار تا نئیں ہے کسی ٹھار، کیا کروں

پیو باج آنکھیاں کوں آئے نہ خواب ہرگز — بے تاب ہوں، نہیں کچ منج تن میں تاب ہرگز

بحری، قاضی محمود

نام قاضی محمود، بحری تخلّص۔ عہد اورنگ زیب کے شاعر ہیں اور ولی دکنی سے کسی قدر قدیم ہیں۔ بحری دکن کے صوفی منش بزرگ تھے۔ موضع گوگی ان کا وطن تھا جہاں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے۔ ہر سال دسویں شوّال کو عرس ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ بیجاپور میں ان کا قیام رہا۔ سکندر عادل شاہ، بیجاپور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ بیجاپور کی سلطنت کے زوال کے بعد وہ حیدرآباد، دکن چلے گئے۔ حیدرآباد کے سفر میں ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا اور دوسرے سامان کے ساتھ ان کا کلام بھی اسی حادثے کی نذر ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بحری حیدرآباد سے اپنے وطن گوگی واپس آ گئے اور وہیں تقریباً نوے سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

بحری فن شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ صوفی بزرگ ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری میں صوفیانہ اصلاحات ملتی ہیں۔ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خدا رسیدہ بزرگ کی حیثیت سے زیادہ مشہور تھے۔ عقیدت مند عرس کے موقع پر اب بھی ان کے مقبرے پر حاضر ہوتے ہیں۔

منتخب اشعار

دلبراں کی تو دوستی معلوم — عاشقاں کے قرار پر قرباں

میں جو رویا تو تُو سمجھ کہ دھواں — بے سبب آنکھ کوں رلاتا ہے

آگ کا ڈر اُسے ہے اوّل تے　　گھر جکوئی گھاس کا بندا تا ہے
دیکھنا عاشقاں کی خواری پر　　اے سجن نئیں تجھے سہاتا ہے

شاہی، شاہ قلی خاں

نام شاہ قلی خاں، شاہی تخلّص۔ شاہ قلی خاں ابوالحسن قطب شاہ مشہور بہ تانا شاہ کے مصاحب تھے۔ تانا شاہ عبداللہ قطب شاہ کے داماد اور اس کے جانشیں تھے۔ یہ گولکنڈہ کے آخری تاجدار تھے۔ ان کا دَورِ حکومت ۱۶۷۲ء سے ۱۶۸۲ء تک تھا۔ گولکنڈہ فتح ہونے کے بعد سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ قرار پایا۔ تذکروں میں شاہ قلی خاں شاہی کے نام سے حسبِ ذیل شعر درج ہے:

ملنا تمھن کا غیر سے، کوئی جھوٹ، کوئی سچ مچ کہے
کس کس کا مُنہ موندوں سجن، کوئی کچھ کہے، کوئی کچھ کہے

سعدی کاکوروی

نام مخدوم شیخ سعدی۔ ولادت ۱۵۴۲ء۔ وطن کاکوری ضلع لکھنؤ۔ تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی۔ اپنے زمانے کے ممتاز دانشور عالم و فاضل اور صوفی تھے۔ فن قرأت میں ملکہ رکھتے تھے۔ ریختہ گو کی حیثیت سے اردو کے قدیم شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کا زمانہ پایا تھا۔ وفات: ۱۰ر اگست ۱۵۹۴ء۔

منتخب اشعار

ہمنا تمھن کو دل دیا، تم مولیا اور دکھ دیا　　ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی بگفتہ ریختہ دَر ریختہ دُر ریختہ　　شیر و شکر آمیختہ، ہم شعر ہے، ہم گیت ہے

فطرت، مرزا معز الدّین

مرزا معز الدّین محمد موسوی، ولادت ۱۶۴۰ء۔ ایران کے سادات میں تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ ۱۶۷۱ء میں ہندوستان آئے اور عالمگیر کی ملازمت اختیار کی۔ پہلے فطرت اور بعد میں اپنا نسب ظاہر کرنے کے لیے موسوی تخلّص اختیار کیا۔ فارسی کے شاعر تھے۔ تذکروں میں ایک شعر اردو کا ان کی طرف منسوب

ہے۔ ۹۰-۱۶۸۹ء میں سکتے کی بیماری سے انتقال ہوا۔

از زلفِ سیاہِ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

ولی دکنی

ولی محمد نام، ولی تخلص۔ مختلف تذکرہ نویسوں نے ولی کے مختلف نام لکھے ہیں۔ مثلاً ولی اللہ، شاہ ولی اللہ، محمد ولی، ولی محمد۔ ان کا صحیح نام ولی محمد تھا۔ ان کے اجداد گجرات سے دکن ہجرت کر گئے تھے۔ ولی گجرات سے تعلق رکھنے کے باوجود دکنی ہو گئے تھے۔ ولی ۲۰ سال تک تحصیل علوم کرتے رہے، بعد ازاں احمد آباد گئے، جو اس زمانے میں علوم وفنون کا مرکز تھا، اور شاہ وجیہ الدّین کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ کچھ دنوں بعد اپنے وطن آ کر شعر و شاعری شروع کی۔ ولی دو دفعہ دلّی گئے۔ وہاں شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی۔ ان کی ایما سے دکنی کے بجائے ریختہ میں شعر کہنے لگے۔ ان کا دوسرا سفر محمد شاہ کے عہد میں ہوا۔ اس سفر میں ولی اپنے ساتھ دیوان ریختہ لائے جو بہت مقبول ہوا۔ ولی کو اردو شاعری کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔ وفات ۱۷۲۰ء اور ۱۷۲۵ء کے درمیان۔ انجمن ترقّیِ اردو پاکستان، کراچی کے زیرِ اہتمام ''کلّیاتِ ولی'' شائع ہو گئی ہے۔

منتخب اشعار

یاد کرنا ہر گھڑی اُس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

چاہتا ہے اس جہاں میں گر بہشت
جا تماشا دیکھ اُس رخسار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

پھر میری خبر لینے وو صیّاد نہ آیا
شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا

ایسا بسا ہے آ کر تیرا خیال جیو میں
مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین، غزلاں سوں کہوں گا

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے، جیوں سینے میں راز آوے

جس وقت اے سریجن تُو بے حجاب ہوگا
ہر ذرّہ تجھ جھلک سوں جیوں آفتاب ہوگا

مت آئینے کوں دکھلا اپنا جمالِ روشن
تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا

مجکوں ہوا ہے معلوم اے مستِ جامِ خوبی — تیری انکھاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا

تری یہ زلف ہے شامِ غریباں — جبیں تیری مجھے صبحِ وطن ہے

اب جدائی نہ کر، خدا سوں ڈر — بے وفائی نہ کر، خدا سوں ڈر

ہے جدائی میں زندگی مشکل — آ جدائی نہ کر، خدا سوں ڈر

ہے حُسن ترا ہمیشہ یک ساں — جنت سوں بہار کیونکے جاوے

صنم کے لعل پر وقتِ تکلّم — رگِ یاقوت ہے موجِ تبسّم

یک بار ہنس کے بول صنم، نئیں تو حشر تک — جوں برق بے قرار رہیں گے کفن میں ہم

خوب رُو خوب کام کرتے ہیں — یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

زندگی جامِ عیش ہے، لیکن — فائدہ کیا، اگر مدام نہیں

شیخ مت گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور — گول دستار تری باعثِ رسوائی ہے

اے ولی! رہنے کوں دنیا میں مقامِ عاشق — کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

اے نورِ جان و دیدہ، ترے انتظار میں — مدّت ہوئی پلک سوں پلک آشنا نہیں

آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کے ولی — سرو قد کو دیکھ سیرِ عالمِ بالا کروں

مکھ ترا بحرِ حُسن ہے جاناں — زلف پُر پیچ موجِ عنبر ہے

عجب کچھ لطف رکھتا ہے، شبِ خلوت میں گلروں سوں — خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی — کہ دل سوں تاب، جی سوں صبر، سر سوں ہوش لے جاوے

جسے عشق کا تیر کاری لگے — اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

ولی کوں کہے تُو اگر یک بچن — رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

بات رہ جائے گی قاصد، وقت رہنے کا نہیں — دل تڑپتا ہے شتابی لا خبر دلدار کی

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کوں — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

باعثِ رسوائی عالم ولی — مفلسی ہے، مفلسی ہے، مفلسی

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی و کیا مجازی کا

آزاد، فقیر اللہ

فقیر اللہ نام، آزاد تخلص۔ کئی تذکرہ نگاروں نے انھیں فاضل آزاد بھی لکھا ہے۔ یہ حیدرآباد، دکن کے رہنے والے تھے۔ میر تقی میرؔ نے ''نکات الشعرا'' میں لکھا ہے کہ یہ ولی کے ہم عصر تھے۔ میر حسن نے بھی ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں اس کی تصدیق کی ہے۔ ولی دکنی نے آزاد کے ایک شعر کے مصرع ثانی پر گرہ لگائی ہے۔ آزاد کا شعر یہ ہے:

آئیں جہاں کی ساری آزادؔ صنعتیں، پر
جس سے کہ یار ملتا، ایسا ہنر نہ آیا

ولی کا شعر یہ ہے:

آزاد سوں سنیا ہوں یہ مصرعِ مناسب
''جس سے کہ یار ملتا، ایسا ہنر نہ آیا''

بیدل، میرزا عبد القادر

نام میرزا عبد القادر، بیدل تخلص تھا۔ ۱۶۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۱ر سال کی عمر میں بہار کو خیر باد کہہ کر ہمیشہ کے لیے دلّی آگئے۔ وہ فارسی کے شاعر تھے۔ غالب اور علّامہ اقبال نے بیدل کی شاعرانہ عظمت کا ذکر کیا ہے۔ ۲۴ر نومبر ۱۷۲۰ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ ''نکات الشعرا'' میں ان کے اردو کے دو اشعار درج ہیں۔ بیدل کی ۵ر اشعار کی غزل مولانا کبریا خاں افغانی کی بیاض سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' (جلد دوم) صفحہ ۱۲۶ر پر نقل کی ہے۔

منتخب اشعار

مت پوچھ دل کی باتیں، وو دل کہاں ہے ہم میں
اس تخمِ بے نشاں کا، حاصل کہاں ہے ہم میں

سوزِ نہاں میں کب کا وو خاک ہو چکا ہے
اب دل کو ڈھونڈتے ہو، اب دل کہاں ہے، ہم میں

جب دل کے آستاں پے عشق آن کر پوکارا
پردے سے یار بولا، بیدلؔ کہاں ہے ہم میں

اُمید، مرزا محمد رضا قزلباش خاں

نام مرزا محمد رضا معروف بہ قزلباش خاں، امید تخلّص۔ ولادت ۹-۷-۱۶۷۸ء اصفہان۔ تلمیذ مرزا طاہر وحید۔ عالمگیر بادشاہ کے زمانے میں ہمدان سے ہندوستان آئے۔ حیدر آباد (دکن) میں قیام کے بعد ۱۷۳۷ء میں دہلی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ جس زمانے میں نادر شاہ نے دہلی کو لُوٹا، آپ یہیں پر تھے۔ ۳۰ رمئی ۱۷۴۶ء کو انتقال ہوا۔

منتخب اشعار

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے — در و دیوار سے اب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ، ڈرتا ہوں — الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

آبرو، شاہ مبارک

نام شیخ نجم الدّین عرف شاہ مبارک، آبرو تخلّص۔ ۱۶۸۳ء میں گوالیار میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے۔ عنفوانِ شباب میں دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آبرو سراج الدّین علی خاں آرزو کے رشتے دار تھے، شعر و سخن میں آرزو سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کا دیوان تلف ہو گیا۔ البتہ ایک مختصر دیوان ان کی یادگار ہے۔ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی جس کی وجہ سے مرزا مظہر سے اکثر چشمک رہتی تھی۔ گھوڑے کی دولتّی سے ۲۱ر دسمبر ۱۷۳۳ء کو انتقال ہوا۔

> آبرو ایک قادر الکلام شاعر ہے۔ وہ مشکل سے مشکل زمینوں میں بھی، اُس دَور میں جب کہ روایت اپنی ابتدائی منزل میں ہے، مربوط اور رواں شعر نکالتا اور مشکل قافیوں کو با معنی انداز میں اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی)

منتخب اشعار

نین سیں نین جب ملائے گیا — دل کے اندر مرے سمائے گیا
تیرے چلنے کی سن خبر عاشق — یہی کہتا موا کہ ہائے گیا
آیا ہے صبح نیند سے اُٹھ رسمسا ہوا — جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا
ٹیسو کے پھول نہیں ہے دہکتے ہیں کوئلے — آئی جنوں میں ہے آگ برہ کی لگا بسنت

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاوٗں گا اُس گلی — ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے — کہ اُس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری، سو جگ بیتا

یہ سبزہ اور یہ آبِ رواں اور ابر یہ گہرا — دِوانا نئیں کہ اب گھر میں رہوں، چھوڑ کر صحرا

جب چمن میں جا کے پیارے تم نے زلفیں کھولیاں — لے گئی بادِ صبا خوشبو کی بھر بھر جھولیاں

دُور خاموش بیٹھ رہتا ہوں — اس طرح حال دل کا کہتا ہوں

کرتے تو ہو تغافل پر حال آبرو کا — دیکھو جو تم پیارے، بے اختیار رو دو

کیوں ملامت اس قدر کرتے ہو، بے حاصل ہے یہ — لگ چکا، اب چھوٹنا مشکل ہے اس کا، دل ہے یہ

لٹک چلنا سجن کا بھولتا اب تک نہیں مجکوں — طرح وہ پاؤں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے

تمھارے، لوگ کہتے ہیں، کمر ہے — کہاں ہے، کس طرح کی ہے، کدھر ہے

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتیں — جب روبرو ہو تیرے گفتار بھول جاوے

تمھارا دل اگر ہم سے پھرا ہے — تو بہتر ہے، ہمارا بھی خدا ہے

زندگانی تو ہر طرح کاٹی — مر کے پھر جیونا قیامت ہے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے — وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

کیا ہوا، مر گیا اگر فرہاد — روح پتھر سے سر پٹکتی ہے

آرزو، سراج الدّین علی خاں

نام سراج الدّین علی خاں، معروف بہ خان آرزو، آرزو تخلّص۔ ولادت ۸۸-۱۶۸۷ء، آگرہ۔ شیخ نصیر الدّین چراغ، دہلی، شیخ محمد غوث گوالیاری اور شیخ فرید الدّین نیشاپوری ان کے اجداد میں سے تھے۔ دراصل آرزو فارسی زبان کے شاعر تھے اور اردو میں محض تفنن کے طور پر کچھ کہہ لیتے تھے۔ شاہ مبارک آبرو، خواجہ میر درد اور میر تقی میر ان کے مشہور شاگرد تھے۔ میر سے ان کا قریبی رشتہ بھی تھا (آرزو میر کے سوتیلے ماموں تھے)۔ جوانی میں بمقام گوالیار منصب دار مقرر ہوئے۔ فرخ سیر کے عہد میں دہلی آ گئے۔ دہلی پر حملہ اور اس کی تباہی پر لکھنؤ چلے گئے۔ وفات ۲۷ رجنوری ۱۷۵۶ء، فیض آباد۔ لاش لکھنؤ میں بطور امانت دفن کی گئی، بعد میں ان کی وصیت کے مطابق دہلی لا کر سپرد خاک کیا گیا۔ ایک فارسی کا ضخیم دیوان اور کتب تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

منتخب اشعار

ہر صبح آ و تا ہے تیری برابری کو — کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو[1]

جان! کچھ تجھ پر اعتماد نہیں — زندگانی کا کیا بھروسا ہے

عبث دل بے کسی پہ اپنی توں ہر وقت روتا ہے — نہ کر غم اے دِوانے! عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے[2]

داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل — ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے

کس پری رُو سے ہوئی شب کو مری چشم دوچار — کہ میں دیوانہ اُٹھا خواب سے روتے روتے

بہار، ٹیک چند

نام ٹیک چند، تخلص بہار۔ ولادت تقریباً ۸۸-۱۶۸۷ء دہلی۔ قوم کے سنار تھے۔ تلمیذ سراج الدین علی خاں آرزو۔ علم معانی، منطق اور دیگر علوم میں مہارت رکھتے تھے، خصوصاً تحقیق لغت میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ چناں چہ اس فن میں ایک مستند کتاب ''بہارِ عجم'' تصنیف کی تھی۔ یہ فارسی زبان کی اہم اور مستند لغت سمجھی جاتی ہے۔ بہار فارسی زبان کے شاعر تھے، لیکن کبھی کبھی اردو میں دو چار شعر کہہ لیتے تھے۔ وفات ۶۷-۱۷۶۶ء، دہلی۔

منتخب اشعار

کہتے ہیں عندلیب گرفتار مجھ کو دیکھ — امید چھوٹنے کی نہیں اس بہار بیچ

دل ہمارا لے کے کیوں انکار کرتے ہو بجن — کس سے یہ سیکھے ہو تم لے کر مکر جانے کی طرح

وہی ایک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں — کہیں تسبیح کا رشتہ، کہیں زنار کہتے ہیں

اگر جلوہ نہیں ہے کفر کا اسلام میں ظاہر — سلیمانی کے خط کو دیکھ کیوں زنار کہتے ہیں

ہمیں واعظ ڈراتا کیوں ہے دوزخ کے عذابوں سے — معاصی گو ہمارے بیش ہوں، کچھ مغفرت کم ہے

---

(۱) ''آ تا ہے صبح اُٹھ کر...'' (تذکرۂ حسن)، ''آ تا ہے ہر سحر اُٹھ...'' (خم خانۂ جاوید)

(۲) یہ شعر دیوانِ درد میں بھی بہ ادنا فرق، یعنی بجائے ''توں'' کے ''تو'' سے ملتا ہے، نیز حسبِ ذیل شکل میں مصطفٰے خاں یکرنگ سے بھی منسوب ہے:

عبث تو بے کسی پر اپنی کیوں ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دِوانے! عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے

بحوالہ: ''تاریخ ادبِ اردو'' جلدِ دوم (حصۂ اوّل)، ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۶۳

عزلت، میر عبدالولی

میر عبدالولی نام، عزلت تخلّص ۔ ولادت ۹۳-۱۶۹۲ء، سورت ۔ اپنے والد سے علوم وفنون کی تعلیم پائی ۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ موسیقی اور مصوری میں بہت درک رکھتے تھے ۔ سیر وسیاحت کے بہت شوقین تھے ۔ ۵۱-۱۷۵۰ء میں دلّی آئے اور سراج الدّین علی خاں آرزو اور میر تقی میرؔ سے ملاقات کی ۔ کافی عرصہ وہاں رہے ۔ دلّی سے مرشد آباد اور پھر اورنگ آباد گئے ۔ نواب ناصر جنگ نظام الدّولہ بہادر کا زمانہ تھا ۔ انھوں نے تنخواہ مقرر کر دی تھی ۔ ان کے انتقال کے بعد حیدر آباد گئے ۔ نواب صلابت جنگ آصف الدّولہ نے دو گاؤں جا گیر میں عنایت فرمائے ۔ جب تک زندہ رہے فارغ البالی اور اطمینان سے زندگی بسر کرتے رہے ۔ وفات ۱۳ رستمبر ۱۷۷۵ء، حیدر آباد (دکن) ۔

منتخب اشعار

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا
سوائے بے کسی اب اور آشنا نہ رہا

سیہ روزی میں مری قدر کو احباب کیا جانیں
اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہے گا

سدھارے گل کہاں، سونے پڑے ہیں گلستان اپنے
گئی ہیں بلبلیں کیدھر جلا کر آشیاں اپنے

سرو زار آباد ہے، لیکن کہو اے قمریو!
کچھ تمھیں ہے میرے اُجڑے آشیانے کی خبر؟

عاجز، عارف الدّین

عارف الدّین نام، عاجز تخلّص ۔ ان کے اجداد کا تعلق بلخ سے تھا ۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ان کے والد ہندوستان آئے ۔ عاجز ہندوستان میں پیدا ہوئے ۔ چھوٹی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ۔ نواب لشکر خاں (رکن الدّولہ نصیر جنگ) نے ان کو اپنی سر پرستی میں لے لیا ۔ ان کے سایۂ عاطفت میں تعلیم وتر تیب پائی اور انھی کے ساتھ اورنگ آباد آ کر نواب آصف جاہ اوّل کی سرکار میں منصب وخطاب سے سرفراز ہوئے ۔ فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے ۔ ایک دیوان فارسی اور ایک اردو میں یادگار چھوڑا ۔ ایک مثنوی بھی لکھی ۔ وفات ۱۷۶۳ء ۔

منتخب اشعار

الٰہی کب دلِ غمگیں ہمارا شاد ہووے گا
یہ اُجڑا شہر یارب کس گھڑی آباد ہووے گا

لالے کی فصل شاید آئی ہے گلشنوں میں
سب گلرخوں نے لب پر مسّی جمائیاں ہیں

دیکھ دامن گیر محشر میں ترے ہوویں گے ہم
خوں ہمارا اپنے دامن سے نہ اے قاتل چھڑا

داؤد، مرزا داؤد بیگ

نام مرزا داؤد بیگ، داؤد تخلّص۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ تلمیذ عبدالولی عزلت۔ ہم عصر ولی دکنی۔ وفات ۱۷۴۴ء۔ وہ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔

منتخب اشعار

کہتے ہیں عاشقاں مرا حال دیکھ کر ۔۔۔ شاید تو دل دیا ہے کسی بے وفا کے ہات

رات دن ہے پکار میں داؤد ۔۔۔ جیوں پپیہا پیا پیا تجھ بن

مرا احوال چشمِ یار سے پوچھ ۔۔۔ حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

مرے حالِ پریشاں کی حقیقت ۔۔۔ صنم کی زلف کے ہر تار سے پوچھ

گل بدن کے خیال میں داؤد ۔۔۔ مثلِ گلزار خوش بہار ہیں ہم

حشمت، محتشم علی

نام محتشم علی، حشمت تخلّص۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن بدخشاں تھا۔ فارسی شعر خوب کہتے تھے۔ ۴۷-۱۷۴۶ء میں انتقال ہوا۔ تذکروں میں ان کا مندرجۂ ذیل شعر درج ہے:

بہار آئی، دِوانے کی خبر لو
اگر زنجیر کرنا ہے تو کر لو

حاتم، شیخ ظہورالدّین

ظہورالدّین نام، حاتم تخلّص۔ عرفیت شاہ حاتم۔ ولادت ۱۷۰۰-۱۶۹۹ء دہلی۔ پہلے رمزی تخلّص کرتے تھے۔ فنِ سپہ گری میں مہارت حاصل تھی۔ ابتدائی زمانہ تنگ دستی میں گزرا، لیکن دیوان مرتب ہونے کے بعد ان کی زندگی میں تبدیلی آ گئی۔ اُن کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور ان کی رسائی شاہی دربار تک ہوگئی۔ سلطنت کے زوال کے بعد حاتم پھر پچھلے دَور سے گزرنے لگے۔ انھوں نے فسق وفجور سے توبہ کرلی اور باقی زندگی درویشانہ وضع میں بسر کی۔ اپنے ضخیم دیوان سے غزلیات کا انتخاب کیا اور اس کا نام ''دیوان زادہ'' رکھا۔ سودا ان کے شاگرد تھے۔ شاہ حاتم نے تمام عمر شادی نہیں کی اور آزادانہ زندگی گزاری۔ وفات جولائی ۱۷۸۳ء دہلی۔

انھوں نے نئے رجحانات کو لبیک کہا۔ زبان و بیان میں بہت تبدیلیاں کیں۔ استادالشعرا کی حیثیت سے شاہ حاتم کا شعری مرتبہ مسلّم ہے۔ (ادا جعفری)

منتخب اشعار

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم — کب ملے گا مجھے پیا میرا

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا — مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

قفس میں پھینک ہم کو پھر وہیں صیّاد جاتا ہے — خدا حافظ ہے گلشن میں ہمارے ہم صفیروں کا

مسافر اُٹھ، تجھے چلنا ہے منزل — بجے ہے کوچ کا ہر دم نقارا

خبر آنے کی قاصد کے سنے سے جی دھڑکتا ہے — خدا جانے کہ اس ظالم کا اب پیغام کیا ہوگا

حاتم تعینات کا گر وہم دُور ہو — اُٹھ جائے درمیان سے پردہ حجاب کا

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک — تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

حیرت ہے مجھے یہی کہ اُس بن — کس طرح سے اب تلک جیا ہوں

جب سے تمھاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں — تب سے جہاں میں تم نے دھومیں مچائیاں ہیں

زلفوں کا بل بنانا، آنکھیں چُرا کے چلنا — کیا کج ادائیاں ہیں، کیا کم نگاہیاں ہیں

عاشق اُپر نہ جَور و ستم اِس قدر کرو — عالم کا ڈر نہیں تو خدا کا تو ڈر کرو

تم تو بیٹھے ہوئے پر آفت ہو — اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

مدّت سے خواب میں بھی نہیں نیند کا خیال — حیرت میں ہوں کہ کس کا مجھے انتظار ہے

اِس دکھ میں ہائے یار یگانے کدھر گئے — سب چھوڑ ہم کو غم میں نہ جانے کدھر گئے

کچھ دُور نہیں منزل، اُٹھ باندھ کمر حاتم — تجھ کو بھی تو چلنا ہے، کیا پوچھے ہے راہی سے

بدن پر کچھ مرے ظاہر نہیں اور دل میں سوزش ہے — خدا جانے یہ کس نے راکھ اندر آگ دابی ہے

نہ شب کو خواب، نہ آرام دن کو یا قسمت! — عجب طرح سے یہ لیل و نہار گزرے ہے

بڑا غضب ہے کہ حاتم کو تم نہ پہچانا — وہی قدیم تمھارا غلام، بھول گئے

اے صبا! کس طرف کو گزری تھی — تجھ سے بُوئے نگار آوے ہے

ٹک اِدھر بھی گزر کہ اس بُو سے — میرے دل کو قرار آوے ہے

جب ہوئے حاتم ہم اُس سے آشنا ۔۔۔ دوست بھی دشمن ہمارے ہو گئے

حاتم کسی سے اپنی مصیبت کو تُو نہ کہہ ۔۔۔ کیا فائدہ جو اپنا بھرم مفت کھوئیے

سر کو پٹکا ہے کبھو، سینہ کبھو کُوٹا ہے ۔۔۔ رات ہم ہجر کی دولت کا مزا لُوٹا ہے

جب تلک ہے جدا تو قطرہ ہے ۔۔۔ بحر میں مل گیا تو دریا ہے

ہمیں پوچھو تو ہستی اور عدم میں کیا تفاوت ہے ۔۔۔ جو آیا اُور کوئی بزم میں، ہم ٹک سرک بیٹھے

پگڑی اپنی یہاں سنبھال چلو ۔۔۔ اَور بستی نہیں، یہ دلّی ہے (۱)

درپَے ہے عیب جُو ترے حاتم تو غم نہ کھا ۔۔۔ دشمن ہے عیب جُو تو خدا عیب پوش ہے

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر ۔۔۔ سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

خدا کے واسطے اِس سے نہ بولو ۔۔۔ نشے کی لہر میں کچھ بک رہا ہے

انجام، نواب امیر خاں

نام محمد اسحٰق، عمدۃ الملک خطاب، انجام تخلص۔ محمد شاہ کے مقتدر درباری تھے۔ اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے محمد شاہ کے اتنے قریب ہو گئے تھے کہ بادشاہ کو ان کے سوا کسی بات میں مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ شاہی عنایات کے بھروسے پر نہایت گستاخ ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر ۲۶ / دسمبر ۱۷۴۶ء کو قتل کرا دیا۔ تدفین دہلی میں ہوئی۔ انجام بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔ فارسی شاعری میں وہ بیدلؔ کے شاگرد تھے اور ریختہ میں آرزو سے مشورہ کرتے تھے۔ وہ اردو، عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، پشتو اور کشمیری زبان کے فاضل تھے۔

منتخب اشعار

دُور سے آئے تھے ساقی سن کے مے خانے کو ہم ۔۔۔ پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

کیوں نہیں لیتا ہماری تُو خبر اے بے خبر! ۔۔۔ کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم ۔۔۔ مدّتوں اِس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجامؔ پا میں تمکنت ۔۔۔ شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلّاد ہم

(۱) ''مجموعۂ نغز'' از قدرت اللہ قاسم میں پہلا مصرع اس طرح درج ہے:

پگڑی اپنی سنبھالے چلنا شیخ!

بحوالہ: ''شاہ حاتم (حالات و کلام)''، مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مکتبۂ خیابانِ ادب، لاہور، ص ۲۲۴

ذکی، جعفر علی خاں

نام جعفر علی خاں، ذکی تخلّص۔ شاہ عالم کے دربار میں پنج ہزاری منصب پر فائز تھے۔ شجاع الدولہ، صوبے دار اودھ کے ہمراہ بہار اور بنگالہ کی مہم میں ۱۷۶۰ء میں شریک ہوئے۔ نظامت مرشد آباد کے امیدوار تھے، کام یابی نصیب نہیں ہوئی۔ ۶۵-۱۷۶۴ء میں مرشد آباد میں انتقال ہوا۔

منتخب اشعار

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہونا رفو — تا قیامت سوزنِ تدبیر اگر سیتی رہے[1]

عشق میں نسبت نہیں بلبل کو پروانے کے ساتھ — وصل میں وہ جان دے، یہ ہجر میں جیتی رہے

یکرنگ، مصطفےٰ خاں

نام مصطفےٰ خاں، یکرنگ تخلّص۔ یہ خان جہان لودھی کے نبیرہ اور محمد شاہ کے منصب دار تھے۔ بڑی عزت اور عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ تلمذ کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ بعض انھیں مرزا مظہر، بعض سراج الدّین علی خاں آرزو اور بعض شاہ مبارک آبرو کا شاگرد بتاتے ہیں۔ وفات ۱۷۵۲ء کے گرد و پیش۔

منتخب اشعار

مجھے مت بوجھ پیارے اپنا دشمن — کوئی دشمن بھی ہو ہے اپنی جاں کا

سنتا نہیں ہے بات کسی کی تُو اے سجن! — تج کو ترا غرور نہ جانوں کرے گا کیا

اِس قدر کیا ہے حمایت غیر کی — ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

چاہتا تھا کہ کرے عشق کی باتیں یکرنگ — کیا کرے ہائے اُسے طاقتِ گفتار نہیں

بہ رنگِ شمع دائم تجھ لگن میں — سجن روتے پھرے ہم انجمن میں

پارسائی اور جوانی کیونکے ہو — ایک جاگہ آگ پانی کیونکے ہو

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے — میرا صبر و قرار جاتا ہے

---

(۱) یہ شعر امیر خاں انجام سے بھی حسبِ ذیل شکل میں منسوب ہے:

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزنِ تدبیر بھی گو سَو برس سیتی رہے

کیا جانیے، وصال ترا ہو کسے نصیب	ہم تو ترے فراق میں، اے یار، مر چلے
جدائی سے تری اے صندلی رنگ	مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے
عبث تُو بے کسی پر اپنی کیوں ہر وقت روتا ہے	نہ کر غم اے دوانے، عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے

مضمون، شرف الدّین

نام شیخ شرف الدّین، مضمون تخلّص۔ حضرت شیخ فرید الدّین گنج شکر کی اولاد میں تھے۔ جاجو متصل اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ شروعِ جوانی میں دہلی آگئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سراج الدّین علی خان آرزو سے تلمذ حاصل تھا۔ نزلہ سے اُن کے دانت گر گئے تھے۔ اس لیے خان آرزو انھیں ''شاعرِ بیدانہ'' کہتے تھے۔ ۳۵-۱۷۳۴ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔ ان کا دیوان نایاب ہے۔ مختلف تذکروں میں ان کے اشعار ملتے ہیں۔

منتخب اشعار

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا	صبرِ ایوّب کیا، گریۂ یعقوب کیا
کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں	ایک تو گل بے وفا اور تِس پہ جَورِ باغباں
میرا پیغامِ وصل اے قاصد!	کہیو سب سے اُسے جدا کر کے

مظہر جانِ جاں، مرزا

نام جانِ جاں، مظہر تخلّص، لقب شمس الدّین حبیب اللّٰہ تھا۔ عوام میں جانِ جاناں کے نام سے مشہور تھے۔ ۳/مارچ ۱۶۹۹ء کو کالا باغ، صوبہ مالوہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اورنگ زیب کے دربار سے متعلّق تھے۔ جب ان کی عمر ۱۶ سال تھی، تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے مدرسوں اور خانقاہوں میں رہ کر دینی علم اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ مرزا مظہر کو جملہ علوم میں کمال حاصل تھا۔ حدیث کے علم میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ ہزار ہا مسلمان بلکہ ہندو بھی ان کے مرید تھے۔ مرزا مظہر فقیر منش، قناعت پسند اور نازک مزاج تھے۔ ان کے گھر میں ہر شے قرینے سے رکھی ہوتی تھی۔ یہ سنّی مذہب تھے، ایک دیوان فارسی، ایک قدیم دیوان کا انتخاب، ایک نا تمام دیوان اردو اور ایک بیاض، ''خریطۂ جواہر'' ان کی یادگار ہے۔ مظہر پر سات محرم کو قاتلانہ حملہ ہوا اور ان کی وفات ۱۰/محرم ۱۱۹۵ھ مطابق ۷/جنوری ۱۷۸۱ء کو ہوئی۔ دہلی میں چتلی قبر کے پاس گھر ہی میں دفن کر دیے گئے۔ آپ کے شاگردوں میں یقیںؔ، حزیںؔ اور احسن الدّین بیاںؔ صاحبِ دیوان شاعر ہوئے ہیں۔

منتخب اشعار

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اِس جَور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بے کس، افسوس
کیا ہوا اُس کو وہ اِتنا بھی تو بیمار نہ تھا

چلی اب گُل کے ہاتھوں سے لُٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا (۱)

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گُل اپنا، باغباں اپنا

جوتُو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا تجھ کو جو ہم جانتے تھے مہرباں اپنا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے، بس چلتا نہیں، کیا مفت جاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے، جب سنتے ہیں، آتی ہے بہار

الٰہی! مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے
ہمارا، دیکھیے، کیا حال ہو، جب تک بہار آوے

خدا کے واسطے اِس کوں نہ ٹوکو
یہی اِک شہر میں قاتل رہا ہے

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو
مت اِس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

حزیں، میر محمد باقر

میر محمد باقر نام، حزیں تخلّص۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ مرزا مظہر جانِ جاں کے شاگرد تھے۔ دیوان میں جہاں کہیں استاد کا ذکر کرتے ہیں، اس سے ان کی عقیدت اور مرزا صاحب کے لطف و کرم کا پتا چلتا ہے۔ مرد سپاہی تھے اور ملازمت کرتے تھے۔ جب تک دہلی میں رہے، معاش کی طرف سے بے فکر رہے۔ جب مصائب روزگار سے تنگ ہوئے تو عظیم آباد چلے گئے اور وہاں نواب سعید احمد صولت جنگ کی رفاقت میں زندگی بسر کرنے لگے۔ ۱۷۵۲ء میں عظیم آباد میں انتقال ہوا۔ ایک دیوان مع قصائد اُن کی یادگار ہے۔

منتخب اشعار

نہ ہوا اے باغباں! بلبل کو مانع گُل کے ملنے سے
نہیں رہنے کی گلشن میں بہار آخر سدا ہرگز

یہ کہہ کر باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت!
لکھا تھا یوں کہ فصلِ گُل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

(۱) ''تذکرۂ شعرائے اردو'' از میر حسن میں ''لُٹا کر کارواں اپنا'' کے بجائے ''جلا کر آشیاں اپنا'' ہے۔
'چمنستانِ شعرا' از لچھمی نرائن شفیق میں پہلا مصرع یوں ہے:
گئی آخر جلا کر گُل کے ہاتھوں آشیاں اپنا

فصلِ گل آخر ہوئی، کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم — کچھ کرا اے صیاد، اب ہوں گے نہیں آزاد ہم

ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب — چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

جس دن سے میں سنا ہے کہ آخر ہوئی بہار — اُس دن سے چھوٹنے کی مجھے کچھ ہوس نہیں

حال اے قاصد! مرا جو کچھ کہ تُو جاتا ہے دیکھ — اِس طرح سے اُس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

وفا میری اگر جور و جفا تجھ کو نہ سکھلاتی — تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی

میں چاہتا ہوں عشق چھپاؤں، پہ کیا کروں — رسوا کرے ہے خلق میں یہ چشمِ تر مجھے

ہر نصیحت میں تری مانوں گا اے ناصح! پر ایک — دلبروں کے دیکھنے میں دل مرا ناچار ہے

حزیںؔ اِک دم نہ جیتا تھا تجن بن — سو یوں گزرے جدائی کے زمانے

یوں تُو نے مج کو جان! یکا یک بھلا دیا — تیری وفا پہ ہائے نہ تھا یہ گماں مجھے

کچھ کٹے وصل میں، کچھ ہجر میں گریاں گزرے — کیا مری عمر کے اوقات پریشاں گزرے؟

پیامؔ، شرف الدّین علی خاں

نام شرف الدّین علی خاں، پیامؔ تخلّص۔ وطن اکبر آباد، تلمیذِ سراج الدّین علی خاں آرزو۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں تھے۔ میر نے لکھا ہے کہ صاحبِ دیوان تھے۔ وفات ۱۷۴۴ء۔ تذکروں میں ان کے نام سے یہ قطعہ درج ہے:

دلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے — کام عشاق کا تمام کیا

کوئی عاشق نظر نہیں آتا — ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا

موزوںؔ، مہاراجا رام نرائن

نام مہاراجا رام نرائن، موزوںؔ تخلّص۔ قوم کائستھ سری وستوا۔ آبائی وطن موضع کشن پور (مرشد آباد) تھا۔ انھیں ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ نثر نہایت رنگین لکھتے تھے۔ زیادہ تر فارسی میں شعر کہتے تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہہ لیتے تھے۔ شیخ علی حزیںؔ ان کے استاد تھے۔ یہ پٹنہ کے گورنر تھے۔ نواب سراج الدّولہ کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے۔ ایک الزام میں ملزم قرار پائے اور نواب محمد قاسم کے حکم سے اگست ۱۷۶۳ء میں دریائے گنگا میں غرق کر دیے گئے۔ تذکروں میں ان کا مندرجہ ذیل شعر درج ہے۔

غزالاں! تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزرا(۱)

میر حسن نے ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں لکھا ہے کہ جب سراج الدولہ کے شہادت کی خبر شہر میں پہنچی تو بے ساختہ یہ شعر ہو گیا۔ شعر پڑھتے جاتے تھے اور رو رو کر خبر گیروں سے خیریت پوچھتے جاتے تھے۔

سجاد، میر محمد

میر محمد سجاد، سجاد تخلص۔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ شاہ مبارک آبرو کے شاگرد تھے۔ ۱۷۹۹ء اور ۱۸۰۶ء کے درمیان انتقال ہوا۔ علم طب، طلسمات، انشاپردازی اور خوش نویسی میں مہارت اور شعر فہمی میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ انڈیا آفس لائبریری میں سجاد کا ایک مختصر دیوان ہے۔

منتخب اشعار

بتوں کی بھی یہ یاد دو روز ہے — ہمیشہ رہے نام اللہ کا
عشق کی ناو پار کیا ہووے — جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی
اِس زمانے میں دوستی کا رنگ — آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے

ناجیؔ، میر محمد شاکر

میر محمد شاکر نام، ناجیؔ تخلص، ولادت ۱۶۶۵ء سے ۱۷۰۰ء کے درمیان۔ وطن دہلی۔ عمدۃ الملک امیر خاں کے نعمت خانے کے داروغہ تھے۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو یہ وہاں موجود تھے۔ شہر کی تباہی اور بربادی اپنی آنکھ سے دیکھی جس کے پُر درد حالات ایک مخمس میں قلم بند کیا۔ صاحبِ دیوان تھے۔ عین جوانی میں ۱۷۴۷ء کے گرد و پیش انتقال ہوا۔

---

(۱) یہ شعر راجا رام نرائن موزوں نے اس وقت فی البدیہہ کہا تھا جب انھیں سراج الدولہ کے قتل کی خبر ملی تھی۔ شاعر نے دوسرے مصرع میں ''گزرا'' استعمال کیا ہے، لوگ ''گزری'' کے ساتھ پڑھتے ہیں۔
''تذکرۂ شعرائے اردو'' مؤلفۂ میر حسن، بہ تصحیح و تنقید مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۰ء، نیز ''آوارہ گرد اشعار'' قاضی عبدالودود، مشمولہ ''نقوش'' (ادب عالیہ نمبر)، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۷
میر حسن نے ''تذکرۂ شعرائے اردو'' میں لکھا ہے کہ جب سراج الدولہ کی شہادت کی خبر شہر میں پہنچی تو بے ساختہ یہ شعر ہو گیا۔ شعر پڑھتے جاتے تھے اور رو رو کر خبر گیروں سے خیریت پوچھتے جاتے تھے۔

منتخب اشعار

لے جائے شہر شہر، پھر آوے ہے دشت دشت
کرتا ہے آدمی کوں نہایت خراب دل

نہ سیرِ باغ، نہ ملنا، نہ میٹھی باتیں ہیں
یہ دن بہار کے اے جان! مفت جاتے ہیں

بلند آواز سے گھڑیال کہتا ہے کہ اے غافل!
گئی یہ بھی گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہیں چیتا

آج تو ناجی سجن سے کر تُو اپنا عرضِ حال
مرنے جینے کا نہ کر وسواس، ہونی ہو سو ہو

چلا جب روٹھ بے دل ہو کے تب میں بول اُٹھا رو کر
کہ اے ظالم! برستے میں بھی کرتا ہے سفر کوئی

کِیا فردا کا وعدہ سرو قد نے
قیامت کا جو دن سنتے تھے، کل ہے

سوؔدا، مرزا محمد رفیع

مرزا محمد رفیع نام، سودا تخلّص۔ ولادت ۷-۱۷۰۶ء دہلی۔ ان کے والد کابل سے بغرض تجارت دہلی آئے تھے اور یہیں کے ہو رہے۔ سودا کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ ان کو کم عمری ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ بیرونی حملوں اور مرہٹوں کی قتل و غارت سے دل برداشتہ ہو کر فرخ آباد منتقل ہو گئے۔ نواب احمد خاں بنگش کے انتقال کے بعد فیض آباد چلے گئے اور نواب شجاع الدّولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ شجاع الدّولہ کے بعد نواب آصف الدّولہ مسند نشیں ہوئے۔ جب سلطنت کا مرکز لکھنؤ قرار پایا تو سوؔدا بھی لکھنؤ آ گئے۔ سوؔدا نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ قصیدے کے تو وہ بادشاہ تھے۔ ہجو کہنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ سوؔدا نے مرثیے کے لیے مسدس کو مخصوص کر دیا جس کو بعد کے شعرا نے بھی برقرار رکھا۔ ان کی غزلیں موضوعات، مضامین اور زبان کے اعتبار سے اپنے دَور کے کسی شاعر سے کم تر نہیں ہیں۔ میؔر جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، سودا کو مکمل شاعر تسلیم کیا ہے۔ سودا اپنے زمانے کے بہت بڑے استاد مانے گئے ہیں۔ شاعری کے علاوہ سودا کو کتے پالنے اور موسیقی کا بھی شوق تھا۔ ۲۷ رجون ۱۷۸۱ء کو لکھنؤ میں وفات پا گئے اور آغا باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ ایک مختصر دیوان فارسی اور ایک کُلیاتِ اردو (جس میں علاوہ غزلوں کے جملہ اصنافِ سخن)، مثنویاں، قصائد، سلام اور مرثیہ ہیں، ان کی یادگار ہے۔

مرزا کو زبان پر بہت قدرت حاصل تھی، اس کا اعتراف ان کے معاصرین نے کیا ہے۔

اردو شاعری اس جامعیت کا دوسرا شاعر پیش نہیں کر سکتی۔ (کیفی چریا کوٹی)

منتخب اشعار

کس سے بیان کیجیے حالِ دلِ تباہ کا
سمجھے اِسے وہی جو ہو زخمی تری نگاہ کا

دین و دل و قرار و صبر، عشق میں تیرے کھو چکے
جیتے جواَب کی ہم بچے، نام نہ لیں گے چاہ کا

ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے
اے ہم صفیر! فائدہ ناحق کے شور کا

پونچھتے ہی پونچھتے گزرے ہے مجھ کو روز و شب
چشم ہے یارب مری، یا مُنہ کسی ناسور کا

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تُو نے اُسے کس آن میں دیکھا

سوداؔ سے یہ میں پوچھا، دل میں بھی کسی کو دوں
وہ کر کے بیاں اپنی روداد بہت رویا

تھا بجوانی فکر و تردّد، بعد از پیری پایا چین
رات تو کاٹی دکھ سکھ ہی میں، صبح ہوئی، آرام کیا

سوداؔ شرابِ عشق، نہ کہتے تھے ہم، نہ پی
پایا مزہ نہ تُو نے اب اِس کے خمار کا؟

پردے کو تعیّن کے درِ دل سے اُٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا

دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنسِ گراں کا

اِس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے، لیکن
جب چشم کھلے گل کی تو موسم ہو خزاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

سوداؔ ہوئے جب عاشق، کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دِوانے! جب دل دیا تو پھر کیا

ظالم میں کہہ رہا ہوں کہ اِس خوں سے درگذر
سوداؔ کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

جو گزری مجھ پہ مت اُس سے کہو، ہوا سو ہوا
بلاکشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا

یہ کون حال ہے احوالِ دل پہ اے آنکھو!
نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو، ہوا سو ہوا

کبھو میں بات بِن روئے نہیں کی اُس سے، پر اُن نے
نہ پوچھا یوں، سبب کیا ہے ترے ہر بار رونے کا

کہتے تھے، ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو
پر جو خدا دکھائے، سو ناچار دیکھنا

شب تری بزم میں سوداؔ کو میں دیکھا جب تک
کچھ خموشی کے سوا اُس کو سروکار نہ تھا

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا
دی تھی خدا نے آنکھ، سو ناسور ہو گیا

پروانہ اور شمع کی صحبت نہ مجھ سے پوچھ
اپنی نہ کہہ سکا تو کہوں کیا پرائی بات

خدا کے واسطے سوداؔ نہ لے تو نام اُس کا
غضب کرے ہے تری گفتگو مرے دل پر

اب خدا حافظ ہے سوؔدا کا، مجھے آتا ہے رحم
ایک تو تھا ہی دِوانہ، تس پہ آتی ہے بہار

ٹک دیکھ لیں چمن کو چلو لالہ زار تک
کیا جانیں پھر جییں نہ جییں ہم بہار تک

سخنِ عشق نہ گوشِ دلِ بے تاب میں ڈال
مت یہ آتش کدہ اِس قطرۂ سیماب میں ڈال

بھلا گل تُو تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر
بتا روتی ہے کس کی ہستیٔ موہوم پر شبنم؟

ناوک ترے نے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما اپنے خانے میں (۱)

سوؔدا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

دل کو تو ہر طرح سے دلاسا دیا کروں
آنکھیں جو مانتی نہیں، میں اِس کو کیا کروں

کیفیّتِ چشم اُس کی تجھے یاد ہے سودا؟
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں (۲)

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب بھلا راتیں
دو چار گھڑی رونا، دو چار گھڑی باتیں

ہوتی نہیں ہے صبح، نہ آتی ہے مجھ کو نیند
جس کو پکارتا ہوں، وہ کہتا ہے مر کہیں

ساقی ہے یک تبسّمِ گل فرصتِ بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

قاصد! یہی پیام تُو جا کہیو یار سے
اِک شخص جاں بلب ہے ترے انتظار سے

زخم کی طرح زمانے میں تو کاٹ اپنی عمر
خندہ یا گریہ جو کچھ ہووے، سو ٹک درد کے ساتھ

گل پھینکے ہے عالم کی طرف، بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی (۳)

---

(۱) ''کلّیاتِ سودا'' (جلد اوّل) مرتبہ: ڈاکٹر محمد شمس الدین صدّیقی، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۳۱۲ (نسخۂ جانسن، برٹش میوزیم)

''ناوک نے تیرے صید'' نسخۂ آشفتہ، لیڈن، یول اور نرائن (برٹش میوزیم)

''مرغ قبلہ نما آشیانے میں'' نسخۂ بہادر سنگھ، فورٹ ولیم، براؤن، لیڈن، یول اور نرائن (برٹش میوزیم)

(۲) ''کلّیاتِ سودا'' (جلدِ اوّل)، بحوالۂ بالا، ص ۳۰۷ (نسخۂ جانسن، برٹش میوزیم)

(الف) ''مجھے یاد ہے سوؔدا'' (نسخہ نمبر ۵۹، برٹش میوزیم)

نیز عبدالباری آسی کا مرتبہ کلّیاتِ سودا، مطبوعۂ نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۰ء

(ب) ''ساغر تو مرے ہاتھ سے لیجو'' (نسخۂ آشفتہ، برٹش میوزیم)

(ج) ''ہاتھ سے لیجے کہ چلا میں'' (نسخۂ ایجرٹن، برٹش میوزیم)

(۳) ''کلّیاتِ سودا''، مرتبۂ عبدالباری آسی، مطبوعۂ نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء، اور نسخہ نمبر ۵۹، برٹش میوزیم میں بالترتیب یوں درج ہے:

ع: گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف...

ع: گل پھینکے ہے اوروں کی طرف...

''کلّیاتِ سودا'' (جلدِ اوّل)، بحوالۂ بالا، ص ۴۹۴

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ — کافی ہے تسلّی کو مرے ایک نظر بھی

سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات — آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکے تجھ بغیر — اِس گفتگو سے فائدہ؟ پیارے، گزر گئی

یارو! وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا — آنکھوں میں سَو طرح کی حکایات ہوگئی

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے — ہماری خاک سے ٹک دیکھ، کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور، مرا عجز تا کجا ظالم! — ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشت زار میں مجنوں — کہ اِس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تُو فریفتہ ہووے، خدا کرے

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں — اِس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کِیا کرے

گر ہو شراب و خلوت و محبوبِ خوب رُو — زاہد! قسم ہے تجھ کو، جو تُو ہو تو کیا کرے

قاتل! ہماری نعش کی تشہیر ہے ضرور — آئندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے

سوداؔ کو جرمِ عشق سے کرتے ہیں آج قتل — پہچانتا ہے تُو، یہ گنہگار کون ہے؟

کہیو صبا، سلام ہمارا بہار سے — ہم تو چمن کو چھوڑ کے سُوئے قفس چلے

سوداؔ کے جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت — خدّامِ ادب بولے، ابھی آنکھ لگی ہے [1]

سوداؔ جہاں میں آ کے کوئی کچھ نہ لے گیا — جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لیے

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف — دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

خواہ کعبے میں تجھے، خواہ میں بت خانے میں — اتنا سمجھوں ہوں مرے یار، کہیں دیکھا ہے

جس روز کسی اَور پہ بے داد کرو گے — یہ یاد رہے، ہم کو بہت یاد کرو گے

ہے مدّتوں سے خانۂ زنجیر بے صدا — معلوم ہی نہیں کہ دِوانے کدھر گئے

بلبل چمن میں تیغ نگہ کس کی چل گئی — جس گل کو دیکھتا ہوں، سو زخموں سے چُور ہے

طنزیہ و مزاحیہ اشعار

شیخ جی گول ہیں، دستار بھی ہے اُن کا گول — چھپ رہا ریشِ مبارک کے تلے پیٹ کا جھول

---

(۱) ''کلّیاتِ سودا'' (جلد اوّل) مرتبہ: ڈاکٹر محمد شمس الدّین صدّیقی، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۴۸۶ (نسخۂ جانسن، برٹش میوزیم)
''کلّیاتِ سودا''، مرتبۂ عبدالباری آسی، مطبوعۂ نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء میں فعل 'گیا' کے بجائے 'کیا' درج ہے۔

لشکر کے بیچ آج یہی قیل و قال ہے
کھانے کی چیز کھانے کا سب کو خیال ہے
امرو نہی میں دخل یوں کرنا محال ہے
جو فقہ داں ہیں، سب کا یہ اُن سے سوال ہے
اِک مسخرا یہ کہتا ہے، کوّا حلال ہے

واقفؔ، شاہ واقف

شاہ واقف نام، واقف تخلّص۔ کہتے ہیں، فیض آباد میں ایک درویش تھے جنھیں منقبت کہنے میں شہرت تھی، کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیتے تھے۔ سوداؔ کے ہم عصر تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں زندہ تھے۔

منتخب اشعار

خیالِ وعدہ ترا بس کہ تُو نظر میں رہا
تمام رات مرا جی صدائے در میں رہا

کروں میں شکوہ اگر تیری بے وفائی کا
جہاں میں نام نہ لے کوئی آشنائی کا

ابھی حواس بھی ثابت مجھے نہیں آئے
خدا کے واسطے مت نام لے جدائی کا

کیا کیا کہا تھا، کیونکے لیا تھا ہمارا نام
قاصد! خدا کے واسطے پھر کر بیان تُو

ڈھلا دن آج کا بھی اور نہ آیا تُو تو پھر ہم نے
چراغِ آہ سے پھر روشن کیا شامِ غریباں کو

کہوں کیا اُس کے وعدے کی حقیقت، پوچھتے کیا ہو
وہی شام و سحر ہے اور وہی امروز و فردا ہے

سب سے ملتے تو ہو ظاہر میں، یہ دھڑکا ہے مجھے
کہیں مجھ سا نہ کوئی اَور گرفتار ملے

صبا گلشن میں جاوے گی تو یہ کہہ دیجیو گل سے
تجھے، اے بے وفا، کیا فائدہ ہے خونِ بلبل سے

ضیا، میر ضیاء الدّین

نام میر ضیاء الدّین، ضیا تخلّص۔ سودا کے ہم عصر تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد فیض آباد اور لکھنؤ آئے۔ بعد ازاں عظیم آباد گئے جہاں مہاراجا شتاب رائے کے بیٹے راجا بہادر متخلّص بہ راجا اُن کے شاگرد ہو گئے۔ بقیہ زندگی اسی شہر میں گزار دی۔ میر حسن ان کے شاگرد تھے۔ جب کوئی شعر سوز و گداز سے بھرا سنتے تھے تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آتے تھے۔ ۱۷۸۱ء میں عظیم آباد میں انتقال ہوا۔

منتخب اشعار

برس اے ابر! جتنا چاہے تُو، اب تیری باری ہے
کبھی دل تھا تو میں بھی رو رو اِک دریا بہاتا تھا

دیکھوا اے دوستاں! چپکا ضیا کیوں ہو گیا
مر گیا بے تاب ہو، یا روتے روتے سو گیا

میں نے کل پوچھا ضیا سے، دل کو کیدھر کھو دیا
اُس نے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ دے رو دیا

رسوائیوں کی اپنی مجھے کچھ ہوس نہیں
ناصح! پہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

ٹک آہ بچ نکل، نہ کہیں دل تھلک پڑے
یہ جام بھر رہا ہے، مبادا چھلک پڑے

تیرے ضیا کا حال میں پوچھا تھا شمع سے
اک آہ اس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک پڑے

کون سے زخم کا کُھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

تم تو ہمارے پاس سے جاؤ گے کل، پہ ہائے
اپنی نظر میں آج جہاں سب اُداس ہے

آہستہ پاؤں رکھیو اے بُوئے گل زمیں پر
سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے

بھول کر بھی کبھی نہ یاد کیا
ہم ترے جی سے ایسے بھول گئے

کسی دشمن کی بھی یارب نہ گزرے شب جدائی کی
کہ جیسے اُس سے میرے وصل کا اِک دن گزرتا ہے

نثار، محمد امان

محمد امان نام، نثار تخلص ۔ وطن دہلی ۔ مجدالدولہ کے ہاں صیغۂ تعمیر میں ملازم تھے، بعد میں نواب ضابطہ خاں کے ہاں رہے۔ آخر میں راجا ٹیک رائے کی سرکار میں اپنے پیشے کی بدولت عزت سے زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کے بزرگ ممتاز ریاضی دان اور مہندس تھے جنھوں نے دہلی کی جامع مسجد بنائی۔ نثار شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان ان کی یادگار ہے جس میں غزلیات، رباعیات اور قطعات شامل ہیں۔

منتخب اشعار

مجھ میں اور اُن میں، سبب کیا جو لڑائی ہوگی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی

کیا کام ہوا ہم سے، خدا جانیے، ایسا
اپنا ہی جہاں سنتے ہیں، مذکور رہے ہے

انکار تو نہ کر، مرے ہاتھوں سے پان لے
کافر! خدا کے واسطے یہ بات مان لے

قدرت، شیخ قدرت اللّٰہ

نام شیخ قدرت اللّٰہ، قدرت تخلص ۔ عرف عام میں شاہ قدرت یا شاہ قدرت اللّٰہ کے نام سے مشہور تھے۔ تقریباً ۱۷۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ وطن دہلی تھا۔ میر شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد وہ لکھنؤ آئے

اور وہاں سے عظیم آباد ہوتے ہوئے مرشد آباد میں سکونت اختیار کی۔ وہاں کے امرا و شرفا نے ان کی قدر دانی کی۔ تمام عمر قلندرانہ وضع سے زندگی بسر کرتے رہے۔ ۹۱-۱۷۹۰ء میں مرشد آباد میں وفات پائی۔ شاہ قدرت فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے، مگر بنیادی طور پر وہ اردو کے شاعر تھے۔ وہ صاحبِ دیوان ہیں، لیکن ان کا دیوان شائع نہیں ہوا ہے۔

شاہ قدرت اس دَور کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ اس دَور کی شاعری میں ان کی آواز سارے شاعروں سے ایک الگ آواز ہے۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی)

منتخب اشعار

جب مسیحا دشمنِ جاں ہو تو کب ہو زندگی ۔۔۔ کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگا

مجھ کو غفلت نے خبر ایّام فرصت کی نہ دی ۔۔۔ آہ! جب جاتے رہے دن، تب میں پچھتانے لگا

اوپر سے زخم گرچہ ہرے ہو چلے، ولے ۔۔۔ ناسور تھا جگر میں، سو ناسور رہ گیا

یک بار بھی گھر سے تُو نہ نکلا ۔۔۔ سَو بار تو در پہ ہو گئے ہم

رکھ نہ آنسو سے وصل کی اُمید ۔۔۔ کھاری پانی سے دال گلتی نئیں

لے اُڑا شوقِ جنوں ریگِ رواں کے ہمرہ ۔۔۔ نہ کچھ آغاز میں سوجھے ہے نہ انجام ہمیں

عشق کی منزل میں اے غافل، تُو سجدے سے نہ چُوک ۔۔۔ دیر و مسجد، کعبہ و بت خانہ چاروں ایک ہیں

ہماری خاک پر کہتی یہ بلبل بے قرار آئی ۔۔۔ ارے کس نیند سوتا ہے، دِوانے اُٹھ، بہار آئی

درازی شبِ غم کی مت پوچھ قدرت ۔۔۔ کہ اِک اِک گھڑی اُس کی سَو سَو برس ہے

حسرت اے صبحِ وطن! ہم سے چمن چھوٹے ہے ۔۔۔ مژدہ اے شامِ غریبی! کہ وطن چھوٹے ہے

تصرّف دیکھیو ٹک جذبۂ عشقِ حقیقی کا ۔۔۔ گیا لے فرش سے تا عرش مشتِ خاکِ آدم کو

نہ واقف کارواں سے ہوں، نہ کچھ آگاہ منزل سے ۔۔۔ کِیا میں وادیٔ الفت کو طے اِک جنبشِ دل سے

ہم خانہ خرابوں نے کہیں تجھ کو نہ پایا ۔۔۔ اے خانہ برانداز! تُو بتلا کہ کہاں ہے؟

سراج اورنگ آبادی

نام سید سراج الدّین، تخلّص سراج۔ ولادت ۱۷۱۵ء وطن اورنگ آباد۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ آپ سادات کے ایک برگزیدہ خاندان کے فرد تھے۔ بارہ برس کی عمر میں ان پر وحشت طاری ہوگئی اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ کیفیت سات سال تک رہی۔ وہ ایک درویش منش اور باکمال صوفی بزرگ تھے۔ ان کے مرید اور شاگرد بہ کثرت

تھے۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اردو کی ایک ضخیم کلّیات، فارسی اساتذہ کے کلام کا انتخاب اور ایک مثنوی ''بوستانِ خیال'' ان کی یادگار ہے۔ ولی کے انتقال کے بعد سراج شاعری میں ان کے قائم مقام سمجھے جاتے ہیں۔

منتخب اشعار

میرے جگر کے درد کا چارہ کب آئے گا
یک بار ہو گیا ہے، دوبارہ کب آئے گا

سب جگت ڈھونڈ پھرا، پیو کو نہ پایا ہرگز
دل کے گوشے میں مکاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

دورنگی خوب نئیں، یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا

نیند سے جب کھل گئیں آنکھیں، سو دیکھا یار کو
یا اندھارا اِس قدر تھا یا اُجالا ہو گیا

سب پر ہے کرم، مجھ پہ ستم، کیا ہے دورنگی
دل دار کسی کا ہے، دل آزار کسی کا

میں نہ جانا تھا کہ تُو یوں بے وفا ہو جائے گا
آشنا ہو اِس قدر، نا آشنا ہو جائے گا

دیوانے کوں مت شورِ جنوں یاد دلاؤ
ہرگز نہ سناؤ اُسے زنجیر کی آواز

ہجر کی راتوں میں لازم ہے بیانِ زلفِ یار
نیند تو جاتی رہی ہے، قصہ خوانی کیجیے

آج کی رات مرا چاند نظر آیا ہے
چاندنی دُودسی چھٹکی ہے مرے آنگن میں

کب تک روا رکھو گے تغافل سراج پر
اب اِس قدر بھی خوب نہیں سرگرانیاں

اگر خواہش ہے تج کوں اے سراج آزاد ہونے کی
کمندِ عقل کوں ہرگز گلے کا ہار مت کیجو

عشق اور عقل میں ہوئی ہے شرط
جیت اور ہار کا تماشا ہے

مری آنکھوں کے دونوں پٹ کھلے تھے انتظاری میں
سو ویسے میں یکایک دیکھتا کیا ہوں کہ آتا ہے

خبرِ تحیّرِ عشق سن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

کبھی سمتِ غیب سیں کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو، سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں میں کروں بیاں
کہ شرابِ صد قدح آرزو خُمِ دل میں تھی، سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، مگر ایک بے خطری رہی

تاباں، عبدالحئ

نام عبدالحئ، تاباں، تخلّص۔ تقریباً ۱۷۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ وطن دہلی تھا۔ شاہ حاتم اور محمد علی حشمت سے تلمذ حاصل تھا۔ نہایت حسین و جمیل تھے اور یوسف ثانی کہلاتے تھے۔ تمام تذکرہ نویسوں نے ان کے حسن و جمال کی تعریف کی ہے۔ مرزا مظہر جان جاں کو ان کے ساتھ خاص انسیت تھی۔ شراب نوشی کی لت پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے عین عالمِ شباب میں ۱۷۴۹ء اور ۱۷۵۲ء کے درمیان انتقال کر گئے۔ ایک دیوان اُن کی یادگار ہے۔

منتخب اشعار

بلبلو! کیا کرو گے اب چھٹ کر
گلستاں تو اُجڑ چکا کب کا

کس کس طرح کی دل میں گزرتی ہیں حسرتیں
ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو، ہوا سو ہوا
تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

عجب احوال ہے تاباںؔ کا تیرے
کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

سبب کیا ہے کہ تم روٹھے ہو ہم سے
بتاؤ کیا کِیا میں نے تمھارا؟

ہوا بھی عشق کی لگنے نہ دیتا میں اِسے ہرگز
اگر اِس دل پہ ہوتا ہاے کچھ بھی اختیار اپنا

مجھے آتا ہے رونا ایسی تنہائی پہ اے تاباںؔ!
نہ یار اپنا، نہ دل اپنا، نہ تن اپنا، نہ جاں اپنا

خزاں تک تو رہنے دے صیّاد ہم کو
کہاں یہ چمن پھر، کہاں آشیانہ

آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا
جس کو دیکھا، سو اپنے مطلب کا

حرم کو چھوڑ رہوں کیوں نہ بت کدے میں شیخ
کہ یاں ہر ایک کو ہے مرتبہ خدائی کا

دیکھ قاصد کو مرے یار نے پوچھا تاباںؔ
کیا مرے ہجر میں جیتا ہے وہ غم ناک ہنوز؟

ہم تو آخر مر گئے رو رو تمھارے ہجر میں
سچ کہو، اب بھی کبھی آتے ہیں تم کو یاد ہم؟

سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں
کیا بلبلوں نے، دیکھو، دھومیں مچائیاں ہیں

آئینہ رو برو رکھ اور اپنی چھب دکھانا
کیا خود پسندیاں ہیں، کیا خود نمائیاں ہیں

کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں جئیں گے
اب کس کے ساتھ پیارے وے دل رُبائیاں ہیں

اے بلبلو! چمن میں نہ جاؤ، گئی بہار
گلشن میں خار و خس کے سوا کچھ رہا نہیں

کہتے ہیں، اثر ہے گا رونے میں، یہ ہیں باتیں
اِک دن بھی نہ یار آیا، روتے ہی کٹیں راتیں

عالم میں تیرے عشق سے تاباںؔ ہوا خراب — کیا تجھ کو اس کے حال کی اب تک خبر نہیں؟

اَن جان ہو تو اُس سے کوئی دردِ دل کہے — جو جانتا ہو، میں اُسے آگاہ کیا کروں

دیکھا جو میری نبض کو، کہنے لگا طبیب — مجنوں موا تھا جس سے، یہ آزار ہے وہی

ڈھونڈا بہت پہ کھوج نہ پایا اُنھوں کا ہاے — معلوم ہم کو کچھ نہ ہوا، وے کہاں گئے

تُو بھلی بات سے بھی میری خفا ہوتا ہے — آہ یہ چاہنا ایسا ہی بُرا ہوتا ہے

محفل کے بیچ سن کے مرے سوزِ دل کا حال — بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

درد، خواجہ میر

خواجہ میر نام، دردؔ تخلص۔ ۱۷۲۰-۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب فارسی کے شاعر اور بہت بڑے بزرگ تھے۔ خواجہ میر درد نے اپنے والد ہی کے آغوش تربیت میں تمام علوم کی تکمیل کی۔ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ کچھ دنوں شاہی فوج میں ملازمت کی۔ اٹھائیس برس کی عمر میں دنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ باپ کے مرنے کے بعد ان کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہوئے۔ سراج الدین علی خاں آرزو سے تلمذ حاصل تھا۔ انھیں موسیقی سے بھی لگاو تھا اور سماع سننے کے بہت شوقین تھے۔ غریب، امیر اور بادشاہ تک ان کی بزرگی اور ذاتی تقدس کی وجہ سے ان سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ توکل اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ مرتے دم تک دلّی سے باہر قدم نہیں نکالا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم ان کی بزمِ سماع میں چلے آئے۔ پاؤں میں درد تھا۔ ضبط نہ کر سکے۔ پاؤں پھیلا دیے۔ خواجہ صاحب کو نہایت ناگوار ہوا۔ بادشاہ نے عذر کیا کہ مجبور ہوں، پاؤں میں درد ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ”طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس سے خواجہ صاحب کے استغنا کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۷ر جنوری ۱۷۸۵ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ اردو اور فارسی دیوان کے علاوہ ان کی تصوف اور دیگر علوم پر متعدد کتابیں ہیں۔ ان کی شاعری میں سب سے گہرا رنگ تصوف کا ہے۔ خواجہ صاحب کے بہت سے شاگرد تھے جن میں قائم چاند پوری، ہدایت، ہدایت اللہ ہدایت، ثناء اللہ فراق اور سید محمد اثر مشہور ہیں۔

اگرچہ مختصر، مگر مثل کلام حافظ شیرازی سراپا انتخاب۔ (میر حسن)

تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے۔ (مولانا محمد حسین آزاد)

ان کی غزلیں پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ (امیر مینائی)

ان کے پاکیزہ کلام کے مطالعہ کے لیے پاکیزہ نگاہ درکار ہے۔ (اثر لکھنوی)

منتخب اشعار

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا ۔۔۔ برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم ۔۔۔ کھلی آنکھ جب، کوئی پردا نہ دیکھا
حال مجھ غم زدے کا جس تس نے ۔۔۔ جب سنا ہوگا، رو دیا ہوگا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا ۔۔۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ ۔۔۔ وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دُور نہ تھا ۔۔۔ پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
باوجودے کہ پر و بال نہ تھے آدم کے ۔۔۔ وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حُسن کے شعلے کے حضور ۔۔۔ شمع کے مُنہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً، لیکن ۔۔۔ میں جو پوچھا تو کہا، خیر یہ مذکور نہ تھا
دردؔ کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانا ۔۔۔ اس کو کچھ اَور سوا دید کے منظور نہ تھا
سو بھی نہ تُو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک! ۔۔۔ اَور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک، مگر دیکھنا
دشمنی نے سُنا نہ ہووے گا ۔۔۔ جو ہمیں دوستی نے دکھلایا
طوفانِ نوح نے تو ڈُبائی زمیں فقط ۔۔۔ میں ننگِ خلق ساری خدائی ڈبو گیا
سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا ۔۔۔ بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا
تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا ۔۔۔ پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا
کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری ۔۔۔ جی میں یہ کس کا تصوّر آ گیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما ۔۔۔ اِس طرف کو کبھو گزر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا ۔۔۔ کچھ خدا کا بھی تُو نے ڈر نہ کیا
جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا ۔۔۔ تُو ہی آیا نظر، جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی ۔۔۔ جس طرف تُو نے آنکھ بھر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی ۔۔۔ ہم نے سَو سَو طرح سے مر دیکھا
میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے ۔۔۔ مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

خفا ہو کے اے دردؔ مر تو چلا تُو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

کبھو خوش بھی کیا ہے دل کسی رندِ شرابی کا؟
بھڑا دے مُنہ سے مُنہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

تم آ کر جو پہلے ہی مجھ سے ملے تھے
نگاہوں میں جادو سا کچھ کر دیا تھا

بارے مجھے بتا تو سہی، کیا سبب ہوا
پھر مجھ پہ مہربان ہوا تُو، غضب ہوا

باہر نہ آ سکی تُو قیدِ خودی سے اپنی
اے عقلِ بے حقیقت! دیکھا شعور تیرا

کچھ ہے تجھے خبر بھی کہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو
عاشق تری گلی میں کئی بار ہو گیا

جائیے کس واسطے اے دردؔ! مے خانے کے بیچ
اور ہی مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

صیّاد! اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو
پھر کس کو زندگی کی توقّع بہار تک

ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر
مگر یہ زندگیٔ مستعار رکھتے ہیں

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز
ہر چند کہ عالم میں ہوں، عالم سے جدا ہوں

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اپنے ملنے سے منع مت کر
اِس میں بے اختیار ہیں ہم

سیر کر دنیا کی غافل! زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

غافل! جہاں کی دید کو مفتِ نظر سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اِس عالم کو خواب میں

مدّت تلک جہان میں ہنستے پھرا کیے
جی میں ہے، خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

ہر چند نہیں صبر تجھے دردؔ ولیکن
اِتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

تہمتِ چند اپنے ذمّے دھر چلے
جس لیے آئے تھے ہم، سو کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شمع کے مانند ہم اِس بزم میں
چشمِ نم آئے تھے، دامن تر چلے

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاو
جب تلک بس چل سکے، ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے، یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے، کیدھر چلے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تُو سما سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے، اگر تُو بھلا سکے

یارب! یہ کیا طلسم ہے، ادراک وفہم یاں
دوڑے ہزار، آپ سے باہر نہ جا سکے

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیے
پردے تعینات کے جو تھے، اُٹھا دیے

دونوں جہان کی نہ رہی پھر اُسے خبر
دو پیالے تیری آنکھوں نے جس کو پلا دیے

ٹک خبر لے کہ ہر گھڑی ہم کو
اب جدائی بہت ستاتی ہے

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ! چھوڑ گئی تُو کہاں مجھے

میرے تغیّرِ حال پر مت جا
یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

ہم کہتے نہ تھے دردؔ، میاں! چھوڑ یہ باتیں
پائی نہ سزا، اور وفا کیجیے اُس سے

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ تُو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

بسا ہے کون ترے دل میں گل بدن اے دردؔ
کہ بُو گلاب کی آئی ترے پسینے سے

مت عبادت پہ بھولیو زاہد
سب طفیلِ گناہِ آدم ہے

دردؔ کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

کبھو رونا، کبھو ہنسنا، کبھو حیران ہو رہنا
محبت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

عبث دل بے کسی اپنی پہ تُو ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دِوانے! عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے

خوابِ عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے
آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے

اُٹھتی نہیں ہے خانۂ زنجیر سے صدا
دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے؟

دل دے چکا ہوں اُس بتِ کافر کے ہاتھ میں
اب میرے حق میں، دیکھیے، اللہ کیا کرے

نشو و نما کی کس کو اُمید اے بہار! یاں
میں خشک شاخ ہوں کہ نہ پھولے، نہ پھل سکے

تاباں، پنڈت مہتاب راے

پنڈت مہتاب راے نام، تاباں تخلّص۔ تاباں نے خواجہ میر درد کے مشاعرے میں غزل پڑھی۔ کم عمری میں انتقال ہو گیا۔ مندرجۂ ذیل شعر ان کے نام منسوب ہے:

شعلہ بھڑک اُٹھا مرے اِس دل کے داغ سے (۱)
آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

تاب، مہتاب رائے

مہتاب رائے نام، تاب تخلّص۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل وطن کشمیر تھا، مگر کئی پشت سے ان کے خاندان کی دہلی میں سکونت تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں حیات تھے۔

منتخب اشعار

یا تنگ نہ کر ناصحِ ناداں مجھے اتنا　　یا چل کے دکھا دے دہن ایسا، کمر ایسی

قافلے میں آج کیا شورِ فغان و آہ ہے!　　نالۂ لیلیٰ کے شاید قیس بھی ہم راہ ہے

قلندر، لالا بدھ سنگھ

نام لالا بدھ سنگھ، قلندر تخلّص۔ مظہر جانِ جاں کے شاگرد تھے۔ اپنا مذہب ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ تذکروں میں اُن کا یہ شعر درج ہے:

تھمتے ہی تھمیں گے اشک ناصح
رونا ہے یہ، کچھ ہنسی نہیں ہے

سوز، محمد میر

سید محمد میر نام، سوز تخلّص۔ دہلی میں ۱۷۲۱ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ انھوں نے پہلے میر تخلّص اختیار کیا تھا، لیکن میر تقی میر کی شہرت دیکھ کر اپنا تخلّص تبدیل کر دیا۔ میر سوز شاعری کے علاوہ تیر اندازی، شہ سواری اور خوش نویسی

(۱) مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں اس شعر کو حسبِ ذیل شکل میں پیش کیا ہے اور یہ اسی طرح مشہور ہے:

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: ''یہ شعر ایک لڑکے نے مشاعرے میں پڑھا تھا جو کچھ ہی دنوں بعد جل کر مر گیا۔''

کالی داس گپتا رضا کی تحقیق کے مطابق: ''یہ شعر پنڈت مہتاب رائے تاباں کے شعر کی قدرے ترقی یافتہ شکل ہے۔ بحوالہ: ''سہو و سراغ'' کالی داس گپتا رضا، مرتبۂ صابر دت، ادارۂ فن اور شخصیت، بمبئی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۱

میں بھی درک رکھتے تھے۔ شعر اس طرح پڑھتے تھے کہ مضمون شعر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ وہ قناعت پسند اور صابر و شاکر انسان تھے۔ تنگ دستی کے باوجود انھوں نے امرا کی خوشامد کو شعار نہیں بنایا۔ دہلی کی تباہی کے بعد انھوں نے فرخ آباد، مرشد آباد اور لکھنؤ میں قیام کیا۔ لکھنؤ میں آصف الدّولہ نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ عمر کے آخری حصّے میں وقت زیادہ تر عبادت میں صرف کرتے تھے۔ ۹۹-۱۷۹۸ء میں بمقام تلہر، شاہ جہاں پور وفات پا گئے۔ ایک دیوان یادگار ہے جس میں غزلوں کے علاوہ مثنوی، رباعی اور مخمس ہیں۔

انھوں نے علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دو چند ہو جاتا تھا۔ شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے۔ شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے اور اس میں اعضا سے بھی کام لیتے تھے۔

میر و سودا کے دَور میں دردؔ و قائمؔ کے بعد اگر کسی کا نام آتا ہے تو وہ محمد میر سوزؔ ہیں۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی)

منتخب اشعار

شہرۂ حُسن سے از بس کہ وہ محجوب ہوا	اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا (۱)
رات کو نیند ہے نہ دن کو چین	ایسے جینے سے، اے خدا! گزرا
کیوں تُو گھبرایا ہوا پھرتا ہے آج	سوزؔ! سچ کہہ، آج تیرا کیا گیا؟
جن کو نت دیکھتے تھے، اب اُن کو	دیکھنا ہی خیال و خواب ہوا
اہلِ ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہو گیا	آہ یارب! رازِ دل اُن پر بھی ظاہر ہو گیا
رسوا ہوا، خراب ہوا، مبتلا ہوا	وہ کون سی گھڑی تھی کہ تجھ سے جدا ہوا
مجھ سے مت جی کو لگاؤ کہ نہیں رہنے کا	میں مسافر ہوں، کوئی دن کو چلا جاؤں گا
صدا ہے در پہ کچھ پیغام بر کی سی، خدا جانے	نویدِ وصل ہے، یا ہجر کا پیغام لے آیا
کہتا نہ تھا میں اے دل! اِس کام سے تُو باز آ	دیکھا مزہ نہ تُو نے نادان عاشقی کا
مت سوزؔ کی بات مجھ سے پوچھو	ایسا تو کہیں سنا نہ دیکھا
یار اغیار ہو گئے اللہ	کیا زمانے کا انقلاب ہوا
بغیر از عاشقی کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا	تڑپنے کے سوا آرام مجھ سے ہو نہیں سکتا

(۱) ''کلّیاتِ سوز'' مرتبہ ڈاکٹر سیّد علی حیدر نیر، ادارۂ تحقیقاتِ عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۱

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند | جو گنہ کیجیے، ثواب ہے آج
مرا جان جاتا ہے، یارو! سنبھالو | کلیجے میں کانٹا گڑا ہے، نکالو
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی | مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو
میں وہ درخت خشک ہوں اِس باغ میں صبا! | جس کو کسو نے سبز نہ دیکھا بہار میں
غم ہے یا انتظار ہے، کیا ہے؟ | دل جواَب بے قرار ہے، کیا ہے؟
ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیاں ہوں | پر یہ خبر نہیں ہے، میں کون ہوں، کہاں ہوں
بلبل کدھر تُو پھرتی ہے غافل! خبر لے جلد | گل نے لگائی آگ ترے آشیانے میں
لے پھرا میں کہاں کہاں دل کو | نہ لگا، لے گیا جہاں دل کو
کسی عنوان اِس کو چین نہیں | آہ، لے جایئے کہاں دل کو
پرکار کی روش چلے، ہم جتنے چل سکے | اِس گردشِ فلک سے نہ باہر نکل سکے
سر زانو پہ ہو اُس کے اور جان نکل جائے | مرنا تو مسلّم ہے، ارمان نکل جائے

میرؔ، محمد تقی

محمد تقی نام، میرؔ تخلّص۔ ۲۳-۱۷۲۲ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ میرؔ ایک غریب گھرانے سے تعلّق رکھتے تھے۔ ان کے والد علی متقی درویش صفت انسان تھے۔ ان کے والد کے دوست سید امان اللّٰہ کے زیرِ نگرانی میرؔ کی تربیت شروع ہوئی۔ جب وہ گیارہ سال کے تھے تو ان کے والد اور سید امان اللّٰہ دونوں کا انتقال ہو گیا۔ میرؔ تلاشِ معاش میں نکلے اور دہلی پہنچے۔ یہاں ان کی ملاقات خواجہ محمد باسط سے ہوئی۔ انھوں نے میر تقی میرؔ کو اپنے چچا صمصام الدّولہ کی خدمت میں پیش کیا۔ صمصام الدّولہ نے محمد علی متقی کی وفات پر نہ صرف اظہارِ افسوس کیا بلکہ یہ کہہ کر کہ ”مجھ پر اس شخص کے حقوق ہیں“ ایک روپیہ روز وظیفہ مقرر کر دیا۔ صمصام الدّولہ فروری ۱۷۳۹ء میں فوت ہو گئے اور وظیفہ بند ہو گیا۔ میرؔ اکبر آباد واپس آ گئے۔ جب گزر اوقات کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے اکبر آباد کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا اور دہلی چلے آئے اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدّین علی خاں آرزو کے یہاں قیام کیا۔ ان سے کسبِ فیض کیا اور انھی کی ایما سے شاعری شروع کی۔ آرزو کے یہاں میرؔ تقریباً سات سال رہے۔ بعد میں تلخی کے سبب خان آرزو سے الگ ہو گئے۔

میرؔ نے کئی جگہ ملازمت کی، لیکن کوئی راس نہ آئی۔ اپنے والد کی وفات سے لے کر ۱۷۷۲ء تک میر نے زندگی

میں پریشانیوں، افلاس اور خانہ جنگیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرتے ہوئے انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دہلی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ناساز گار حالات کی بنا پر اہلِ ہنر ایک ایک کر کے دہلی چھوڑ رہے تھے۔ سوز اور سودا دہلی چھوڑ چکے تھے۔ نواب سالار جنگ کی وساطت سے نواب آصف الدّولہ کی طلبی پر ۱۷۸۱ء میں لکھنؤ پہنچے۔ تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا، لیکن یہ مشاہرہ باقاعدگی سے ماہ بہ ماہ نہیں ملتا تھا۔ ایسی صورت میں تنگی و پریشان حالی کا ازالہ ممکن نہ تھا۔ میرؔ نازک مزاجی کی وجہ سے عمر بھر پریشان رہے۔ اپنی زندگی کے باقی ۲۹ سال گزار کر ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ ان کی حسبِ ذیل تصانیف ہیں:

(۱) چھ دیوان غزلوں کے (۲) ایک دیوان فارسی (۳) متعدد مثنویاں (۴) نکات الشعرا (اردو شاعروں کا تذکرہ) (۵) ذکرِ میر (۶) فیضِ میر (ایک مختصر فارسی تصنیف)

میر تقی میرؔ کو خدائے سخن کہا گیا ہے۔ سودا، مصحفی، ناسخ، غالب، ذوق، داغ، حالی اور دوسرے تمام مشاہیر نے ان کی استادی کی تعریف کی ہے۔

> اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میرؔ کا نام اس فہرست میں داخل کرنا پڑے گا۔ (ڈاکٹر عبدالحق)
>
> اردو کے بہت کم شاعروں کے یہاں حقائق کی جستجو کے لیے اتنی تڑپ پائی جاتی ہے جتنی میرؔ کے کلام میں ہے۔ (ڈاکٹر سیّد عبداللہ)
>
> میرؔ کا سا غزل گو نہ اِس وقت تک پیدا ہوا نہ آگے اِس کی امید ہے۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

لگا نہ دل کو کہیں، کیا سُنا نہیں تُو نے ۔۔۔ جو کچھ کہ میرؔ کا اِس عاشقی نے حال کیا

آئے بن اُس کے حال ہوا جائے ہے تغیّر ۔۔۔ کیا حال ہوگا، پاس سے جب یار جائے گا

تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب! ۔۔۔ اب جان ہی کے ساتھ یہ آزار جائے گا

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے ۔۔۔ کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار ۔۔۔ تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

وصیّت میرؔ نے مجھ کو یہی کی ۔۔۔ کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب، لیکن ۔۔۔ رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

اُس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے ۔۔۔ جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تُو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اِک شوق کا دفتر نکلا

ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا و لے
اِک آدھ حرف پیار کا مُنہ سے نکل گیا

شکر کیا اُس کی کریمی کا ادا بندے سے ہو
ایسی اک ناچیز مشتِ خاک کو انساں کیا

کچھ زرد زرد چہرہ، کچھ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہے اے میرؔ! حال تیرا

گلی میں اُس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میرؔ میرؔ کر اُس کو بہت پکار رہا

مُنہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

نامرادی کی رسم میرؔ سے ہے
طور یہ اِس جوان سے نکلا

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

کہتے نہ تھے میرؔ مت کڑھا کر
دل ہو نہ گیا گداز تیرا

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

داغِ فراق و حسرتِ وصل، آرزوے شوق
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

نالۂ میرؔ نہیں رات سے سنتے ہم لوگ
کیا ترے کوچے سے، اے شوخ! وہ رنجور گیا؟

جی کوئی لگتا ہے اُس کے اُٹھ گئے پر باغ میں
گل نے بہتیرا کہا، ہم سے نہ ٹک ٹھہرا گیا

یہ توہّم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے، جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

ہر آن تھی سرگوشی، یا بات نہیں گاہے
اوقات ہے اِک یہ بھی، اِک وہ بھی زمانا تھا

کہتا تھا کسو سے کچھ، تکتا تھا کسو کا مُنہ
کل میرؔ کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دِوانا تھا

کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے، جو وہ آتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا

نہ وہ آوے، نہ جاوے بے قراری — کسو دن میرؔ یوں ہی مر رہوں گا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا، اِس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لے کر چھوڑ دیے — بھولے اُس کے قول و قسم پر، ہائے خیالِ خام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اِتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے خود مختاری کی — چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اَب پوچھتے کیا ہو، اُن نے تو — قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

دل مجھے اُس گلی میں لے جا کر — اَور بھی خاک میں ملا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی — اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ — پھر ملیں گے، اگر خدا لایا

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک — پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا

یاد اُس کی اِتنی خوب نہیں، میرؔ باز آ — نادان! پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

بارہا دیکھا ہے اِس دارِ مکافات میں میرؔ — اینٹ اٹھانے بھی نہ پائے تھے کہ پتھر آیا

دُور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا — وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

سروِ لبِ جُو، لالہ و گُل، نسرین و سمن ہیں، شگوفہ ہے — دیکھو جدھر، اِک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

کُھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُس کی میرؔ — سمندِ ناز پہ اِک اَور تازیانہ ہوا

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا — اِس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

کہا میں نے، گُل کا ہے کتنا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسّم کیا

دل گیا مفت اور دکھ پایا — ہو کے عاشق بہت میں پچھتایا

سرسری تم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

راہِ دُورِ عشق میں روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا (۱)

قافلے میں صبح کے اِک شور ہے — یعنی غافل! ہم چلے، سوتا ہے کیا

(۱) ''کُلّیاتِ میر''، مرتبہ ظِلّ عباس عباسی، علمی مجلس، دِلّی، ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۳۔ مصرعِ اولیٰ اِس طرح مشہور ہے:
ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

لگتا نہیں پتا کہ صحیح کون سی ہے بات
دونوں نے مل کے میرؔ ہمیں تو ڈبو دیا

گیا حُسن خوبانِ بدراہ کا
ہمیشہ رہے نام اللّٰہ کا

پشیماں ہوا دوستی کر کے میں
بہت مجھ کو ارمان تھا چاہ کا

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اُسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بے تاب سا ہوا

کیا کہیں، کچھ کہا نہیں جاتا
اب تو چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہوش جاتا نہیں رہا، لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

دُور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

ٹک میرِؔ جگرسوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار! بھروسا ہے چراغِ سحری کا

کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے
آج سَو سَو طرف گمان گیا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سَو مرتبہ لُوٹا گیا

ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے
اُن کو اِس روزگار میں دیکھا

حسرت اُس کی جگہ تھی خوابیدہ
میرؔ کا کھول کر کفن دیکھا

برسوں تئیں جہان میں کیوں کر رہا ہے خضر
میں چار دن میں جینے سے بیزار ہو گیا

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نم ناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

ایک دو ہوں تو سحرِ چشم کہوں
کارخانہ ہے واں تو جادو کا

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو، مگر قابلِ دیدار نہ تھا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

داغِ فراق و حسرتِ وصل، آرزوے شوق
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور
اِس میں کیا اختیار ہے اپنا

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

اختر شناس کو بھی خلل ہے دماغ کا
پوچھو اگر زمیں کی، کہیں آسماں کی بات

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

وصل و ہجراں، یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں
دیکھ رہتا ہوں دیر مُنہ سب کا

جو اِس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح!
تُو کب تک مرے مُنہ کو دھوتا رہے گا

بس اے میر! مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تُو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو
جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اُٹھائی بات

کہتے تھے اُس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے، لیک
وہ آ گیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
مُنہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

میر سے پوچھا جو میں، عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

نظر میر نے کیسی حسرت سے کی
بہت روئے ہم اُس کی رخصت کے بعد

ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی ہے
نہ شکر و شکایت، نہ حرف و حکایت

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

کہتے ہیں، آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر
ہے پیارے ہنوز دلّی دُور

جی میں آوے، سو کیجیو پیارے
ایک ہوجیو نہ درپئے آزار

میر صاحب! زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

التفاتِ زمانہ پر مت جا
میر دیتا ہے روزگار فریب

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دَم لے کر

احوال میرؔ جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
کچھ زیرِ لب کہا بھی، سو دیر دیر رو کر

دل وہ نگر نہیں ہے کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کر

مبارک تمھیں میرؔ ہو عشق کرنا
بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

جی میں تھا اُس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

بہت کچھ کہا ہے کرو میرؔ بس
کہ اللہ بس اور باقی ہوس

پہنچا نہ اُس کی داد کو مجلس میں کوئی رات
مارا بہت پتنگ نے سر شمع دان پر

میرؔ جی زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق؟

میرؔ بندوں سے کام کب نکلا
مانگنا ہے جو کچھ، خدا سے مانگ

اے بتاں! اِس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

کوئی خواہاں نہیں ہمارا میرؔ
گوئیا جنسِ ناروا ہیں ہم

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اِک عمر میں ہوا معلوم

قبائے لالہ وگل میں جھلک رہی تھی خزاں
بھری بہار میں رویا کیے بہار کو ہم

وجہِ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو، واں کے ہم بھی ہیں

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ
بہت اُس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گل

بے کلی دل ہی کی تماشا ہے
برق میں ایسے اضطراب کہاں

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میرؔ
کیا کہہ گئی نسیمِ سحر گل کے کان میں

میرؔ صاحب تم فرشتہ ہو تو ہو
آدمی ہونا تو مشکل ہے میاں!

خدا ساز تھا آزرِ بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

کتنی باتیں بنا کے لاؤں لیک
یاد رہتی ترے حضور نہیں

سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے
کبھو آپ میں تم نے پایا ہمیں؟

رہا تُو تو اکثر الم ناک میرؔ
ترا طور کچھ خوش نہ آیا ہمیں

کچھ تمھیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں، عیب نہیں، عار نہیں

دل کے اُلجھاو کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح!
تُو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن
وے نہ ہم ہیں، نہ وے زمانے ہیں

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

شکوہ کروں ہوں بخت کا، اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدانخواستہ تم سے تو کچھ گلہ نہیں

چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تُو میرؔ
ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

نہ بھائی! ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میرؔ تجھ سے ہی یہ خواریاں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدّت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

گل نے ہزار رنگِ سخن وا کیا، ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

اُس نازنیں کی باتیں کیا پیاری پیاریاں ہیں
پلکیں ہیں جس کی چھریاں، آنکھیں کٹاریاں ہیں

بے قراری جو کوئی دیکھے ہے، کہتا ہے یہی
کچھ تو ہے میرؔ، کہ اِک دم تجھے آرام نہیں

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

صبحِ چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا
صندل بھری جبیں ہے، ہونٹوں کی لالیاں ہیں

اِن گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں چمن میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

عشق کرنا نہیں آسان، بہت مشکل ہے
چھاتی پتھر کی ہے اُن کی، جو وفا کرتے ہیں

اِن دنوں یاروں کی نظروں سے نہاں رہتے ہو
خوش رہو میرؔ مری جان! جہاں رہتے ہو

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے ہم کو

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار
پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو

برسوں میں کبھو ایدھر، تم ناز سے آتے ہو
پھر برسوں تئیں پیارے، جی سے نہیں جاتے ہو

رہتے ہو تم آنکھوں میں، پھرتے ہو تمھیں دل میں
مدّت سے اگرچہ یاں آتے ہو نہ جاتے ہو

ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا ربط محبت سے اُس آرام طلب کو

کہنے سے میرؔ اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی
میرؔ جی! کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو (۱)

پہلے دیوانے ہوئے پھر میرؔ آخر ہو گئے
ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

بدنام ہو گے، جانے بھی دو امتحان کو
رکّھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک، انتہا ہے یہ

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

یہ جو مہلت، جسے کہے ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

وصل اُس کا خدا نصیب کرے
میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

تھا میرؔ عجب فقیر صابر شاکر
ہم نے اُس سے کبھو شکایت نہ سنی

کیا کروں شرح خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

حالِ بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اِس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا، چلنے ہار ہیں ہم بھی

منعِ گریہ نہ کر تُو اے ناصح!
اِس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

آن میں کچھ ہیں، آن میں کچھ ہیں
تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی، زنجیر نظر آئی

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اِس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

مزاجوں میں یاس آ گئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے، نہ جینے کی شادی

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب توقع نہیں رہائی کی

(۱) ''کلیاتِ میر'' دیوانِ اوّل (جلد اوّل)، مرتبہ کلبِ علی خاں فائق، طبع دوم، جون ۱۹۸۶ء، ص ۳۸۴

کوہ کن کیا پہاڑ توڑے گا
عشق نے زور آزمائی کی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ہوئی سامنے یوں تو ایک ایک کے
ہمیں سے وہ کچھ آنکھ شرما گئی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں، پہ کیا کروں
مُنہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

لطف پر اُس کے، ہم نشیں! مت جا
کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

باہم سلوک تھا تو اُٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میرؔ کوئی دبے، جب بگڑ گئی

حدیثِ زلفِ دراز اُن کے مُنہ کی بات بڑی
کبھو کے دن ہیں بڑے یاں، کبھو کی رات بڑی

وہ دن گئے کہ آٹھ پہر اُن کے ساتھ تھے
اب آ گئے تو دُور سے کچھ غم سنا گئے

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم بادوباراں ہے

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے، جیسے شراب چواتے ہیں
آگے ہو مے خانے کے نکلو، عہدِ بادہ گساراں ہے

کیسے ہیں وے کہ جیتے ہیں صد سال، ہم تو میرؔ
اِس چار دن کی زیست میں بیزار ہو گئے

رخسار اُس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم
آتا ہے جی میں آنکھوں کو اُن میں گڑوئیے

اب جان جسمِ خاکی سے تنگ آ گئی بہت
کب تک اِس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

اخلاصِ دل سے چاہیے سجدہ نماز میں
بے فائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھوئیے

واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ
آؤ مے خانے چلو، تم کس کے کہنے پر گئے

لائے تھے جا کر ابھی تو اُس گلی میں سے پکار
چپکے چپکے میرؔ جی تم اُٹھ کے پھر کیدھر چلے

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اُس کو
جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے

عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے

جب نام ترا لیجیے، تب چشم بھر آوے
اِس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

پاسِ ناموسِ عشق تھا، ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے
کس توقع پہ دل لگائے تھے

میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے　　دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے
جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آہ　　رات گزرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ　　ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے
جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار، مر گئے　　اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے
ہائے اس زخمیٔ شمشیرِ محبت کا جگر　　درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہے
شمعِ اخیرِ شب ہوں، سن سرگذشت میری　　پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے
میرؔ عمدًا بھی کوئی مرتا ہے　　جان ہے تو جہان ہے پیارے
فقیرانہ آئے، صدا کر چلے　　میاں! خوش رہو، ہم دعا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ　　سو تم ہم سے مُنہ بھی چھپا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم　　سو اُس عہد کو بھی وفا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے　　نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ　　جہاں میں تم آئے تھے، کیا کر چلے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز　　وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے　　جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے
کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے　　زمیں سخت ہے، آسماں دُور ہے
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج　　گرا گر یہ شیشہ تو پھر چُور ہے
کہیں جو تسلی ہوا ہو یہ دل　　وہی بے قراری بدستور ہے
بہت سعی کریے تو مر رہیے میرؔ　　بس اپنا تو اِتنا ہی مقدور ہے
مصائب اَور تھے پر دل کا جانا　　عجب اِک سانحہ سا ہو گیا ہے
سرہانے میرؔ کے کوئی نہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے (۱)

(۱) ''کلیاتِ میر'' مرتبہ ظلِ عباس عباسی، علمی مجلس، دلّی، ۱۹۴۸ء، ص ۳۳۰

''نقوش'' میر تقی میر نمبر، شمارہ ۱۲، ادارہ فروغِ اردو، لاہور، ص ۴۰۱ پر پہلا مصرع اسی طرح درج ہے۔ ''طبقات الشعرا'' اور ''گلشنِ بے خار'' میں بھی مصرعِ اولیٰ اسی طرح درج ہے۔ ''سخن شعرا'' میں مصرعِ اولیٰ اس طرح ہے:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو

میرؔ کیا سادے ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطّار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اَور بھی وقت تھے بہانے کے

میرے تغیّرِ حال پر مت جا
اتّفاقات ہیں زمانے کے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدّعا ہوتے

الٰہی! کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

فرصت میں یک نفس کی کیا دردِ دل سنو گے
آئے تو تم ولیکن وقتِ اخیر آئے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

گہ آپ میں نہیں ہو، گہ منتظر کہیں ہو
کچھ میرؔ جی تمھارا اِن روزوں حال کیا ہے

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ہم گرم رَو ہیں راہِ فنا کے شرر صفت
ایسے نہ جائیں گے کہ کوئی کھوج پا سکے

نہ شکوہ شکایت، نہ حرف و حکایت
کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے؟

کس غم میں مجھ کو یارب! یہ مبتلا کیا ہے
دل ساری رات جیسے کوئی مَلا کیا ہے

حرم سے دَیر اُٹھ جانا نہیں عیب
اگر یاں ہے خدا، واں بھی خدا ہے

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں، لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو مَلا کرے ہے

لوگ کہتے ہیں مجھے، یہ شخص عاشق ہے کہیں
عاشقی معلوم، لیکن دل تو بے آرام ہے

شرط سلیقہ ہے ہر اِک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کر کے تم کو
تم سے بھی کوئی پوچھے، تم کیوں ہوئے پیارے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
اُن سے بھی تو پوچھتے، تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

روشن ہے جل کے مرنا پروانے کا تو، لیکن
اے شمع! کچھ تو تُو کہہ تیری بھی تو زباں ہے

چھاتی جلا کرے ہے، سوزِ دروں بلا ہے
اک آگ سی رہے ہے، کیا جانیے کہ کیا ہے

پھرتے ہو میرؔ صاحب سب سے جدے جدے تم
شاید کہیں تمھارا ان روزوں دل لگا ہے

بہار آئی ہے، غنچے گل کے نکلے ہیں گلابی سے
نہالِ سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے

صد رنگ بہاراں میں اب کی جو کھلے ہیں گل
یہ لطف نہ ہو ایسی رنگینی ہوا کی ہے

صبر بھی کریے بلا پر میرؔ صاحب جی کبھو
جب نہ تب رونا ہی کڑھنا، یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

پتھر کی چھاتی چاہیے ہے میرؔ عشق میں
جی جانتا ہے اُس کا، جو کوئی وفا کرے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

اب خاک سی اُڑے ہے مُنہ او پر وگرنہ میرؔ
اِس چشمِ گریہ ناک سے دریا بہا کیے

امیر زادوں سے دلّی کے مل نہ تا مقدور
کہ ہم فقیر ہوئے ہیں اُنھیں کی دولت سے

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میرؔ
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

آتے کبھی جو واں سے تو یاں رہتے تھے اداس
آخر کو میرؔ اُس کی گلی ہی میں جا رہے

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

شیدا، میر فتح علی

نام میر فتح علی، شیدا تخلّص۔ وطن مؤ شمس آباد۔ سودا سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۷۸۰ء میں بقید حیات تھے۔

منتخب اشعار

وے صورتیں الٰہی! کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

آئے تھے کیوں عدم سے، کیا کر چلے جہاں میں
یہ مرگ و زیست دونوں آپس میں ہنستیاں ہیں

راقم، بندرابن

نام بندرابن، راقم تخلّص۔ قوم کے کائستھ تھے۔ اُن کا وطن متھرا تھا، لیکن بعض تذکرہ نگاروں کے خیال میں ان کا وطن شاہ جہاں آباد تھا۔ تلمذ کے بارے میں اختلاف ہے۔ اکثر انھیں سودا کا شاگرد بتاتے ہیں۔ کبھی کبھی میر تقی میر

سے بھی اصلاح لیتے تھے۔

منتخب اشعار

اے باغ باں! نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض — مجھ کو قسم لے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب — آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں
پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب — یارب! عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے

اعلیٰ، سید علی مرزا

نام سید علی مرزا خلف میر ولایت اللہ خاں۔ وطن دہلی۔ شجاع الدّولہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ ان کا یہ شعر مشہور ہے:

توڑ بت زاہد نے کیوں مسجد یہ بت خانہ کیا
تب تو اِک صورت بھی تھی، اب صاف ویرانہ کیا

قائم چاند پوری

نام محمد قیام الدّین، قائم تخلّص۔ ۱۷۲۳ء اور ۱۷۲۶ء کے درمیان چاند پور، ضلع بجنور (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے بھائی محمد منعم دہلی میں سکونت پذیر تھے اس لیے بچپن سے قائم چاند پوری کی آمد و رفت دہلی میں رہی۔ انھیں خواجہ میر دردؔ اور سوداؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ انھیں تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ دبستان دہلی کے یہ اہم شاعر ہیں۔ جوانی میں رنگین مزاج تھے۔ کافی عرصہ روزگار کی تلاش میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرتے رہے۔ اُن کی زندگی کا طویل عرصہ رام پور میں گزرا اور وہیں ۹۴-۱۷۹۳ء میں انتقال ہوا۔ کُلیّات قائم اور اردو شعرا کا ایک تذکرہ موسوم بہ ''مخزن نکات'' ان کی تصانیف ہیں۔ اپنے مشہور شاگرد محمد یار خاں امیر کے مقبرے میں چبوترے کے نیچے دفن ہیں۔

وہ (قائم چاند پوری) میر و سودا اور درد کے بعد اس دَور کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔
(ڈاکٹر جمیل جالبی)

منتخب اشعار

غیر سے ملنا تمھارا سن کے گو ہم چپ رہے — پر سنا ہوگا کہ تم کو اِک جہاں نے کیا کہا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جاے غم ہے شیخ! — کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

یہ سچ کہ جھوٹ ہے دعواے دوستی، لیکن — کبھی ہمیں بھی تو اِک بار آزمانا تھا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ، چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہردم آنے سے میں بھی ہوں نادم — کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

نہ جانے کون سی ساعت چمن سے بچھڑے تھے — کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سُوے گلستاں دیکھا

میں وہ اسیرِ قفس ہوں کہ عمر بھر جس نے — نہ سیرِ باغ کی، نے رُوے آشیاں دیکھا

جلوہ ہر رنگ میں ہے اُس بتِ ہرجائی کا — یہ پریشاں نظری جرم ہے بینائی کا (۱)

قائمؔ قدم سنبھال کے رکھ کُوے عشق میں — یہ راہ بے طرح ہے، مری جان دیکھنا

بے دماغی سے نہ اُس تک دلِ رنجور گیا — مرتبہ عشق کا یاں حُسن سے بھی دُور گیا

قسمت کو دیکھ، ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند — کچھ دُور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

ظالم! تُو مری سادہ دلی پر تو رحم کر — روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا (۲)

قائمؔ آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری — مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

دل گنوانا تھا اِس طرح قائمؔ! — کیا کیا تُو نے ہاے خانہ خراب

اب کی جو یہاں سے جائیں گے ہم — پھر تجھ کو نہ مُنہ دکھائیں گے ہم

مَے کی توبہ کو تو مدّت ہوئی قائمؔ، لیکن — بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

مجھ کو بتاں کی دید سے مت منع کر کہ شیخ! — کیا جانے اس لباس میں کیا دیکھتا ہوں میں

ہوس ہے عشق کی اہلِ ہوا کو ہم تو میاں! — سنے سے نام محبت کا زرد ہوتے ہیں

---

(۱) ''تذکرۂ شعراے اردو'' مؤلّفۂ میر حسن میں پہلا مصرع اِسی طرح ہے مگر ''مخزنِ نکات'' مؤلّفۂ قائمؔ چاند پوری میں یہ مصرع اِس طرح درج ہے:

جلوہ کس جا پہ نہیں اُس بتِ ہرجائی کا

بحوالہ: ''کلّیاتِ قائمؔ'' (جلد اوّل)، مرتبۂ اقتدا حسن، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، ۱۹۴۰ء، ص ۱۷ اور ص ۲۸۲

(۲) بعض نسخوں میں دوسرا مصرع یوں درج ہے:

روٹھا تھا آپھی تجھ سے میں اور آپھی من گیا

کچھ اَور نسخوں میں یہ صورت نظر آتی ہے:

روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپھی من گیا

بحوالہ: ''کلّیاتِ قائمؔ'' (جلد اوّل)، مرتبۂ اقتدا حسن، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، ۱۹۴۰ء، ص ۳_۷۲، ۳۲ اور ۲۸۹

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائمؔ — یہ ہے مے خانہ، ابھی پی کے چلے آتے ہیں

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی — سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

یہ جانتا میں نہیں ہوں کہ دل ہے کیا قائمؔ — پر اک خلش سی رہے ہے مدام سینے میں

میں کہا، 'عہد کیا' کیا تھا رات' — ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

تھا بد و نیکِ جہاں سے میں عدم میں آزاد — آہ، کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھ کو

یارب! گیا کون یاں سے مہماں — لگتا ہے یہ گھر اُداس مجھ کو

میں دِوانہ ہوں سدا کا، مجھے مت قید کرو — جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

دم بدم اِس رنجشِ بے جا کو کیا کہتے ہیں شوخ! — دل دیا تجھ کو تو کچھ میں نے گنہگاری نہ کی

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن، پہ اس طرح — دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

بھٹکا پھروں ہوں یاں جو اکیلا میں ہر طرف — اے ہم رہانِ پیش قدم! تم کدھر گئے؟

دل ڈھونڈنا سینے میں مرے بوالعجبی ہے — اِک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

ہم نشیں ذکرِ یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے

ہم سے ملے نہ آپ تو ہم بھی نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دَیر میں قائمؔ — مجھے کچھ اور ارادہ نہیں، خدا نہ کرے

امیر، محمد یار خاں

نام نواب محمد یار خاں، امیر تخلّص۔ آنولہ (یوپی) کے قریب ٹانڈہ نام کی ایک بستی ہے، وہاں بود و باش تھی۔ مرہٹہ گردی میں یہ اپنے بڑے بھائی فیض اللہ کے پاس رام پور چلے گئے۔ پچاس ہزار روپیہ سالانہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا۔ فنِ موسیقی میں یہ یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے۔ انھیں مصوری کا بھی بہت شوق تھا۔ قائم چاند پوری کے شاگرد تھے۔ قائم کے علاوہ اور بھی کئی شعرا ان کے دربار سے منسلک تھے۔ جنوری ۱۷۷۵ء میں رام پور میں وفات پا گئے۔

منتخب اشعار

بیٹھے بٹھائے کوچۂ قاتل میں لے گیا — یارب! بُرا ہو اِس دلِ خانہ خراب کا

شکست و فتح میاں اتفاق ہے، لیکن　　مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اِس مُنہ سے اللہ کچھ نہ نکلا　　جز نالہ و آہ کچھ نہ نکلا

تھرتھراتا ہے اب تلک خورشید　　سامنے تیرے آ گیا ہوگا

مائل، میر محمدی

نام میر محمدی، مائل تخلّص۔ وطن دہلی۔ مولانا فخر الدّین کے مرید تھے۔ شاہ محمدی بیدار کے ہم عصر تھے۔ تلمیذِ قدرت اللہ قدرت اور قائم چاندپوری۔ دہلی کی تباہی کے وقت مرشد آباد چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

منتخب اشعار

حال کہنے کی نہ دی گریے نے فرصت رات کو　　آج پھر کہیو اُسے مائل وہ کیا افسانہ تھا

کہتا نہ تھا کہ باز آ ہر دم کی اِس ہنسی سے　　آخر گیا نہ ظالم اِک بے گناہ جی سے

بیتاب، سنتو کھ رائے

نام سنتو کھ رائے۔ بیتاب تخلّص۔ وطن شاہ جہان آباد۔ تلمیذِ قائم چاندپوری۔

منتخب اشعار

نہ رہے باغِ جہاں میں کبھی آرام سے ہم　　پھنس گئے قیدِ قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

اپنے مذہب میں ہے اِک شرط طریقِ اخلاص　　کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

خدا کسی کو گرفتار زلف کا نہ کرے　　نصیب میں کسی کافر کے یہ بلا نہ کرے

وفا، لالا نول رائے

نام لالا نول رائے، وفا تخلّص۔ قوم کے کائستھ تھے۔ وطن مراد آباد تھا۔ تلمیذ قائم چاندپوری۔ صدر جنگ، والیٔ اودھ کے بڑے معتمد امیر تھے۔ دریا گنگا کے کنارے بعض پرگنوں کی مال گزاری وصول کرنے پر مامور تھے۔ فرخ آباد کے حاکم بھی رہے۔ شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وفات ۱۷۶۳ء۔

منتخب اشعار

عارض پہ تمھارے یہ پسینا　　ہیرے کا ہے لعل پر نگینا

اپنی غرض کو ہم تو سبھی کچھ کہیں گے، لیک　　ہوتی ہے گالیوں سے تمھاری زباں خراب

حسنِ عمل پہ اپنے نہ بھول اِس قدر کہ شیخ　　واں کے معاملے کی کسی کو خبر نہیں

حالِ دل کیونکے وفاؔ اُس سے کہوں خلوت میں　　جی دھڑکتا ہے کہ کوئی پسِ دیوار نہ ہو

گر مانگتا ہے جی کے تئیں، دیجیے وفاؔ　　کیا چیز ہے کہ دوست سے انکار کیجیے

کلیم، محمد حسین

میر محمد حسین نام، کلیم تخلص ۔ وطن دہلی ۔ میر اور خان آرزو کے قریبی رشتے دار تھے ۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا ۔ عربی کی مشہور کتاب ''فصوص الحکم'' کا اردو میں ترجمہ کیا تھا ۔ عروض و قافیہ کے متعلق بھی ایک رسالہ لکھا تھا ۔ وفات ۱۷۷۴ء اور ۱۷۷۸ء کے درمیان ۔

منتخب اشعار

لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس　　وہ دن گئے کلیمؔ کہ یہ شیشہ سنگ تھا

تری جناب میں آیا ہوں یا الہٰ نہ پوچھ　　یہی کہ بخش دے اور مجھ سے کچھ گناہ نہ پوچھ

غرورِ حسن ممکن نہیں کسی کی داد کو پہنچے　　غرض تم سن چکے احوال، ہم فریاد کو پہنچے

عرق نہیں، ترے رُو سے گلاب ٹپکے ہے　　عجب یہ بات ہے، شعلے سے آب ٹپکے ہے

فراق، مرزا مرتضیٰ قلی خاں

مرزا مرتضیٰ قلی خاں نام، فراق تخلص ۔ بادشاہی توپ خانے کے ملازم تھے ۔ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے ۔ راجا شتاب رائے، حاکم عظیم آباد کی قید میں تقریباً ۱۷۶۸ء میں وفات پائی ۔ ان کا ایک ہی شعر مل سکا ہے ۔

اسیروں کی قسم تجھ کو صبا! سچ کہہ کہ گلشن میں
کوئی اُن ہم نواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہے؟

ندیم، مرزا علی قلی خاں

مرزا علی قلی خاں نام، ندیم تخلص۔ میر و سودا کے معاصر فارسی گو شاعروں میں سے تھے۔ فارسی میں مرثیہ بہت کہتے تھے۔ بعد کو ریختہ بھی کہنے لگے۔ فغاں کے استاد تھے۔ ان کا یہ شعر دیکھیے:

جدائی میں تری ہم، کیا کہیں، کس طرح جلتے ہیں
بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

مخلص، رائے آنند رام

رائے آنند رام دہلوی۔ ولادت ۱۷۰۰ء۔۱۶۹۹ء۔ محمد شاہ کے وزیر اعظم اعتماد الدّولہ محمد امین خاں بہادر نصرت جنگ کے وکیل کے عہدے پر مامور رہے۔ تلمیذ بیدل اور سراج الدّین علی خاں آرزو۔ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔ وفات ۱۷۵۰-۵۱ء ان کا حسبِ ذیل شعر تذکروں میں ملتا ہے۔

آنے کی دھوم کس کے گل زار میں پڑی ہے
ہاتھ ارگجے کا پیالہ نرگس لیے کھڑی ہے

درد، کرم اللہ خاں

کرم اللہ خاں نام، درد تخلص۔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں کے بھانجے تھے۔ مرہٹہ گردی میں شہید ہوئے۔ خوش فکر اور باذاق شاعر تھے۔

اگر وہ بت کسی حیلے سے میرا رام ہو جائے
تو پوجوں اس عقیدت سے کہ کفر اسلام ہو جائے

فغاں، اشرف علی خاں

اشرف علی خاں نام، فغاں تخلص۔ ۲۶-۱۷۲۵ء کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ کے رضاعی بھائی تھے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے، اس وجہ سے احمد شاہ نے ان کو "ظریف الملک کوکہ خان بہادر" کا خطاب دیا تھا۔ فارسی میں قزلباش خاں امید اور اردو میں علی قلی خاں ندیم سے مشورۂ سخن کرتے

تھے۔تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ احمد شاہ ابدالی کے دہلی پر حملے کے بعد فغاں مرشد آباد چلے گئے جہاں ان کے چچا ایرج خاں برسرِ اقتدار تھے۔ مرشد آباد سے نواب شجاع الدّولہ کے پاس فیض آباد آئے۔ کوئی ناخوشگوار واقعے کے بعد پٹنہ چلے گئے جہاں راجا شتاب رائے نے ان کی بڑی قدر کی۔ وہیں ۷۳-۱۷۷۲ء میں انتقال ہوا۔ فغاں کا کلام ''دیوانِ فغاں'' کے نام شائع ہو چکا ہے۔

کلام فغاں کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کے پاس سودا کی طرح قطعہ بند غزلیں بہت ہیں۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں ناہمواری نہیں بلکہ، درد کی طرح معیار کی یکسانیت ملتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ شاعری میں لفظوں کے سلیقے، احتیاط اور شائستگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ فغاں کی زبان اپنے معاصر شعرا سے زیادہ صاف ہے۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی)

منتخب اشعار

آتی ہے اب بہار، یہ سن لیجیو فغاںؔ — زنجیر کو تڑا کے دِوانہ نکل گیا

مت قصد کر صبا تو دلِ داغ دار کا — ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا

اُس کے وصال و ہجر میں یوں ہی گزر گئی — دیکھا تو ہنس دیا، جو نہ دیکھا تو رو دیا

کیا پوچھتے ہو حال فغاںؔ کا، سنا نہیں — خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

کیا تُو شبِ فراق میں جیتا رہا فغاںؔ — یاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار کا

دل بستگی قفس میں یہاں تک ہوئی مجھے — گویا مرا چمن میں کہیں آشیاں نہ تھا

جدائی میں اگر آنکھیں نہ روتیں — تو ہرگز رازِ دل افشا نہ ہوتا

خط دیجیو چھپا کے، ملیں وہ اگر کہیں — لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

ایذا فغاںؔ کے حق میں یہاں تک روا نہیں — ظالم! یہ کیا ستم ہے، خدا سے بھی ڈر کہیں

آخر اِس منزلِ ہستی سے سفر کرنا ہے — اے مسافر! تجھے چلنے کی خبر ہے کہ نہیں

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی — اے عندلیب! تُو نہ قفس بیچ مر گئی

شکوہ تُو کیوں کرے ہے، مرے اشکِ سرخ کا — تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

مجھ سے جو پوچھیے تو، بہ ہر حال، شکر ہے — یوں بھی گزر گئی مری ووں بھی گزر گئی

آخر فغاںؔ وہی ہے، اُسے کیوں بھلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک، وہ الفت کدھر گئی

کٹ گئی ساری عمر غفلت میں
کچھ تری بندگی ادا نہ ہوئی

مجھ دلِ ناشاد کو ہر وقت غم سے کام ہے
کیا خوشی، یارو، زمانے میں اِسی کا نام ہے؟

پھرا نہ راہِ عدم سے کوئی کہ ہم پوچھیں
مسافرو، کہو منزل پہ کیا گزرتی ہے

جو چہچہے چمن میں مچاتے تھے روز و شب
وہ مرغ تو قفس میں گرفتار ہو چکے

کسے تُو ڈھونڈتا پھرتا ہے اے فغاںؔ تنہا
کہ اِس سرا کے مسافر تو گھر گئے اپنے

پھر لیے جیو دامن میں فغاںؔ لختِ جگر کو
ہم خانہ بدوشوں کا سر انجام یہی ہے

تیرے ہی دل سے پوچھیے اِس غم کو ہاں فغاںؔ
الفت بری بلا ہے، کسی کو خدا نہ دے [1]

یہ تھا خیال خواب میں دیکھیں گے روزِ وصل
آنکھیں جو کھل گئیں، وہی راتیں تھیں کالیاں

بیاں، خواجہ احسن الدّین خاں

نام خواجہ احسن الدّین خاں، بیاںؔ تخلّص۔ تقریباً ۱۷۲۷ء میں اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ مرزا مظہر جانِ جاں کے شاگرد تھے۔ مولانا فخر الدّین دہلوی کے مرید تھے۔ دوستوں سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو ایک بار ان سے ملتا ہمیشہ اُن سے ملنے کا متمنی رہتا۔ آخر عمر میں حیدرآباد (دکن) گئے اور نواب آصف جاہ ثانی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ جولائی/اگست ۱۷۹۸ء میں انتقال کر گئے اور حیدرآباد (دکن) میں دفن ہوئے۔ ''دیوانِ بیاں'' مرتبہ ارجمند آرا، بھارت سے شائع ہو گیا ہے۔

منتخب اشعار

یہ لوگ منع جو کرتے ہیں عشق سے مجھ کو
انھوں نے یار کو دیکھا ہے یا نہیں دیکھا؟

---

(۱) تیرے ہی دل سے پوچھیے اِس غم کو یاں فغاںؔ

''دیوانِ فغاں'' مرتبہ سیّد صباح الدّین عبدالرحمٰن، انجمن ترقّیِ اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۳۸

عاشق کے دل سے پوچھیے اِس غم کو اے فغاں

''مخزنِ نکات'' شیخ محمد قیام الدّین قائم، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقّیِ اردو، اورنگ آباد (دکن)، ۱۹۲۹ء، ص ۴۲

ہر چند تیرے عشق میں رسوا ہوا بیاںؔ — لیکن تجھے تو شہرۂ آفاق کر دیا

مصلحت ترکِ عشق ہے ناصح — لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

ہمارا ضعفِ بصارت ہے مانعِ دیدار — وگرنہ سامنے آنکھوں کے یار ہے موجود

ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی کہ مثلِ خار — پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

ہماری بھی کہانی کل بیاںؔ یوں ہی بنا دیں گے — کہ جیسے آج ہم لوگوں کے افسانے بناتے ہیں

وقت آنے کا اپنے تُو مت پوچھ — مجھ کو کس آن انتظار نہیں

کچھ بے ادبی کی ہے بیاںؔ تُو نے بھی اُس سے — ناحق کوئی دیتا نہیں دشنام کسی کو

مت آئیو اے وعدہ فراموش! تُو اب بھی — جس طرح کٹا روز، گزر جائے گی شب بھی

جادو تھی، کہ سحر تھی، بلا تھی — ظالم! وہ تری نگاہ کیا تھی

جو ہم بن تمھاری گزرتی ہے خوش — ہماری بھی تم بن گزر جائے گی

جاتا ہے یار کچھ تو بیاںؔ مُنہ سے بول لے — اے بے نصیب! مانعِ گفتار کون ہے

صلح اور جنگ، تجھ کو سب آساں — مجھ کو ہر طرح آہ مشکل ہے

شبِ فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے — یہی ہے صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہے

رسوا ابھی سے کرتی ہے اے چشمِ تر مجھے — آنا ہے اُس کی بزم میں بارِ دگر مجھے

میں سست گام، قافلۂ عمر تیز رَو — تنہا نہ چھوڑ جائیں کہیں ہم سفر مجھے

آیا ہوں اُس گلی سے ابھی، دم نہیں لیا — پھر لے چلا ہے یہ دلِ وحشی اُدھر مجھے

شوخ، گنّا بیگم

گنّا بیگم۔ بیگم نواب عماد الملک غازی الدّین خاں نظام۔ تلمیذ قمر الدّین منت۔ وفات ۲۵ر مارچ ۱۷۷۳ء۔ مدفن نور پور (آگرہ سے ۶۳ر میل دُور)۔

منتخب اشعار

ابر چھایا ہے، مینہ برستا ہے — جلد آ جا کہ جی ترستا ہے

شمع کی طرح کون رو جانے — جس کے جی کو لگی ہو، سو جانے

بیدار، شاہ محمدی

نام شیخ عماد الدّین، تخلّص بیدار۔ گھر میں انھیں ’محمدی‘ کہا جاتا تھا، اس لیے وہ شاہ محمدی مشہور ہوئے۔ تقریباً ۲۸-۱۷۲۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں مرتضیٰ علی فراق اور اردو میں خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے تھے۔ وہ شیخ فاروقی تھے اور حضرت فرید الدّین گنج شکر کی اولاد سے تھے۔ اُن کا اصل وطن بدایوں تھا اور وہ مولانا فخر الدّین کے مرید تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بیان کے مطابق اپنے مرشد کے ارشاد پر بیدار نے دہلی سے اکبر آباد جا کر شیخ سلیم چشتی کے سجادۂ ارشاد کو زینت بخشی۔ وہیں ۴؍جولائی ۱۷۹۶ء کو وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ ہر سال ۲۶-۲۷؍ذی الحجہ کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ دو دیوان یادگار چھوڑے۔

اس دَور کے ایک اور قابلِ ذکر شاعر میر محمدی بیدار ہیں، مصحفی نے انھیں (مشاہیر شعرائے ریختہ گو) لکھا ہے۔ ان کے کلام میں وہ پاکیزگی اور رچاوٹ ہے جو میر، سودا، درد اور قائم کو چھوڑ کر اس دَور کے دوسرے شعرا کے ہاں کم کم نظر آتی ہے۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی)

منتخب اشعار

کس کس کا دل نہ شاد کیا تُو نے اے فلک! — اِک میں ہی غم زدہ ہوں کہ ناشاد رہ گیا

بیدؔار راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی — صحرا میں قیس، کوہ میں فرہاد رہ گیا

چھوڑ کر کوے بتاں جاتا ہے تُو کعبے کو — جلد پھریو تجھے بیدؔار خدا کو سونپا

عاشق نہ اگر وفا کرے گا — پھر اَور کہو تو، کیا کرے گا

واہ وا! اے دلِ بر کج فہم! یوں ہی چاہیے — ہم سے ہونا آشنا، غیروں سے ہونا آشنا

آنکھوں میں چھا رہا ہے ازبس کہ نور تیرا — ہر گل میں دیکھتا ہوں رنگِ ظہور تیرا

عجز و نیاز میرا حد سے زیادہ گزرا — ویسا ہی اب تلک ہے ناز و غرور تیرا

بیدؔار وہ تو ہر دم سَو سَو کرے ہے جلوے — اِس پر بھی گر نہ دیکھے تو ہے قصور تیرا

ہم خاک بھی ہو گئے، ولیکن — جی سے نہ ترے غبار نکلا

دامن کو ترے نہ پہنچے اب تک — ہر چند غبار ہو گئے ہم

نَے پر پرواز ہے بیدؔار، نے فصلِ بہار — کس توقع پر قفس سے ہوویں اب آزاد ہم

کیا ترے گھر میں رات تھا بیدؔار؟ — اُس گل اندام کی سی بو ہے یہاں

صورت اُس کی سما گئی دل میں
آہ کیا آن بھا گئی دل میں

محشرِ فتنہ ہے اُس شوخ کی رفتار کے ساتھ
جی چلا جائے ہے پازیب کی جھنکار کے ساتھ

اُس کے مذکور کے سوا بیدارؔ
اَور کچھ بات خوش نہیں آتی

بیدارؔ چھپائے سے چھپتے ہیں کہیں تیرے
چہرے سے نمایاں ہیں آثار محبت کے

تُو جو بیدارؔ یوں پھرے ہے خراب
پاسِ ناموس و نام بھی کچھ ہے؟

نَے میکدے سے کام نہ مطلب حرم سے تھا
محوِ خیالِ یار رہے ہم جہاں رہے

اب تک مرے احوال سے واں بے خبری ہے
اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

کس باغ سے آتی ہے بتا مجھ کو کہ یہ آج
کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیمِ سحری ہے

شتاب آ کہ نہیں تابِ انتظار مجھے
ترا خیال ستاتا ہے بار بار مجھے

یقیںؔ، انعام اللّٰہ خاں

انعام اللّٰہ خاں نام، یقیںؔ تخلص۔ ۲۸-۱۷۲۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ نہایت اعلا خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مرزا مظہر جانِ جاں سے تلمذ حاصل تھا۔ اس دَور کے اکثر شعرا کی طرح یقین کو بھی افیون سے شوق تھا۔ ۵۶-۱۷۵۵ء میں کسی خاندانی غلط فہمی یا بدنامی کے باعث اپنے والد کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ مولانا عبدالحی مؤلف ''تذکرہ گلِ رعنا'' کا خیال ہے کہ اگر جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔ مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، کے تعاون سے ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔

منتخب اشعار

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک
دیکھا تو اُس زمیں پہ چمن کا نشاں نہ تھا

یہ کوہِ طور سرمہ ہو گیا سارا ہی، کیا کیجے
کوئی پتھر بھی بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا

سریرِ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِّ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

سچ کہو اے بلبلو! کس باغ سے آتی ہو تم
ہے ہمارے بھی تمھیں کچھ آشیانے کی خبر؟

بہار آخر ہوئی ہے، اب تو سینے دے گریباں کو
یقیںؔ کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن، بس کر

جی میں آتا ہے ترے قد کو دکھا دیجیے اسے
باغ میں اِتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس

کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی، جب چھوٹے
ہم ہوئے ایسے بُرے وقت میں آزاد کہ بس

کرتا ہے کوئی یارو! اس وقت میں تدبیریں — مرتا ہے یہ دِوانہ، اب کھول دو زنجیریں

کعبے بھی ہم گئے، نہ گیا اِن بتاں کا عشق — اِس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

روداد محبت کی مت پوچھ یقیںؔ مجھ سے — کچھ خوب نہیں سننا! افسوس ہے یہ افسانہ

نظر آتا نہیں ثابت گریباں ایک غنچے کا — چمن پر یہ ستم کرتا ہے اے بادِ صبا کوئی

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتوں سے پھروں، خدا نہ کرے

یقیںؔ جاتا رہا گر بلبلوں کے ساتھ، جانے دے — کوئی اِس بے مروّت دل کو اپنے پاس کیا رکھے

درختوں سے نہ دے تشبیہ اُس قد کو یقیںؔ ہرگز — وہ اٹکھیلی سے چلنے کی طرح شمشاد کیا جانے

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے — جی ہی لے کے چھوڑے گی آخر یہ بیماری مجھے

دل چھوڑ گیا ہم کو، دل بر سے توقّع کیا — اپنے نے کیا یہ کچھ، بیگانے کو کیا کہیے

چراغِ آخرِ شب! اِس قدر اُداس نہ ہو — کہ تیرے بعد اندھیرا نہیں، اُجالا ہے

مجھے زنجیر کر رکھا ہے اِن شہری غزالوں نے — نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گزرا

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دَیر کے آگے — خدا جانے تری صورت سے بت خانے پہ کیا گزرا

ہدایت، ہدایت اللہ خاں

نام ہدایت اللہ خاں، ہدایت تخلّص۔ تقریباً ۱۷۲۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد طب میں دستگاہ پیدا کی۔ خواجہ میر درد کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور شعر و سخن کی مشق بھی انھی سے کی۔ میر قدرت اللہ قاسم اُن کے شاگرد تھے۔ طبابت ان کا پیشہ تھا۔ ہدایت صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ دیوان کے علاوہ علم تصوف میں ایک رسالہ ''چراغِ ہدایت'' کے نام سے لکھا تھا۔ بنارس کی تعریف میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ ہدایت کا دیوان ناپید ہے۔ مختلف تذکروں میں ان کے اشعار درج ہیں۔ ۵-۱۸۰۴ء میں دہلی میں انتقال کر گئے۔

ہدایت کے کلام میں وہ ساری عام خصوصیات ملتی ہیں جو اس دَور کے دوسرے قابلِ ذکر شعرا کے ہاں نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں اخلاق تصوف بھی ہے اور حسن و عشق کا اظہار بھی۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی)

منتخب اشعار

کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک — پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

نہ رحم اُس کے ہے جی میں، نہ دل میں اپنے صبر
ہماری گزرے گی کیونکر، الٰہی کیا ہوگا؟

بھلا بتاؤ مری جان کچھ ہدایتؔ نے
تمھارے جَور سے شکوہ کبھی کیا ہوگا

مگر یہی نہ کہ بے اختیار ہو کے کبھو
کچھ اَور بس نہ چلا ہوگا، رو دیا ہوگا

آیا ہوں تنگ کش مکشِ دامِ زلف میں
یارو! میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا

بوسہ طلب کیا تھا فقط، اَور کچھ نہیں
میں اِتنی بات کہہ کے گنہگار ہو گیا

کچھ اِن دنوں ہے حال ہدایتؔ ترا تباہ
کیوں میری جان، کیا تجھے آزار ہوگیا؟

یہ تیرِ عشق دل کے تو اب پار ہو چکا
ہونا جو کچھ کہ تھا، سو مرے یار! ہو چکا

تُو نے گر قتل کیا ہم کو، صنم! خوب کیا
ہاں میاں! سچ ہے کہ ایسے ہی گنہگار تھے ہم

تم نہ فریاد کسی کی، نہ فغاں سنتے ہو
اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو، جہاں سنتے ہو

کیا کہوں میں کہ تیرے ہجر میں کیوں کر گزری
وہی جانے ہے مری جان کہ جس پر گزری

دن جو گزرا تو مجھے روزِ قیامت سے دراز
رات گزری تو شبِ ہجر سے بدتر گزری

انجامِ کارِ دل کا ہدایتؔ میں کیا کہوں
آنسو کی بوند ساتھ لہو کے ٹپک گئی

بقاؔ، محمد بقاء اللّٰہ

نام محمد بقاء اللّٰہ، بقاؔ تخلّص۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ وطن اکبر آباد تھا۔ نوجوانی میں لکھنؤ میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ فارسی میں غمگین تخلّص کرتے تھے اور مرزا فاخر مکین سے اصلاح لیتے تھے۔ جب ریختہ کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو شاہ حاتم کے ایما پر بقاؔ تخلّص اختیار کیا۔ تلمیذ شاہ حاتم اور خواجہ میر درد۔ میر اور سودا کی ہجویں کہیں۔ بقا کی زندگی بہت تنگ دستی میں گزری۔ آخر عمر میں دیوانگی کی سی کیفیت ہوگئی تھی۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو ۹۲-۱۷۹۱ء میں مقامِ مقدسہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے، مگر راستے میں فوت ہو گئے۔

منتخب اشعار

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ
اَور بستی نہیں، یہ دلّی ہے

یار کو پہنچی خبر نالۂ تنہائی کی
مدّعی کون کھڑا تھا پسِ دیوار لگا

ترے بیمار کو کیا ہووے شفا جس کے طبیب
نہ تو کچھ درد کو سمجھیں، نہ دوا ہی جانیں

میں تو آیا تھا بقاؔ باغ میں سن جوشِ بہار
پر یہ ہنگامِ خزاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

یہ رُخِ یار نہیں زلفِ پریشاں کے تلے — ہے نہاں صبحِ وطن شامِ غریباں کے تلے

پنہاں ہی بھلا ہے خونِ عاشق — جانے دو، اب اِس پہ خاک ڈالو

کچھ تعین نہیں اِس راہ میں جوں ریگِ رواں — جس جگہ بیٹھ گئے، اپنی وہی منزل ہے

تُو نے اس طرح سے اے چرخ! گرایا ہم کو — کہ موئے پر بھی کسی نے نہ اُٹھایا ہم کو

عشق میں بو ہے کبریائی کی — عاشقی جس نے کی، خدائی کی

مجنوں عظیم آبادی

مجنوں عظیم آبادی۔ عظیم آباد ان کا وطن تھا۔ تلمیذ میر تقی میر۔ میر حسن ان کو میر ضیا کا شاگرد بتاتے ہیں۔

منتخب اشعار

خط تو بھیجا ہے پر اب خوف یہی ہے دل میں — میں نے کیا اُس کو لکھا، اور وہ کیا سمجھے گا

دن میں سَو سَو بار اُس کے روبرو جانا مجھے — اِس میں سودائی کہے یا کوئی دیوانہ مجھے

حسرتؔ عظیم آبادی

نام میر محمد حیات، حسرتؔ تخلص۔ خطاب ہیبت قلی خاں۔ وطن عظیم آباد۔ ولادت ۲۸-۱۷۲۷ء۔ تلمیذ محمد باقر حزیں جوان کے بہنوئی تھے۔ حسرتؔ نے نوجوانی میں کہیں ملازمت نہیں کی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ نامساعد حالات کی وجہ سے جب انھیں فکر معاش لاحق ہوئی تو پورنیہ میں نواب شوکت جنگ کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ نواب شوکت کی شکست اور قتل کے بعد حسرتؔ نواب سراج الدّولہ کے ہاں ملازم ہوگئے۔ اُن کے دربار میں ممتاز عہدہ اور خطاب پایا۔ بعد ازاں یہ عہدہ امرا کی سازشوں کی نذر ہوگیا۔ کچھ عرصہ نواب مبارک الدّولہ، صوبہ بنگال کے ہاں ملازم رہے۔ ان کی عمر کا آخری حصّہ مرشد آباد میں بسر ہوا۔ وفات ۹۶-۱۷۹۵ء، مرشد آباد۔ اردو دیوان کے علاوہ ایک قصہ ''طوطی نامہ'' ان کی تصنیف ہے۔

منتخب اشعار

زخمِ دل پر مرے ہنس ہنس کے چھڑکتے ہو نمک — جو مزہ عشق کا حاصل نہ ہوا تھا، سو ہوا

کس سے اُمید اپنی خبر لینے کی رکھوں تُو ہی جو حالِ دل سے مرے بے خبر رہا
گم کردہ راہِ دشت میں بھٹکوں ہوں میں پڑا میرا جو خضرِ راہ تھا، یارب! کدھر رہا
جوں شمع صبح تک تھا میں سوز و گداز میں اے خانماں خراب! تُو شب کس کے گھر رہا
مر گیا میں اُس نے جب مجھ سے اکیلے یوں کہا آپ تو رسوا ہوا ہے تُو مجھے رسوا نہ کر
یک بہ یک یاد تمھاری جو مجھے آتی ہے جی ہی جانے ہے جو کچھ دل پہ گزر جاتی ہے
مری بات سنتا ہے اِس طور سے کہ کہتا ہوں گویا کسی اَور سے

آفتاب، شاہ عالم ثانی

ابوالمظفر عالی گوہر نام، آفتاب تخلص، شاہ عالم لقب۔ ۱۴؍جون ۱۷۲۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ عالمگیر ثانی کے فرزند تھے۔ بمقام کھتولی نواح عظیم آباد ۲۴؍دسمبر ۱۷۹۹ء کو تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ غلام قادر روہیلہ بادشاہ سے دلی عناد رکھتا تھا۔ ۸۸-۱۷۸۷ء میں ایک دن موقع پا کر دہلی کے دیوانِ خاص میں بادشاہ کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔ اس واقعہ کے بعد شاہ عالم نے بڑی بے لطفی سے زندگی بسر کی۔ وہ برائے نام بادشاہ تھے، حقیقت میں مرہٹوں کا راج تھا۔ ۱۹؍نومبر ۱۸۰۶ء کو دہلی میں وفات پا گئے۔ قطب الدّین بختیار کاکی کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ ایک مثنوی کے علاوہ ایک دیوان اردو اور ایک دیوان فارسی کا ان کی یادگار ہے۔

منتخب اشعار

صبح اُٹھ جام سے گزرتی ہے شب دلارام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے اب تو آرام سے گزرتی ہے

محسن دہلوی

نام محمد محسن، تخلص محسن۔ تقریباً ۱۷۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ میر کے سوتیلے بھائی تھے۔ میر تقی میر ہی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت سراج الدّین علی خاں آرزو نے کی۔ معاشی پریشانیوں کی وجہ سے محسن مشق سخن جاری نہ رکھ سکے۔ وہ نواب سالار جنگ کے سواروں میں بھرتی ہو کر میدان شاعری سے دست بردار ہو گئے۔ ان کا انتقال ۱۸۰۶ء کے گرد و پیش ہوا۔

منتخب اشعار

بت خانے کی شکست و درستی کعبہ ہائے — یہ سب کیا، پہ شیخ نے دل میں نہ گھر کیا
کیا جانیے وہ شوخ کدھر ہے، کدھر نہیں — ہم کو تو تن بدن کی بھی اپنی خبر نہیں
محسؔن تمام عمر مجھے روتے ہی کٹی — اِس غم کدے میں آہ کہیں بھی سُرور ہے

حسرؔت، جعفر علی

نام مرزا جعفر علی، حسرؔت تخلص۔ ولادت تقریباً ۳۵-۱۷۳۴ء، دہلی۔ شروع میں اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر عطاری کا پیشہ اختیار کیا۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اردو میں رائے سرپ سکھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، مگر غزل گوئی ان کا اصل میدان ہے۔ جب شاہ عالم ثانی تخت پر بیٹھے تو حسرت ان کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوگئے۔ غلام قادر روہیلہ نے جب بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور دہلی میں افراتفری مچی تو حسرؔت شجاع الدّولہ کے عہد حکومت میں فیض آباد منتقل ہوگئے۔ شجاع الدّولہ کے بعد آصف الدّولہ نواب ہوئے اور ان کے عہد میں دار السلطنت لکھنؤ قرار پایا۔ حسرؔت نے بھی مستقل طور پر لکھنؤ سکونت اختیار کرلی۔ حسرؔت کے زندگی کے آخری ایام لکھنؤ میں گزرے۔ آخری عمر میں گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ جرأت اور خواجہ حسن ان کے مشہور شاگرد تھے۔ ۹۲-۱۷۹۱ء میں لکھنؤ میں وفات پاگئے۔ تصانیف میں ایک کلّیات جس میں مثنوی، واسوخت، مسدّس، قصیدے رباعیاں اور دو دیوان غزلوں کے ہیں اور دوسری مثنوی ''طوطی نامہ'' ہے۔ وہ نہ صرف فارسی بل کہ عربی پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ بقولِ نیاز فتح پوری:

> حسرت کی کھُل کھیلنے والی شاعری میں بھی ہم کو خالص جذباتی رنگ کے اشعار بڑے پاکیزہ مل جاتے ہیں۔

منتخب اشعار

بھولتا ہی نہیں وہ، دل سے اُسے — ہم نے سَو سَو طرح بھُلا دیکھا
اے دل! اگر تڑپنا تیرا یہی رہے گا — کاہے کو تُو جیے گا، کاہے کو جی رہے گا
رہنے دے مَے کو ساقی، ہم تو چلے یہاں سے — قسمت میں جس کی ہوگا، سو جام پی رہے گا
خدا حافظ ہے، کیوں محفل میں اُس کا نام آیا تھا — تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

بہاریں ہم کو بھولیں، یاد ہے اِتنا کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اِک ہنگام آیا تھا

تیرا تو تب اعتبار کیجے
جب ہووے کچھ اعتبار اپنا

دل میں سَو بات تھی پر اُس نے جو پوچھا احوال
مجھ سے کچھ درد کا اظہار ہوا، کچھ نہ ہوا

روتے ہی اُس کو گزرے ہے ہجر میں تیرے رات دن
حال میں کیا بیاں کروں حسرتؔ بے قرار کا

کسی دشمن کو بھی نصیب نہ ہو
جیسے تجھ بن کٹی ہماری رات

عشق ہے داستان سے باہر
ہے یہ قصّہ بیان سے باہر

گر ہے یہی بہار کی شورش تو ناصحا!
مجھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط

آخر ترے غم میں مر گئے ہم
بھرنا تھا جو دکھ، سو بھر گئے ہم

عقبیٰ کی بھی کچھ خبر نہیں ہے
دنیا سے تو بے خبر گئے ہم

غنیمت جانو جو دم ہیں یہاں ہم
کوئی دم میں کہاں پھر تم، کہاں ہم

کس کس طرح سے ہم نے کیا اپنا جی نثار
لیکن گئیں نہ دل سے ترے بدگمانیاں

نہ جانے کیا تجھے الفت تھی گل سے اے بلبل!
کہ اپنے جی سے گئی پر چمن سے تُو نہ گئی

تمھیں غیروں سے کب فرصت، ہم اپنے غم سے کم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی نہ ہم خالی

ہوئے ہیں اِس قدر آفت زدے، ہم تو کہ اب ہم میں
نہ کیفیّت ہے ہنسنے کی، نہ کچھ لذّت ہے رونے کی

پٹکنے دے مجھے سر اُس کے آستانے سے
خبر کروں ہوں میں اپنی اِسی بہانے سے

مثالِ نقشِ قدم یاں سے اُٹھ نہیں سکتے
تری گلی میں نہ جانا بھلا تھا جانے سے

کسی کا حال کوئی پوچھتا نہیں ہرگز
وفا کا رسم اُٹھا حسرتؔ اِس زمانے سے

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بے داد کرو گے
لو، ہم تمھیں دل دیتے ہیں، کیا یاد کرو گے

تاراج کیا صبر و دل و جان، پھر آ گے
کیا خاک ہے مجھ میں، جسے برباد کرو گے

یہ بھی اِک ستم تھا کہ خواب میں مجھے اپنی شکل دکھا گئے
کبھی نیند برسوں میں آئی تھی، سو اِسی طرح سے جگا گئے

سراغ پوچھوں میں کیا اشک و آہ کا دل سے
کہ اِس دیار سے کتنے ہی قافلے نکلے

جوشش عظیم آبادی

نام محمد روشن، جوشش تخلص۔ ۱۷۳۷ء کے لگ بھگ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ محمد عابد دلؔ ان کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے والد جسونت رائے ناگر گجراتی برہمن علی وردی خاں کے ممتاز فوجی سردار تھے۔ بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دو بیویاں تھیں، ایک ہندو اور دوسری مسلمان۔ مسلمان بیوی کے بطن سے محمد عابد اور محمد روشن پیدا ہوئے۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنی والدہ کے زیرِ سایہ پرورش پائی اور اسی لیے بچپن ہی سے اسلام کی طرف مائل تھے اور بڑے ہو کر بھی اسی پر قائم رہے۔ جوشش شاعری میں کس کے شاگرد تھے، کچھ معلوم نہیں۔ جوشش سے دو تصانیف یادگار ہیں۔ ایک ان کا دیوان جسے سب سے پہلے قاضی عبدالودود نے مرتب کیا۔ دوسری تصنیف ''رسالہ قافیہ'' ہے۔ جوشش تیراندازی، دست کاری کا سلیقہ رکھتے تھے اور ستارنوازی کا بھی شوق تھا۔ تذکرہ نگاروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ۱۸۰۱ء کے بعد انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

حیراں ہوں، کس طرح ہے وہ انساں میں جلوہ گر
جلوے سے اُس کے طور تو جل خاک ہو گیا

ہوتی نہیں کسی کی دُعا مجھ کو سود مند
یارب! مجھے یہ کون سا آزار ہو گیا

اِس ادا کا تری ہوں دیوانہ
دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا

گل زارِ محبت میں نہ پھولے نہ پھلے ہم
مانندِ چنار آگ میں اپنی ہی جلے ہم

نہ پھولتے ہیں شگوفے، نہ غنچے کھلتے ہیں
چمن میں شور پڑا کس کے مسکرانے کا

آئینۂ خیال میں ہے یار جلوہ گر
طالب پری کا ہوں نہ طلب گار حور کا

بے کسی تُو بھی ٹل گئی آخر
اُس کے کوچے میں چھوڑ کر مجھ کو

حسن اور عشق کا مذکور نہ ہووے جب تک
مجھ کو بھاتا نہیں سننا کسی افسانے کا

آہ، مت پوچھ سرگذشت مری
سننا مشکل ہے اِس کہانی کا

خیالِ یار میں رہتا ہوں محو اے جوششؔ
نہ فکرِ وصل ہے مجھ کو، نہ غم جدائی کا

بے وفا تُو ہی ہمیں بھول گیا ہے، ورنہ
ہم تری یاد میں رہتے ہیں، جہاں رہتے ہیں

اثر، سیّد محمد

سیّد محمد نام، اثر تخلص۔ ۳۶۔۱۷۳۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی، شاگرد، مرید اور جانشین تھے۔ والد کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب حضرت بہاء الدّین نقشبند اور والدہ کی طرف سے سیّد عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ موسیقی اور ریاضی سے انھیں لگاؤ تھا۔ تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی بزرگی اور تقویٰ کی تعریف کی ہے۔ زیادہ وقت عبادت اور ریاضت میں گزارتے تھے۔ اردو کا ایک مختصر دیوان اور مثنوی ''خواب و خیال'' ان کی تصانیف ہیں۔ اپنے بڑے بھائی خواجہ میر درد کی طرح انھوں نے بھی دہلی کی بدحالی کے باوجود ترکِ وطن نہیں کیا۔ اگست ۱۷۹۴ء میں دہلی میں وفات پاگئے۔

منتخب اشعار

پہلے سَو بار اِدھر اُدھر دیکھا — جب تجھے ڈر کے اِک نظر دیکھا

کیا بتاویں کہ اس چمن کے بیچ — کہیں اپنا بھی آشیانا تھا

دل نے مجھ سے اثر کِیا سو کِیا — کیا کہوں، مہربان ہے اپنا

جس کی خاطر سبھی ہوئے دشمن — نہ ہوا دوست وہ ہی یا قسمت!

بس ہو یارب! یہ امتحان کہیں — یا نکل جائے اب یہ جان کہیں

وائے غفلت کہ ایک ہی دم میں — میں کہیں اور کاروان کہیں

کیا کہوں اپنی میں پریشانی — دل کہیں، میں کہیں ہوں، دھیان کہیں

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے — اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

تُو ہی بہتر ہے ہم سے آئینہ! — ہم تو اِتنے بھی رُوشناس نہیں

بے وفا کچھ نہیں تری تقصیر — مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

نہ لگا، لے گئے، جہاں دل کو — آہ! لے جایئے کہاں دل کو

وہی میں ہوں اثر وہی دل ہے — اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

دن کٹا جس طرح کٹا، لیکن — رات کٹتی نظر نہیں آتی

اثر کیجیے کیا، کدھر جایئے — مگر آپ ہی سے گزر جایئے

کبھو دوستی ہے، کبھو دشمنی — تری کون سی بات پر جایئے

فرصتِ زندگی بہت کم ہے — مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

دل جو یوں بے قرار اپنا ہے — اِس میں کیا اختیار اپنا ہے

کب کب گلی میں تیرے، ہم بے قرار آئے — سَو بار جی نے چاہا، تب ایک بار آئے

حال اپنا کسو سے کیا کہیے — ایک دل تھا، سو وہ بھی کھو بیٹھے

کون سنتا ہے یاں کسو کی بات — بس آخر قصہ مختصر کیجیے

نظیر اکبر آبادی

نام سیّد ولی محمد، نظیر تخلّص۔ ۱۷۳۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ فارسی علوم میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی میں بھی اچھی خاصی استعداد تھی۔ ہندی، پنجابی اور سنسکرت سے سدھ بدھ رکھتے تھے۔ نظیر نے مشورہ سخن کسی سے نہیں کیا۔ بانک، پٹا، بلم، چلانے میں مشاق تھے۔ تیراکی میں بھی استاد تھے۔ عمر کا زیادہ عرصہ لہو ولعب میں گزرا، لیکن بڑھاپے میں گناہوں سے توبہ کر لی تھی۔ آخری عمر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ہندوانی تہواروں سے بہت دلچسپی تھی۔ معاش کی فکر دامن گیر ہوئی تو معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ روز متھرا میں رہے پھر آگرہ لوٹ آئے۔ نظیر اکبر آبادی خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ ۱۶/اگست ۱۸۳۰ء کو اکبر آباد میں انتقال کر گئے۔ امامیہ طریق پر تجہیز و تکفین ہوئی۔ نماز جنازہ دو مرتبہ پڑھائی گئی۔ سنّیوں نے علاحدہ نماز پڑھی۔ اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے۔ اُن کے مزار پر ہر سال بسنت پنچمی کے دن میلہ لگتا ہے جس میں ہندو مسلمان بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ خلیفہ گلزار علی اسیرؔ انھی کے فرزند تھے۔ ایک ضخیم کُلّیات نظیر کی یادگار ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے غزلیں بھی کہیں، لیکن ان کی شہرت نظموں کی وجہ سے ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے مناظرِ فطرت پر متعدّد نظمیں کہی ہیں جن میں موسموں، تہواروں، تقریبوں، مختلف رسومات وغیرہ پر نظمیں شامل ہیں۔

> وہ عوام کے شاعر تھے اور عوام کی زندگی کے جذبات کا مطالعہ ان کا خاص فن تھا۔ دنیا کا جتنا وسیع مطالعہ نظیر نے کیا، کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوا۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

یوں تو ہم کچھ نہ تھے پر مثلِ انار و مہتاب — جب ہمیں آگ لگائی تو تماشا نکلا

پھر کے نگاہ چار سُو ٹھہری اُسی کے رُوبہ رُو — اُس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا

تیشے کی کیا مجال تھی جو یہ تراشے بیستوں — تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا

خوابِ عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیرؔ — سوتے تھے، عشق نے، مگر آ کر جگا دیا

دیکھ لے اِس چمنِ دہر کو دل بھر کے نظیرؔ — پھر ترا کاہے کو اِس باغ میں آنا ہوگا

جس کام کو جہان میں آیا تھا تُو نظیرؔ — خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

تھما نہ اشک، نہ نیند آئی، نہ پلک جھپکی — بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں

مُنہ چاند کا ٹکڑا ہے، بدن چاندی کی تختی — دنداں ہیں گہر، ہونٹ عقیقِ یمنی ہے

کچھ بن نہیں آتا کیا کیجے، کس طور سے ملیے اے ہم دم! — وہ دیکھ ہمیں رک جاتا ہے، اور ہم کو چین اِک آن نہیں

سب کتابوں کے کُھل گئے معنی — جب سے دیکھی نظیرؔ دل کی کتاب

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو — یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آئے — کہ ہم کو راہ میں اِک آشنا نے لُوٹ لیا

مَے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں — جی میں آتا ہے، لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل — اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

گئے تھے ملنے کو شاید جھڑک دیا اُس نے — میاں نظیرؔ تو کچھ شرمسار آتے ہیں

ہشیار یار جانی! یہ دشت ہے ٹھگوں کا — یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے — کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے — جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

ع: ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

ع: سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

طنزیہ و مزاحیہ اشعار

تھا ارادہ تری فریاد کریں حاکم سے — وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا

جو خوشامد کرے، خلق اُس سے سدا راضی ہے — سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

صبح جب بول اُٹھا مرغِ سحر 'ککڑوں کوں' — اُٹھ گئے پاس سے وہ، رہ گیا میں ٹڑوں ٹوں

حسن، میر غلام

میر غلام حسن نام، حسن تخلّص ۔ ۴۲-۱۷۴۱ء کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد میر غلام حسین ضاحک سے حاصل کی جو خود بھی شاعر تھے ۔ دہلی کی سیاسی انتشار اور دگرگوں حالت کی وجہ سے اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد چلے گئے ۔ کچھ عرصے کے بعد لکھنؤ میں سکونت اختیار کی ۔ میر ضیاء الدّین ضیا اور سودا سے تلمذ حاصل تھا ۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ۔ متعدّد مثنویاں لکھیں ۔ مثنوی ''سحر البیان'' سے ان کی بڑی شہرت ہوئی ۔ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مثنوی ''سحر البیان'' کے متعلّق لکھتے ہیں: ''جو پڑھ سکتے تھے انھوں نے پڑھی، جو نہ پڑھ سکتے تھے انھوں نے پڑھ کر سنی ۔ جاہلوں کا بھی یہ عالم رہا کہ جو'' چار شعر یاد تھے اُن کو پڑھتے اور سر دھنتے تھے ۔''

میر انیس انھی کے پوتے تھے ۔ ۲۴؍ اکتوبر ۱۷۸۶ء کو لکھنؤ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ۔ بحیثیت مجموعی میر حسن کی دو تصانیف ہیں ۔ ایک ''کلّیاتِ میر حسن'' اور دوسری ''تذکرہ شعراے اردو ۔''

میر حسن کا کلام جذبات کی صداقت، بیان کی سلاست اور زبان کی صفائی کا بہترین نمونہ ہے ۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

نو گرفتاری کے باعث مضطرب صیّاد ہوں — لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا

دوستی کس سے نہ تھی، کس سے مجھے پیار نہ تھا — جب بُرے وقت پہ دیکھا تو کوئی یار نہ تھا

زندگی نے وفا نہ کی، ورنہ — میں تماشا وفا کا دکھلاتا

میں نہ سنتا کسی کی بات حسنؔ — دل جو باتیں نہ مجھ کو سنواتا

اُس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا — جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

اظہار خموشی میں ہے سَو طرح کی فریاد — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا پوچھے ہے مجھ سے مری خاموشی کا باعث — کچھ تو سبب ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

نہ رکتی تھیں آہیں، نہ تھمتے تھے آنسو — حسنؔ تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا؟

دیکھتے ہی مے کو ساغر کا نہ کھینچا انتظار — مارے جلدی کے میں اپنا ہاتھ پیمانہ کیا

وہ دن گئے کہ گلشن تھا بود و باش اپنا — اب تو قفس میں بھولے نقشہ بھی گلستاں کا

جس عالمِ ہستی کو سمجھتے تھے بہار، آہ — آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم ہے خزاں کا

میں حشر کو کیا روؤں کہ اُٹھ جاتے ہی تیرے
بر پا ہوئی اِک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور

حال کیا پوچھتے ہو، جانے دو
میں کہوں گا تو پھر گلہ ہوگا

اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے تو کیا
ہو چکی واں بہار ہی آخر

نہ تو آہ و نالہ ہی نکلے ہے، نہ اُٹھے ہے کل سے صدائے دل
تُو خبر تو سینے میں لے حسنؔ، کہیں چل بسا نہ ہو ہائے دل

ہونے کی رکھیں توقّع اب خاک
ہونا تھا جو کچھ سو ہو چکے ہم

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصّہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

آرزو دل کی بر آئی نہ حسنؔ وصل میں اور
لذّتِ ہجر کو بھی مفت میں کھو بیٹھے ہم

مانند حباب اِس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

شبِ فراق میں رو رو کے مر گئے آخر
یہ رات جیسی تھی، ویسی رہی، سَحر نہ ہوئی

رہنے نہ دے گا اُس بِن یہ دل تو ایک دم بھی
کیوں روٹھ کر ہم اپنا کھو دیں عبث بھرم بھی

دل کو کھویا ہے کل جہاں جا کر
جی میں ہے، آج جی بھی کھو آؤں

جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

صورت نہ ہم نے دیکھی حرم کی، نہ دیر کی
بیٹھے ہی بیٹھے دل میں دو عالم کی سیر کی

حسنؔ مت یاد کر اُن صحبتوں کو
سدا یک ساں نہیں رہتی کسی کی

سوجھا ہمیں نشیب و فرازِ زمانہ تب
جب عشق کی بلندی و پستی نظر پڑی

تیرے ہم نام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں
دل دھڑک جائے ہے میرا کہ کہیں تُو ہی نہ ہو

جان و دل ہیں اُداس سے میرے
اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

دُنیا ہے، سنبھل کے دل لگانا
یاں لوگ عجب عجب ملیں گے

آج کی چاندنی وہ ہے کہ کسی شوخ کے ساتھ
کھول آغوش لپٹ جائیے اور سو رہیے

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن
فصلِ گل جیتوں کو پھر اگلے برس آتی ہے

بے خبر جس طرح سے آئے ہیں
اِس طرح بے خبر ہی جاویں گے

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو
کیا غضب کرتے ہو، اِدھر دیکھو

دیکھنا زلف و رُخ تمھیں ہر وقت
شام دیکھو نہ تم سَحر دیکھو

گل ہوئے جاتے ہیں چراغ کی طرح — ہم کو ٹک جلد آن کر دیکھو

نہانے سے نکلا عجب اُس کا روپ — نکل آئے بدلی سے جس طرح دھوپ

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار — نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن

سدا عیش دَوراں دکھاتا نہیں — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

دو رنگی زمانے کی مشہور ہے — کبھی سایہ ہے اور کبھی نور ہے

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں — سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

کٹی رات حرف و حکایات میں — سَحر ہو گئی بات کی بات میں

کسی سے نہ برآوے کچھ کامِ جاں — جو وہ مہرباں ہے تو کُل مہرباں

کسی کی بدی تُو نہ کر، عیب ہے — کہ اُس کا خدا عالم الغیب ہے

نہا دھو کے نکلا وہ گُل اِس طرح — کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

رکے جو کوئی اُس سے رک جایئے — جھکے آپ سے، اُس سے جھک جایئے

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا — اُسی اپنے عالم میں مُنہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشے کا سا عالم گلستان پر

چمن آتشِ گُل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور — گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

ترقّی، آغا محمد تقی

اسداللہ رستم الملک آغا محمد تقی خاں بہادر، ترقّی تخلّص ۔ میر سوز کے شاگرد تھے۔ فیض آباد میں بود و باش تھی اور نواب بہو بیگم کی سرکار سے توسّل رکھتے تھے۔ بہو بیگم کے انتقال کے بعد غازی الدّین حیدر کے عہد میں مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔ بڑے وضع دار اور علم دوست امیر تھے۔ ان کا خاندان شرافت اور وضع داری میں نیک نام رہا ہے۔

منتخب اشعار

اے ترقّی! بات جی کی جی میں رکھ — مُنہ سے نکلی اور پرائی ہو چکی

در و دیوار سے آتا ہے نظر جلوۂ دوست — آئینہ خانہ مرا گوشۂ تنہائی ہے

دنیا کے جو مزے ہیں، ہرگز یہ کم نہ ہوں گے — چرچے یہی رہیں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے

فدوی، مرزا محمد علی

نام مرزا محمد علی، فدوی تخلّص۔ عرفیت مرزا بھچو۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہیں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے اور جب ابدالی کے حملوں نے دہلی کی حالت ابتر کردی تو یہ ترک وطن کر کے تلاش معاش میں لکھنؤ اور فیض آباد چلے گئے اور وہاں سے عظیم آباد آئے اور اس شہر کو وطن ثانی بنالیا۔ وہ رکن الدّین عشق کے شاگرد اور مرید تھے۔ فدوی فارسی و عربی سے واقف تھے اور موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ سیر و سیاحت کے بہت شوقین تھے۔ ۹۶-۱۷۹۵ء میں عظیم آباد میں انتقال کر گئے اور وہیں شاہ عشق کے مکان میں دفن ہوئے۔ ''کلّیات فدوی'' کے نام سے ان کا کلام شائع ہو گیا ہے۔

منتخب اشعار

خوفِ رقیب ہے اِسے کچھ اَور مت سمجھ — اُٹھ کر چراغ میں نے جو خاموش کر دیا

جانا کہیں ہے، جارہا ہوں بھول کر کہیں — آشفتگی سے پاؤں کہیں ہے، نظر کہیں

اپنی اِس عمر کے انجام کو مت رو فدویؔ — اِتنی گزری ہے جہاں، یہ بھی گزر جائے گی

کیا یاد ہم کریں گے ملاقات رات کی — آیا، پھرا، چلا؛ نہ وہ بیٹھا، نہ بات کی

ہوا کس لیے رنگ تغیّر اے گل! — ترے کان میں کیا صبا نے کہا ہے؟

چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے — عاشق کا جنازہ ہے، ذرا دھوم سے نکلے

جو دیکھتا ہے مجھ کو، مُنہ دیکھتا ہے تیرا — خانہ خراب میرے اِس رنگِ زرد کا ہو

گلی سے کون تری بے قرار گزرے ہے — کہ جس کی آہ کلیجے کے پار گزرے ہے

شوق، قدرت اللّٰہ

نام مولوی قدرت اللّٰہ، شوق تخلّص۔ ولادت موضع مَوَئی، قصبہ کاہر، تحصیل بہیڑہ، ضلع بریلی۔ شیخ کرم اللّٰہ شہید کی اولاد میں قدرت اللّٰہ، شوق ایک بڑے عالم اور نیک بزرگ تھے۔ قائم چاند پوری کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان اور ایک تذکرہ ''طبقات الشعرا'' ان کی یادگار ہے۔ وفات ۱۰-۱۸۰۹ء۔ اُن کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے:

غافل تجھے کرتا ہے یہ گھڑیال منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی

افسوس، میر شیر علی جعفری

شیر علی جعفری نام، افسوس تخلّص۔ ۱۷۴۵ء اور ۱۷۴۸ء کے درمیان دہلی میں پیدا ہوئے۔ افسوؔس اپنے والد کے ہمراہ پٹنہ اور پھر لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ میں ان کی سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر اور ان کے بعد اُن کے بیٹے نواب مرزا نوازش علی خاں کرتے رہے۔ تلمیذ میر حیدر علی حیراں۔ بعض کہتے ہیں کہ میر تقی میر، میر حسن اور میر سوز سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ کے دَوران قیام، نواب حسن رضا خاں، نائب نواب آصف الدّولہ کی وساطت سے افسوؔس کرنل سکاٹ سے ملے۔ ان کی قابلیت اور ذہانت دیکھ کر کرنل اسکاٹ نے انھیں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے زمرۂ اسٹاف میں ایک معزز عہدے پر رکھ لیا۔ افسوؔس نے گلستانِ سعدی کا اردو ترجمہ موسوم بہ ''باغِ اردو'' کیا۔ علاوہ اردو دیوان کے ''آرائشِ محفل'' ان کی مشہور کتاب ہے۔ وہ ۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

منزلِ عشق تک نہ پہنچا آہ — میں تو چلتے ہی چلتے ہار گیا

قفس سے چھٹنے کی اُمّید ہی نہیں افسوؔس — حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

مل جاؤ کہ نزع کا ہے عالم — سب قصّے تمام ہو رہے ہیں

بزم میں اُس کی نہ ہنستے ہیں، نہ رو سکتے ہیں — چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا مُنہ تکتے ہیں

کوچۂ یار میں رہتے تو نہیں اب، لیکن — بھولے بھٹکے کبھی اُس راہ سے ہو جاتے ہیں

کیا فائدہ جو پوچھیے احوالِ دل افسوؔس سے — مُنہ دیکھ رو دیتا ہے وہ، پر بات کچھ کرتا نہیں

بے تاب بہت ہوں آج یارو! — ٹک لے چلو اُس کے پاس مجھ کو

کیا تُو نے لکھا تھا کہ ترے خط کے تئیں دیکھ — آنسو لگے افسوؔس کی آنکھوں سے ٹپکنے

کچھ بات تم سے کر نہیں سکتے ہزار حیف — مدّت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے

اُس کے اُٹھتے ہی جی پہ آن بنی — دیکھیے، آگے آگے کیا ہووے

مصحفی، غلام ہمدانی

نام شیخ غلام ہمدانی، مصحفی تخلّص۔ ولادت تقریباً ۴۹-۱۷۴۷ء، بلّم گڑھ، مضافات دہلی۔ بچپن امروہہ میں گزرا۔ آغازِ جوانی دہلی آئے جہاں تحصیل علوم کی تکمیل کی۔ شعروسخن کا آغاز دہلی سے ہوا۔ ان کو کتب بینی کا اس قدر شوق تھا کہ کتابیں عاریتاً لے کر پڑھتے تھے اور بطور خلاصہ اپنی یادداشت سے لکھتے جاتے تھے بارہ برس تک یہ دہلی میں رہے اور دہلی کو یہ اپنا وطن کہتے تھے۔ دہلی جب تباہ ہوئی اور اہل کمال کا مجمع منتشر ہوا تو یہ بھی دلّی سے دوسرے شعرا کی طرح نقل مکانی کر کے لکھنؤ آئے اور شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ لکھنؤ آنے سے پہلے کچھ دنوں ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں امیر کی سرکار سے منسلک رہے۔ مصحفی نہایت زود گو تھے۔ مشہور ہے کہ یہ اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے۔ مصحفی اور انشا دونوں ہم عصر تھے۔ مشاعروں میں ان کے مابین نوک جھونک رہتی تھی۔ بعد میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان دونوں نے تہذیب ومتانت سے گر کر ایک دوسرے کا تمسخر اُڑایا۔ میر مستحسن خلیق، ضمیر، آتش، شہیدی اور مظفر علی اسیر ان کے مشہور شاگرد تھے۔ ۲۵-۱۸۲۴ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔ آٹھ اردو دیوان، ایک فارسی دیوان کے علاوہ تین تذکرے لکھے: ''عقدِ ثریا''، ''تذکرۂ ہندی'' اور ''ریاض الفصحا''

مولانا حسرت موہانی کا خیال ہے:

> مصحفی میں میر وسودا، فغاں وسوز، جرأت وشاہ نصیر سب کا رنگ پایا جاتا ہے اور جن غزلوں اور بیتوں میں ان تمام اساتذہ کی خوبیوں کو ان کی کہنہ مشقی اور استادی یک جا کر دیتی ہے تو ان کا شمار اردو شاعری کے بہترین نمونوں میں کیا جاسکتا ہے۔

منتخب اشعار

تیرے ہوتے جو ہمیں یاد بھی آیا کوئی کام   ہم نے موقوف اُسے وقتِ دگر پر رکھا

حادثے ہوتے ہیں زمانے میں   اِس قدر انقلاب کس دن تھا

مصحفی! آج تو قیامت ہے   دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

اے مصحفی! افسوس، کہاں تھا تُو دِوانے   کل اُس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا

یادِ ایّامِ بے قراریٔ دل   وہ بھی یارب! عجب زمانہ تھا

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن کو رات کرنا   کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

ہم سمجھے تھے جس کو مصحفی یار
وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا!

کل قافلۂ نکہتِ گُل ہوگا روانہ
مت چھوڑیو تُو ساتھ نسیمِ سحری کا

عشق کے صدمے اُٹھائے ہیں بہت، پر کیا کہیں
اب تو اِن صدموں سے کچھ جی اپنا گھبرانے لگا

دیکھتے ہی اُس کے کچھ اپنی یہ حالت ہوگئی
جو مجھے سمجھائے تھا، میں اُس کو سمجھانے لگا

کان میں قاصد نے کچھ ایسا ہی آ کر کہہ دیا
جس کو سن کر سر میں دیواروں سے ٹکرانے لگا

مصحفی! گرچہ خفا ہم سے وہ رہتا ہے، ولے
ذکر آ جائے ہے اُس بزم میں اکثر اپنا

باہم جنھوں میں مہر و مروّت کی راہ تھی
وہ لوگ کیا ہوئے، وہ زمانہ کہاں گیا!

مصحفی! ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

دل میں کہتے تھے ملے یار! تو کچھ اُس سے کہیں
مل گیا وہ تو نہ اک حرف زباں سے نکلا

تہمت ہے مصحفی پر صحنِ چمن کی یارو!
کب گھر سے اپنے باہر وہ سوگوار نکلا

میں عجب یہ رسم دیکھی، مجھے روزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب اُلٹا (۱)

رات سنسان سی مجلس جو نظر آتی تھی
اَور تو سب تھے، مگر مصحفیؔ زار نہ تھا

تلوار کو کھینچ، ہنس پڑے وہ
ہے مصحفی کشتہ اِس ادا کا

خواب تھا یا خیال تھا، کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا، کیا تھا؟

مصحفی! چپ جو شب تُو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا، کیا تھا؟

کہتا نہ تھا میں اے دل! جانا نہ اُس گلی میں
آخر تُو مجھ پہ آفت، خانہ خراب! لایا

اِک ذرا دیکھیو اُس رشک پری کا سونا
میں تو دیکھا نہیں اِس بے خبری کا سونا

مت میرے رنگِ زرد کا چرچا کرو کہ یاں
رنگ ایک سا کسی کا ہمیشہ نہیں رہا

مُنہ اُٹھ گیا جدھر کو، اُدھر ہی چلے گئے
آوارگانِ شوق کو منزل سے کیا خبر!

---

(۱) ''کلیاتِ مصحفی'' (دیوانِ سوم)، مرتبہٗ ڈاکٹر نورالحسن نقوی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ص ۲۹

''کلیاتِ انشا'' نول کشور کے اڈیشنوں میں یہ شعر حسبِ ذیل شکل میں انشا سے منسوب ہے:

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب اُلٹا

''یہ شعر 'کلیاتِ انشا' کے کسی مخطوطے میں نہیں ہے۔ غالباً یہ شعر نول کشور کے مطبوعہ نسخوں میں غلطی سے داخل ہوگیا ہے۔''

''آوارہ گرد اشعار'' قاضی عبدالودود، ''نقوش'' ادبِ عالیہ نمبر، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۱-۱۳۰

جو سیر کرنی ہے کر لے کہ جب خزاں آئی
نہ گل رہے گا چمن میں، نہ خار ٹھہرے گا

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم!
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

جو ملا اُس نے بے وفائی کی
کچھ بھروسا نہیں زمانے کا

اے مصحفی! چھپائے ہے کیا اب تو عشق کو
یہ قصہ اِک جہان میں مشہور ہو گیا

شیخ! کُلبے سے اُٹھ، نکل باہر
گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا

کیا کہوں حسن و لطافت، جامۂ شبنم سے ہائے
نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

مصحفی! عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا
آدمی جاتا ہے اِس راہ میں اکثر مارا

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

جی تو بھر آتا ہے میرا ضبط سے اے مصحفی!
پر حیا رونے نہیں دیتی مجھے دل کھول کر

مصحفی! عشق کر کے آخرِ کار
خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

دن دیکھے جس کے پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہوں
کیا قہر ہے جو اُس سے برسوں جدائیاں ہوں

آستیں اُس نے جو کہنی تک چڑھائی وقتِ صبح
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

پھٹ چکا جب سے گریباں، تب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی!
چھیڑ مت ہم کو، بھرے بیٹھے ہیں

جس بیابانِ خطرناک سے اپنا ہے گزر
مصحفی! قافلے اِس راہ سے کم نکلے ہیں

پوچھتا کیا ہے حال دل کا مرے
او میاں! تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں

اُس وقت کہ شاید تُو ہمیں یاد کرے گا
جب جی سے تری یاد میں جاویں گے گزر ہم

اے مصحفی! تُو اِن سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب ہی ہوتی ہیں یہ دلّی والیاں

مصحفی! اُس کی گلی میں جو تُو جاتا ہے سدا
اپنی بدنامی کا کچھ تجھ کو بھی ڈر ہے کہ نہیں؟

اُس نازنیں کی باتیں کیا پیاری پیاریاں ہیں
پلکیں ہیں جس کی چھریاں، آنکھیں کٹاریاں ہیں

گھر کا دروازہ جو ہم صبح کو وا کرتے ہیں
شام تک تیری ہی بس راہ تکا کرتے ہیں

مصحفی! کیوں خفا سے بیٹھے ہو
کچھ کسی نے تمھیں کہا تو نہیں

وہ جو ملتا نہیں، ہم اُس کی گلی میں دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

فلک گر ہنساتا ہے مجھ پر کسی کو
میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

اے مصحفی! میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

خواریاں، بدنامیاں، رسوائیاں
عشق نے شکلیں یہ سب دکھلائیاں

ایک صورت کے لیے اِس عشق میں
سیکڑوں صورت کی ہیں رسوائیاں

کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو
مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں پھنسایا
دے پیچ اُدھر زلف اُڑا لے گئی دل کو

پڑا ہوں شاخ سے گر کر میں برگِ زرد کی صورت
خدا جانے، کہاں لے جائے اب بادِ خزاں مجھ کو

بھیگے سے ترا رنگِ حنا اَور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کفِ پا اَور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں مُنہ پہ ترے مینہ کی بوندیں
جوں لالۂ تر حُسن ترا اَور بھی چمکا

نہ کہیں صبح ہی ہوتی ہے، نہ خواب آتا ہے
رات کیا آتی ہے، اِک مجھ پہ عذاب آتا ہے

میں ترے واسطے سر پٹکوں ہوں دیواروں سے
چین کس طرح تجھے، خانہ خراب! آتا ہے

ٹک رحم کرو چاکِ گریبان پہ میرے
یارو! کوئی اُس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو

روٹھا ہوں جو میں اُس سے تو من لوں گا آپھی
جاؤ، کوئی مجھ تازہ پشیماں کو نہ چھیڑو

یہ وہ نہیں ناسور کہ ہو بند کسی سے
بہنے دو مرے دیدۂ گریاں کو نہ چھیڑو

رہنے دو پڑا مصحفیؔ خاک بسر کو
اِس غم زدہ و بے سروساماں کو نہ چھیڑو

صفحۂ روزگار پر لکھ لکھ
عشق کی داستان چھوڑ گئے

اب نہ فرہاد ہے، نہ مجنوں ہے
رہ گیا عاشقوں کا افسانہ

یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل
ایک شب اَور بھی جیے، ہی بنی

تُو دیکھتے ہی اُس کو جو دیوانہ ہو گیا
سچ کہیو مصحفی! ترے کیا جی میں آ گئی

دیکھ اُس کو اِک آہ ہم نے کر لی
حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی

جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے
آنسو بھی تُلا ہوا کھڑا ہے

شمشاد برابر اُس کے قد کے
دہشت سے بچا ہوا کھڑا ہے

ہے موسمِ گل، چمن میں ہر نخل — پھولوں سے لدا ہوا کھڑا ہے

اے جان! نکل کہ مصحفی کا — اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

کٹتی نہیں رات بے کسی کی — کیا جانے کوئی کسی کے جی کی!

پکارتا ہے تجھے مصحفی! جواب تو دے — کھڑا رہے وہ ترے آستاں پہ یا پھر جائے

شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر! — جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

حسرت پہ اُس مسافرِ بے کس کی روئیے — جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے (۱)

شکلِ اُمّید تو کب ہم کو نظر آتی ہے — صورتِ یاس بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے

ہزاروں حوادث ہیں، تا زندگی ہے — یہی زندگی ہے تو کیا زندگی ہے

اے مصحفی! مرنے کی مرے سن کے وہ بولا — کیا لگتا ہے مر جانے کو، انسان میں کچھ ہے

بلبل نے آشیانہ چمن سے اُٹھا لیا — پھر اس چمن میں بوم بسے یا ہُما بسے (۲)

کون اِس باغ سے اے بادِ صبا جاتا ہے — رنگ رخسار سے پھولوں کے اُڑا جاتا ہے

تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے — پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے، بھلے لگے

روتا پھروں ہوں تنہا میں قافلے میں یارو! — منزل پہ میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں

اُس گل بدن نے بندِ قبا جوں ہی وا کیے — مجلس تمام پھولوں کی بو سے مہک گئی

جھپکی ہے مصحفی کی ابھی آنکھ اِک ذرا — تم اُس کو اِس گھڑی نہ جگاؤ تو خوب ہے

آصف، آصف الدّولہ

مرزا یحییٰ خاں نام، آصف تخلص۔ اور مرزا امانی عرفیت تھا۔ آصف الدّولہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ نومبر ۱۷۴۸ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ نواب شجاع الدّولہ کے فرزند تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد ۱۷۷۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ نواب آصف الدّولہ سات برس فیض آباد رہنے کے بعد لکھنؤ منتقل ہو گئے اور اسی کو دارالحکومت بنایا۔ انھیں فنِ تعمیر کا بہت شوق تھا۔ امام باڑہ آصف الدّولہ اور بھول بھلیاں ان کی بنائی ہوئی مشہور عمارتیں ہیں۔ شعر وشاعری اور جملہ علوم وفنون کے بڑے قدردان تھے۔ میر سوز ان کے استاد تھے۔ سودا اور میر تقی میر دلّی سے لکھنؤ آئے

(۱) ''کلیاتِ مصحفی'' (جلد سوم)، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن نقوی، مجلس ترقیِ ادب لاہور، ص ۳۲۵

(۲) ''کلیاتِ مصحفی'' (جلد سوم)، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن نقوی، مجلس ترقیِ ادب لاہور، ص ۳۴۸

اور اُن کے وظیفہ خوار رہے۔ سخاوت کی وجہ سے اپنے دَورِ حکومت میں بہت ہر دل عزیز تھے۔ یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر بولا جاتا ہے کہ ''جس کو نہ دلائے مولا اُسے کیا دیں آصف الدّولہ۔'' آصف الدّولہ ۲۱ رستمبر ۱۷۹۷ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ امام باڑہ آصف الدّولہ میں دفن ہیں۔ ایک اردو دیوان یادگار ہے جس میں غزلیں، رباعیات اور مثنوی درج ہیں۔

منتخب اشعار

یہ نہ آنے کے بہانے ہیں سبھی، ورنہ میاں! — اِتنا تو گھر سے مرے کچھ نہیں گھر دُور ترا

کوچے سے اپنے تُو نے مجھ کو عبث اُٹھایا — سب تو چلے گئے تھے، اِک میں ہی رہ گیا تھا

کہتا ہے بہت کچھ وہ مجھے چپکے ہی چپکے — ظاہر میں یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ہم نے قصہ بہت کہا دل کا — نہ سنا تم نے ماجرا دل کا

ناصح! ترے کہے سے نہ اُس سے ملا کروں — لیکن جو دل ستاوے تو پھر اس کو کیا کروں

لاکھوں جفا و جور سہے اُس کے لیک، آہ — جاتی نہیں ہے دل سے مرے چاہ، کیا کروں

سبھوں سے بولتا ہے، پر مجھی سے — نہیں کچھ بولتا، کیا جانے کیا ہے

تیرے کوچے میں نقشِ پا کی طرح — ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے اُٹھے

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو! — میں ہوں اور رات ہے اور بسترِ تنہائی ہے

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے — ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے

کہاں کی یہ بلا پیچھے پڑی یارب! کہاں جاؤں — مجھے تو رات دن یارو! محبت مار ڈالے ہے

آصفؔ! نہ چھوڑ دستِ سخاوت کو زینہار — لایا ہے کچھ نہ ساتھ، نہ جائے گا تُو لیے

جہاندار، میرزا جہاں دار شاہ

نام میرزا جہاں دار شاہ، عرفیت جواں بخت بہادر، ولی عہد حضرت شاہ عالم بادشاہ۔ تقریباً ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محصور ''سلاطین'' کے طور پر ہوئی جس میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم شامل تھی۔ دلیری اور جواں مردی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز شکار گاہ میں ہاتھی بگڑ گیا۔ چاہا کہ سونڈ سے وار کرے، مگر شہزادے نے مہلت نہ دی اور ایک ہی ضرب میں اس کا کام تمام کر دیا۔ امرا کی ریشہ دوانیوں سے بددل ہو کر دہلی چھوڑ کر پہلے لکھنؤ گئے اور بعد میں

بنارس چلے گئے۔ انگریزوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پنشن ہوگئی۔ آصف الدّولہ جہاندار شاہ کے مصارف کے کفیل تھے اور تین لاکھ روپیہ سالانہ دینے پر رضا مند تھے۔ شعرا کے بہت قدر دان تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ موسیقی سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ لکھنؤ سے بنارس آ کر محفل آرائی کا زور قائم رہا۔ جہاندار رنگ رلیاں مناتے رہے اور اپنی انتظامی استعداد کو فراموش کرتے رہے۔ پریشانیوں اور الجھنوں نے جہاندار کو مضمحل کر دیا تھا۔ ۳۱ر مئی ۱۹۷۸ء کو چنار سے واپسی پر ان کے سینے میں درد اُٹھا اور اگلے روز یکم جون ۱۹۷۸ء کو بنارس میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ دیوان جہاندار کے علاوہ ''دلّی سے فرار کی داستان'' ان کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا ہے۔

منتخب اشعار

هوا جہاں سے جہاندار گو میں بیگانہ — وہ بدگماں تو و لے مجھ سے آشنا نہ ہوا

گریاں ہوں ایک عمر سے، پوچھا نہ یار نے — روتا ہے کون یہ پسِ دیوار دیکھنا

مری جان جاتی ہے، یارو! سنبھالو — کلیجے میں کانٹا چبھا ہے، نکالو

آخر گل اپنی صرفِ درِ مے کدہ ہوئی — پہنچے وہاں ہی خاک، جہاں کا خمیر ہو (۱)

عشق نے کر دیا مجھے مجبور — اب نہیں اختیار، کیا کیجے

کام میرا تو ہو چلا آخر — اے مرے کردگار! کیا کیجے

بیمارِ عشق جاں بر اب تک کوئی ہوا ہے! — تُو اے طبیب! ناحق میری دوا کرے ہے

پچھتائے گا تُو اِک دن، سنتا ہے اے جہاندار — دیتا تو ہے دل اُس کو، لیکن برا کرے ہے

---

(۱) ''گلشنِ بے خار''، مصطفٰے خاں شیفتہ، مرتبہ کلب علی خاں فائق مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۱۳۶

نیز ''خُم خانۂ جاوید'' (جلدِ دوم)، لالا سری رام، دہلی، ۱۹۱۱ء، ص ۳۲۲

''دیوانِ جہاں دار''، میرزا جواں بخت جہاں دار، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور، میں ص ۱۲۴ پر پہلے مصرع کی صورت مختلف ہے:

آخر گل اپنے صرفِ درِ مے کدہ ہوئے

عرض یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں چوں کہ یائے معروف و یائے مجہول کے لکھنے میں صریحاً امتیاز نہیں کیا جاتا تھا، بنابریں ''اپنی'' کو ''اپنے'' اور ''ہوئی'' کو ''ہوئے'' (''ھوئے'') بالعموم لکھا جاتا تھا۔ ''گل'' اُردو میں بالاتفاق مؤنث ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ''دیوانِ جہاں دار''، محولۂ بالا میں ضمیمہ نمبر ۱ 'تذکیر و تانیث' کے تحت ''گل'' کی تذکیر کی نشان دہی نہیں کی ہے۔

جرأت، قلندر بخش

اصل نام یحییٰ امان، مگر قلندر بخش کے نام سے مشہور ہوئے۔ جرأت تخلص۔ ولادت تقریباً ۱۷۴۹ء۔ وطن دہلی تھا۔ بچپن فیض آباد میں گزرا اور یہیں نشو و نما ہوئی۔ مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ نجوم اور موسیقی میں دستگاہ رکھتے تھے۔ ستار خوب بجاتے تھے۔ جوانی میں بینائی جاتی رہی۔ مشہور ہے کہ آشوبِ چشم کے بعد جرأت نے مشہور کر دیا کہ ''میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور مجھے اب کچھ دکھائی نہیں دیتا۔'' اس بہانے رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا بن کر جانے لگے اور خوبصورت عورتوں کو چپکے چپکے تاکنے لگے۔ خدا کا ایسا کرنا ہوا کہ سچ مچ اندھے ہو گئے۔ پہلے نواب محبت خاں کی رفاقت میں رہے۔ اس کے بعد مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ سیّد انشا اور ان کی صحبتیں خوب گرم رہتی تھیں۔ جرأت زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، مگر طبیعت بلا کی پائی تھی۔ جرأت کی ساری زندگی تنگ دستی میں گزری۔ وہ ایک کچے مکان میں رہتے تھے۔ ایک ضخیم کُلیّات یادگار ہے۔ جس میں غزلیات کے علاوہ مخمسات، مسدسات اور رباعیات شامل ہیں۔ ۱۸۰۹-۱۰ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

ان کے کلام میں شوخی و بے باکی بلکہ عریانی زیادہ پائی جاتی ہے، لیکن ان کے کلام میں صحیح عاشقانہ رنگ کے اشعار بھی بڑے بڑے پاکیزہ نظر آتے ہیں۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

وہ گیا اُٹھ کر جدھر کو، میں اُدھر حیران سا
اُس کے جانے پر بھی کتنی دیر تک دیکھا کیا

جب تلک کرتے رہے مذکور اس کا مجھ سے لوگ
جی میں کچھ سوچا کیا، اور دل دھڑکا کیا

قفس میں، ہم صفیرو! کچھ تو مجھ سے بات کر جاؤ
بھلا میں بھی کبھی تو رہنے والا تھا گلستاں کا

کیا اِس عشق کی وحشت نے کیا دیوانہ جرأت کو
عجب احوال ہم نے دیکھا، کل اُس خانہ ویراں کا

ترے بن دیکھے جرأت کی یہ حالت ہوگئی غم سے
کہ اپنے سے تو اُس کو بھر نظر دیکھا نہیں جاتا

شکر، تم گھر سے نکل آئے نہیں تو پیارے
بے قراری سے ابھی میں نے پکارا ہوتا

شکر تم آگئے گھر اُس کے، نہیں جرأت نے
سر اُٹھا کے ابھی دیوار سے مارا ہوتا

لوگ سب کہتے ہیں، اِس بیمارِ غم کو کیا ہوا
جانتے ہم بھی نہیں ہیں یہ کہ ہم کو کیا ہوا

ملکِ دل میرا سدا سنسان ہی رہتا ہے، آہ!
سب نگر بستے ہیں یارب! اِس نگر کو کیا ہوا

آج کی رات کٹے دیکھیے، کس شکل سے آہ!
اُس نے پھر وعدۂ دیدار سَحر پر رکھا

بات ہی اوّل تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی
اور جو بولے ہے کچھ مُنہ سے تو شرمایا ہوا

واں سے آیا ہے جوابِ خط، کوئی سنیو ذرا
میں نہیں ہوں آپ میں مجھ سے نہ سمجھا جائے گا

آج کیا جانے، کیا ہوا مجھ کو
کل تک ایسا تو جی نڈھال نہ تھا

تھا جی میں کہ دشوارئ ہجر اُس سے کہیں گے
پر جب ملے کچھ رنج ومحن یاد نہ آیا

اَور تو کیا مشغلے ہیں ہجر میں تیرے، مگر
دل کی بے تابی سے سَو سَو بار اُٹھنا بیٹھنا

اُس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا
جادو برحق ہے، کرنے والا کافر

ضبط گریہ تو ہے پر دل پہ جو اِک چوٹ سی ہے
قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

اپنے پہلو سے وہ جب اُٹھ کے چلا اے جرأت
اُس کا مُنہ دیکھ کے بس رہ گئے مجبور سے ہم

ملی رہتی تھیں جو نظروں سے نظریں، سو کہاں اب تو
کبھی ہم اتفاقاً اِک جھلک سی دیکھ پاتے ہیں

روئے ہے بات بات پر جرأت
ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا
دن گیا، رات ہوئی، رات گئی، دن آیا

بھلا دیکھو تو ہم تم ایک ہی بستی میں بستے ہیں
سوتس پر یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

شبِ ہجراں نہیں، بلا ہے یہ
صبح ہوتی نہیں ہے، کیا ہے یہ

مر گئے ہجرِ یار میں صد شکر
جیتے رہتے تو سخت خواری تھی

کہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی
بھری سہاگ کی تس پر یہ بُو دلہن کی سی

دلِ وحشی کو خواہش ہے تمھارے در پہ آنے کی
دِوانہ ہے ولیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

پڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری
وہ مُنہ کو پھیر کے کہتا ہے، اُف، پناہ تری

اُس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی (جرأت)
اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سوجھی (انشا)

مجھے جرأت اب نہیں کچھ خبر، گئے عقل وہوش وخرد کدھر
یہ مرے پیامبر آن کر مجھے کیا پیام سنا گئے

یارو، کہو ہر بار نہ کچھ کان میں اپنے
کیا جانے کہ ہم بیٹھے ہیں کس دھیان میں اپنے

جب یہ سنتے ہیں، وہ ہمسائے میں ہیں آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

مت خفا ہو ایک دم یاں بیٹھنے سے اس قدر
ٹک تمھیں بس دیکھ کر اے مہرباں اُٹھ جائیں گے

نہ ہم دم ہے کوئی، نہ اب ہم نشیں ہے | بُرے وقت کا کوئی ساتھی نہیں ہے
جوشِ گل چاکِ قفس سے دم بدم دیکھا کیے | سب نے لُوٹی ہیں بہاریں اور ہم دیکھا کیے
سرسری اُن سے ملاقات ہے گاہے گاہے | صحبتِ غیر میں گاہے، سرِ راہے گاہے
آنے کی خبر ہے اُس کے، لیکن | آتا نہیں اعتبار دل کو
آج اُس کوچے کیا جا کے تُو سن آیا ہے | جرأت ایسا تو کبھی آگے تُو خاموش نہ تھا

رضا، میر محمد

نام میر محمد رضا، تخلص رضا۔ ۵۰-۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ تذکروں میں کچھ عرصہ لکھنؤ میں قیام کا ذکر ملتا ہے جہاں پٹنوی کہلاتے تھے۔ ضیاء الدّین ضیا سے تلمذ حاصل تھا۔ اردو دیوان کے علاوہ تذکرہ نگاروں نے ان کے دیوان فارسی کا بھی ذکر کیا ہے۔ نواب مبارک الدّولہ کے یہاں ملازم رہے۔ ۰۲-۱۸۰۱ء میں مرشد آباد میں انتقال کر گئے۔ ''دیوان رضا عظیم آبادی'' مرتبہ قاضی عبدالودود ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔

منتخب اشعار

عاشق ہوا، خراب ہوا، مبتلا ہوا | اب اَور کیا کہوں میں، نہ پوچھو کہ کیا ہوا
ذکر اُس کا کہیں ہوا شاید | یک بہ یک دل مرا تڑپ اُٹھا
رضا کا اب خدا حافظ ہے یارو! | یہی مجنوں کو بیماری ہوئی تھی

انشا، انشاء اللہ خاں

سیّد انشاء اللہ خاں نام، انشا تخلص۔ ان کے والد شاہی طبیب تھے۔ زوالِ سلطنت کے بعد یہ مرشد آباد چلے گئے۔ سیّد انشا یہیں دسمبر ۱۷۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ شعر کہنے کا شوق ان کو بچپن سے تھا۔ کبھی کبھی والد سے اصلاح لیتے تھے، مگر زیادہ تر اپنی فطری صلاحیت سے کام لیتے تھے۔ انشا بہت ذہین تھے۔ اردو، فارسی، عربی کے علاوہ ترکی، پشتو، پوربی، پنجابی، ماڑواڑی، مرہٹی، کشمیری اور ہندی جانتے تھے۔ شاہ عالم کے زمانے میں انشا دہلی آئے۔ انھوں نے انشا کی بڑی قدر کی۔ دلّی کی تباہی سے بددل ہو کر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ یہاں پہنچ کر شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کی۔ بعد میں نواب سعادت علی خاں کے دربار سے

منسلک ہو گئے۔ انشا نے اپنے لطیفوں، چٹکلوں اور ظرافت سے نواب کو ایسا رام کیا کہ نواب کو ان کی ایک دم کی جدائی بھی ناگوار تھی۔ بعد میں نواب سے کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی اور تنخواہ بند ہو گئی جس سے فاقے تک کی نوبت پہنچ گئی۔ اسی عالم میں ۱۶ یا ۱۹ رمئی ۱۸۱۷ء کو انشا لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ بقول میاں بیتاب ''انشاء کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے اور ان کی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی درباری نے ڈبویا۔'' اردو، فارسی، ریختی دیوان کے علاوہ ''دریائے لطافت'' (قواعد اردو) اور کئی مثنویاں یادگار چھوڑیں جن میں ایک مثنوی بے نقط ہے۔

منتخب اشعار

آپ خدا نے جب کہا صلِّ علیٰ محمدٍ — کیوں نہ کہیں پھر انبیا صلِّ علیٰ محمدٍ
عرش سے آتی ہے صدا صلِّ علیٰ محمدٍ — نور جمالِ کبریا صلِّ علیٰ محمدٍ
صلِّ علیٰ نبیّنا، صلِّ علیٰ محمدٍ

دل لگایا ہے کہیں انشا نے شاید دوستو! — اِن دنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا — لگا کے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا
نزاکت اُس گلِ رعنا کی دیکھیو انشا — نسیمِ صبح جو چھو جائے، رنگ ہو میلا
جھڑکی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی — یہ سب سہی، پر ایک 'نہیں' کی نہیں سہی
گر 'نازنیں' کے کہنے سے مانا بُرا ہو کچھ — میری طرف تو دیکھیے، میں نازنیں سہی
عجب رنگینیاں ہوتی ہیں کچھ باتوں میں اے انشا! — ہم مل بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم
عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے — کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے
کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری! راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں
بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے محبت میں — نہیں اٹھنے کی طاقت، کیا کریں، ناچار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اِس دَور میں یارو — جسے پوچھو، یہی کہتے ہیں، ہم بے کار بیٹھے ہیں
کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے، سنا انشا! — غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں (۱)

(۱) مولانا محمد حسین آزاد نے مصرعِ اولیٰ میں اصلاح کر کے اس شکل میں داخلِ ''آبِ حیات'' کیا ہے:

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا

بحوالہ: ''کلّیاتِ انشا'' (جلد اوّل)، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۰

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے ۔۔۔ زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

غصّے میں ترے ہم نے بڑا لطف اُٹھایا ۔۔۔ اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

جی میں کیا آ گیا انشا کے یہ بیٹھے بیٹھے ۔۔۔ کہ پسند اُس نے کیا عالمِ تنہائی کو

ہوئے ہیں خاکِ سرِ راہ اُس کی ہم انشا ۔۔۔ بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے، کہو اور سنو ۔۔۔ بات میں تم تو خفا ہو گئے، لو اور سنو

چند مدّت کو فراقِ صنم و دیر تو ہے ۔۔۔ چلو پھر کعبے ہی ہو آئیں، بھلا سیر تو ہے

طنزیہ و مزاحیہ اشعار

ہزار شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی ۔۔۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی [1]

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر ۔۔۔ اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر

میں تو کہتی تھی نہ رکھا اے مرے پیاری! روزہ ۔۔۔ بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

دلِ ستم زدہ بے تابیوں نے لُوٹ لیا ۔۔۔ ہمارے قبلے کو وہّابیوں نے لُوٹ لیا

کہانی ایک سنائی جو ہیر رانجھے کی ۔۔۔ تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لُوٹ لیا

سانولے پن پر غضب ہے دھج بسنتی شال کی ۔۔۔ جی میں ہے کہہ بیٹھیے اب جَے کنھیّا لال کی

عظیم، مرزا عظیم بیگ

نام مرزا عظیم بیگ، عظیم تخلّص۔ ان کے بزرگوں کا وطن کابل تھا، لیکن یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصے تک درویشی اختیار کیے رہے اور فرخ آباد میں قیام رہا۔ اس کے بعد دہلی آئے۔ پہلے شاہ حاتم سے اصلاح لی، بعد میں سودا کے شاگرد ہوئے۔ ۷-۱۸۰۶ء میں انتقال کر گئے۔

مرزا عظیم بیگ انشا سے نوک جھونک کی وجہ سے مشہور ہیں۔ انھوں نے مشاعرے میں ایک غزل پڑھی۔ ناواقفیت کی بنا پر کچھ اشعار بحرِ رجز کے بجائے بحرِ رمل میں نظم ہو گئے تھے۔ سیّد انشا جو اس مشاعرے میں موجود تھے، انھوں نے مرزا عظیم بیگ سے تقطیع کی فرمائش کی اور ایک مخمس بھی پڑھا جس کا ٹیپ کا بند ہے ''بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے''، مرزا عظیم بیگم نے گھر جا کر دل کا بخار نکالا۔ مخمس کے دو بند ذیل میں درج ہیں۔

(۱) ''خم خانۂ جاوید'' (جلد چہارم)، مؤلفۂ لالا سری رام، دہلی، ۱۹۲۵ء، ص ۳۲۰

وہ فاضلِ زمانہ ہو تم جامعِ علوم — تحصیلِ صرف ونحو سے جن کی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی، حکمت و ہیئت، جفر، نجوم — منطق، بیاں، معانی کہیں سب زمیں کو چوم
تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا بل چلے

موضوع اور معانی میں پایا نہ تم نے فرق — تبدیل بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثلِ مہر یہ از غرب تا بہ شرق — شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے (۱)

قطرۂ نیساں کا موتی فی الحقیقت آب ہے — اشک جب آنکھوں سے ٹپکا گوہرِ نایاب ہے

نصیر، شاہ نصیر

نام نصیرالدّین، تخلّص نصیر، عرفیت میاں کلّو۔ ولادت ۵۷-۱۷۵۶ء اور ۶۲-۱۷۶۱ء کے درمیان۔ وطن دہلی۔ میر محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ بقولِ محمد حسین آزاد: ''دیوان اپنا مرتب نہیں کیا۔ جو غزلیں کہتے تھے، ایک جگہ رکھتے جاتے تھے۔ جب جمع ہو جاتیں تو تکیے کی طرح ایک لمبے سے تھیلے میں بھرتے جاتے تھے۔ گھر میں دے دیتے تھے اور کہتے تھے کہ احتیاط سے رکھ چھوڑو۔'' خوش پوشاک تھے۔ خاندانی وجاہت اور شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں رسائی ہوگئی تھی جہاں ان کی خوب قدردانی ہوئی۔ لکھنؤ دو دفعہ گئے۔ حیدرآباد (دکن) چار مرتبہ گئے۔ پہلے سفر میں جب حیدرآباد گئے تو چندو لال دیوان تھے جو شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور شاہ نصیر کے بطورِ خاص قدردان تھے۔ چوتھی دفعہ حیدرآباد ایسے گئے کہ وہیں کے ہو رہے۔ وفات ۲۳ نومبر ۱۸۳۸ء حیدرآباد (دکن)۔ مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور سے ''کلّیاتِ نصیر'' دو جلدوں میں شائع ہوگئی ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنا ان کا خاص ذوق تھا، اِس لیے اُن کے کلام میں آورد اور تصنع بہت زیادہ ہے۔

منتخب اشعار

افسوس کہ نرگس کی طرح باغِ جہاں میں — کچھ ہم نے بجز حسرتِ دیدار نہ پایا
برباد رفتگانِ محبت کی خاک ہے — اے قیس! دشت میں یہ بگولا نہیں اُٹھا

---

(۱) دوسرے بند کا چوتھا اور پانچواں مصرع ایک شعر کی شکل میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ یہ شعر اس طرح زبان زدِ عام ہے:

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

نصیرؔ اُس زلف کی یہ کج ادائی کوئی جاتی ہے
مثل مشہور ہے رسّی جلی، لیکن نہ بل نکلا

چشم وہ کیا ہے کہ جس میں ایک آنسو بھی نہیں
آبروتب ہے صدف کی جب کہ ہو گوہر سمیت

کس کی نگہ نے جلوۂ برق اب دکھا دیا
آنکھیں جو اپنی ہوگئیں بے اختیار بند

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیرؔ پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پیٹا کر

اے خالِ رُخِ یار! تجھے ٹھیک بناتا
جا، چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

بلبل، ہزار حیف، نہ ہو ہم کنارِ گل
اور مفت میں نسیم تو لوٹے بہارِ گل

برقع کو اُٹھا مُنہ سے جو کرتا ہے تُو باتیں
اب میں ہمہ تن گوش رہوں یا ہمہ تن چشم

سرِ مژگاں بوقتِ نالہ آنسو کو ترستے ہیں
یہ سچ ہے جو گرجتے ہیں، وہ بادل کم برستے ہیں

دل کا نصیرؔ تم ہی کہو کیا کروں علاج
لے جا رہا ہے مجھ کو کہیں پھر کشاں کشاں

وجہ معلوم تو ہو چیں بہ جبیں ہونے کی
سچ کہو، جی میں ہے کیا، کس سے لڑا چاہتے ہو

دیکھ لیتی جو اُٹھا کر تو ترے ٹوٹتے ہاتھ
لیلیٰ اِتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

جس کرب میں گزرتا ہے دن اب، وہ کیا کہوں
ہوتی ہے کیونکے رات بسر کچھ نہ پوچھیے

تنہا، محمد عیسیٰ

نام شیخ محمد عیسیٰ، تنہا تخلص۔ ولادت ۱۷۵۶ء اور ۱۷۶۷ء کے درمیان۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا، مگر تنہا لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہیں مروجہ تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ خوش خلق، سلیم الطبع اور رنگین مزاج تھے۔ ۸-۱۸۰۷ء میں تنہا لکھنؤ سے دہلی جا رہے تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں نے قتل کر دیا۔ مصحفی کو اپنے باکمال شاگرد کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ تنہا صاحبِ دیوان تھے۔

منتخب اشعار

یہ تو فرمایئے! ہم آپ کا کیا لیتے ہیں
آپ بے وجہ جو مُنہ ہم سے چھپا لیتے ہیں

غیر سے شکوہ مرا، بس دیکھی دانائی تری
میں ہوا رُسوا تو کیا ہوگی نہ رسوائی تری؟

کہتا ہے وہ بت پان کو دانتوں سے دبا کر
یوں لعل کٹا کرتے ہیں ہیرے کی کنی سے

رنگیںؔ، سعادت یار خاں

نام سعادت یار خاں، رنگیںؔ تخلص۔ ۱۷۵۶ء میں سرہند میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں نشو و نما ہوئی۔ اوائل عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کی۔ مشہور ہے کہ میر تقی میر سے اصلاح لینا چاہتے تھے، مگر انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''تم امیر آدمی کے لڑکے ہو، تم کو شاعری نہیں آ سکتی۔'' تیراندازی اور شہ سواری میں کمال حاصل تھا۔ رنگیںؔ شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے۔ دکن میں نظام حیدر آباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے، لیکن بعد میں نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ گھوڑوں کے بہت اچھے معالج تھے۔ رنگیںؔ ریختی کے موجد تھے۔ ستمبر ۱۸۳۵ء میں شاہ جہاں آباد میں انتقال کر گئے۔ رنگیںؔ کے اردو کے چار دیوان ہیں۔ تیسرا دیوان ہزلیات کا ہے اور چوتھا دیوان ریختی کا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد مثنویات، منظومات اور منظوم خطوط وغیرہ کے مصنف ہیں۔

ان جیسی جامع شخصیت معاصرین میں مشکل سے ملے گی۔ ان کی قادرالکلامی، ہمہ دانی، استادی اور فن کاری میں شبہ نہیں۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منتخب اشعار

نہ مسجد میں، نہ بت خانے میں دیکھا
جو جلوہ دل کے کاشانے میں دیکھا

جو نالہ رات کو لب سے نہ ہٹ گیا ہوتا
تو ساتھ آہ کے سینہ بھی پھٹ گیا ہوتا

قسم ہے ایک عالم کو رُلا دیتا ہے اے رنگیںؔ!
وہ اُس کی جھڑکیاں کھا کر ترا مجبور ہو جانا

رہروانِ عدم! ذرا ٹھہرو
ہم بھی چلتے ہیں ساتھ دم لے کر

عاشق اُس مست کے ہیں جو رنگیںؔ
کیا کریں گے وہ جامِ جم لے کر

جنھوں سے ہم نے بھلائی کری زمانے میں
عوض میں اُس کے پھر اُن سے برائیاں دیکھیں

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناو کاغذ کی کہیں چلتی نہیں

کہنا ترا ہمارے سر آنکھوں پہ ناصحا!
پر کیا کریں جو دل ہی نہ ہو اختیار میں

جھوٹا کبھی نہ جھوٹا ہووے
جھوٹے کے آگے سچّا رووے

وہ نہ آئے تو تُو ہی چل رنگیںؔ
اِس میں کیا تیری شان جاتی ہے

جو ترے پاس سے آتا ہے، میں پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی، کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے؟

کب مجھ کو بہشت کی ہے خواہش — جو کچھ دینا ہے، سو یہیں دے

اُسے ہے شوق کہانی کا ان دنوں میں بہت — یہ طور خوب ہے احوالِ دل سنانے کا

زاہد! بتا تو کعبے میں کیا دیکھتا ہے تُو — جاتے ہیں دَیر میں تو صنم دیکھتے ہیں ہم

صبح کو روٹھ کے جو گھر کو اَجی جاؤ گے — یہ تو فرماؤ، بھلا پھر بھی کبھی آؤ گے

راسخ عظیم آبادی

شیخ غلام علی نام، راسخ تخلّص۔ ولادت تقریباً ۱۷۵۷ء موضع سائیں، نزد پٹنہ۔ پہلے مرزا فدوی اور پھر ان کی وفات کے بعد میر کو کلام دکھایا۔ کلکتہ، غازی پور، لکھنؤ اور دہلی کا سفر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں ان کا قیام زیادہ رہا۔ نواب آصف الدّولہ اور غازی الدّین حیدر کی تعریف میں قصیدے کہے تھے۔ بعد میں اپنے وطن پٹنہ میں واپس آئے اور شعروشاعری کا مشغلہ جاری رہا۔ عمر کا زیادہ حصّہ مفلسی اور تنگ دستی میں گزرا۔ ۶/مارچ ۱۸۲۳ء کو وفات پا گئے اور محلّہ لودی کٹرہ، پٹنہ میں دفن ہوئے۔ ایک ضخیم کلّیات ان کی یادگار ہے جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ ایک علم عروض کے بارے میں بھی ان کی تصنیف ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

بحیثیت مجموعی راسخ ایک پُرگو اور قادرالکلام شاعر ہیں جن کی پرواز تخیل لفظوں میں رنگ بھر کر شعر کو نکھار دیتی ہے۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی)

منتخب اشعار

ہم برسوں پہ واں گئے پر اُن نے — یوں بھی نہ کہا کہ تُو کہاں تھا

زندگی سمجھا تھا جس کو، موت تھی — مجھ کو راسخ عمر بھر دھوکا رہا

جب تجھے خود آپ سے بیگانگی ہو جائے گی — آشنا تب تجھ سے وہ دیر آشنا ہو جائے گا

تھا جی میں کہ دشوارئ ہجر اُس سے کہیں گے — پر جب ملے، کچھ رنج و محن یاد نہ آیا

لاگ اُس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ! — کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

کیا بیاں ہو صاحبانِ ظرف کی تاثیرِ قرب — آب کا قطرہ صدف تک آن کر گوہر ہوا

جوانی ہنس کے کاٹی، اب پلک پر اشک چمکے ہے — جو رات آخر ہوئی، نکلا ستارہ صبحِ پیری کا

جی میں ہے، لا کے دکھاؤں کوئی بجھتا سا چراغ — اُن پہ احوالِ زبوں کچھ تو ہو روشن اپنا

ضبطِ گریہ تو ہے پر دل میں جو اِک چوٹ سی ہے — قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

بازارِ جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا
لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنس وفا ہم

آنے میں سدا دیر لگاتے ہی رہے تم
جاتے رہے ہم جان سے آتے ہی رہے تم

باوجودِ دل نظر آؤ نہ تم حیرت ہے یہ
آئینہ پاس اور ہم دیدار کو ترسا کریں

تمھاری بات تو راسخؔ سمجھ میں کچھ نہیں آتی
گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو

راسخؔ خودی کو دخل نہیں بزمِ یار میں
یوں جاؤ واں کہ اپنے تئیں بھی خبر نہ ہو

حالِ دلِ شکستہ تم بن یہ ہے کہ جیسے
ہیئت بگڑ گئی ہو ٹوٹے ہوئے مکاں کی

اُٹھا سکتے نہیں بے طاقتی کا بار بھی اب ہم
ہوئے ہیں ناتواں ایسے کہ جینا تک بھی بھاری ہے

صبح سے ہے بے تابی دل کو، آہ، نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھیے، کیا ہو شام تلک، جی آج بہت گھبراتا ہے

ہونٹ ہیں سوکھے، تر ہیں آنکھیں، زرد ہے چہرہ، راسخؔ آہ
بندے سے صاحب حال تمھارا اب نہیں دیکھا جاتا ہے

ہے اسیرانِ محبت کی رہائی دشوار
ہائے، یہ لوگ تو مر کر بھی گرفتار رہے

حسن، خواجہ حسن

نام خواجہ حسن، حسن تخلّص۔ وطن دہلی۔ بڑے لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھے۔ موسیقی سے بہت شوق تھا۔ جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ اکثر مقطعوں میں اپنے معشوق کا نام لیا کرتے تھے۔ مرزا حسن رضا نواب سرفراز الدولہ سے وابستہ رہے۔ قلندر بخش جرأت، جو اُن کے بڑے دوست تھے، انھوں نے خواجہ حسن اور بخشی طوائف کی داستانِ عشق ایک مثنوی میں نظم کی ہے۔ وفات ۱۸۲۶ء۔ صاحبِ دیوان تھے۔

منتخب اشعار

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا
کھڑا اُس پہ میں جان وارا کیا

امنڈ کے آنکھوں سے یک بار بہہ چلے آنسو
ہنسی ہنسی میں جو ذکرِ وداعِ یار ہوا

امین، خواجہ امین الدّین

خواجہ امین الدّین نام، امین تخلّص۔ وطن عظیم آباد تھا۔ بلاس رائے اخلاص کے شاگرد تھے۔ ملازم سرکار نواب مرشد آباد۔ کچھ دنوں نواب مظفر جنگ سیّد محمد رضا خاں کے مصاحب رہے۔ ۱۸۴۰ء کے قریب زندہ تھے۔ اردو اور

فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

منتخب اشعار

گالیاں غیر سے سناتے ہو — ہاں میاں! اَور تم سے کیا ہوگا

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی — عمر کٹنے کو کٹی، پر کیا ہی خواری میں کٹی

فراق، ثناء اللّٰہ

حکیم ثناء اللّٰہ خاں نام، فراق تخلّص۔ ولادت تقریباً ۵۵-۱۷۵۴ء دہلی۔ خواجہ میر درد کے مرید اور شاگرد تھے۔ ہدایت اللّٰہ ، ہدایت اور سودا کو بھی کلام دکھایا تھا۔ ہدایت اللّٰہ ، ہدایت کے بھتیجے تھے۔ حکیم قدرت اللّٰہ قاسم سے طب کی درسی کتابیں پڑھیں۔ انھی کے مطب میں نسخہ نویسی کی۔ اس فن میں ایسی استعداد بہم پہنچائی کہ کچھ دنوں کے بعد ان کا شمار دہلی کے نامور طبیبوں میں ہونے لگا۔ ۱۸۲۶ء اور ۱۸۳۱ء کے درمیان وفات پاگئے۔ ایک ضخیم دیوان اردو ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

منتخب اشعار

انگلیاں گھس گئیں یاں ہاتھوں کو ملتے ملتے — لیکن افسوس، نوشتہ نہ مٹا قسمت کا

جس پہ گزرے ہے، سو ہی جانے ہے — حال پوچھو ہو کیا مرا یارو!

رات دن غم زدہ پھرے ہے فراقؔ — اُس کو کیا جانے کیا ہوا یارو!

چین دن کو نہ رات کو ہے قرار — اِس دلِ بے قرار نے مارا

سمجھے تھے دامِ زلفِ سیہ ہے بلائے جاں — پر کیا کریں کہ لے گئی تقدیر کھینچ کر

کس زلف کا شیدا ہے مرا دل، نہیں معلوم — کس چشم کا زخمی ہے یہ بسمل، نہیں معلوم

جس کا دھڑکا تھا مرے جی میں فراقؔ — ہجر کی راتیں وہی پھر آئیاں

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں — بھولے سے اُس نے یاد کیا ہو، عجب نہیں

لے کر نقاب مُنہ پر، دیکھے ہے چوری چوری — عینِ حجاب میں بھی، کیا بے حجابیاں ہیں

ہرگز فراقؔ اُس کی تقصیر کچھ نہیں ہے — اِس دل کے چاہنے کی ساری خرابیاں ہیں

کبھی یہ تم نے نہ پوچھا فراقؔ سے پیارے! — کہ میرے عشق میں کیا تجھ پہ ماجرا گزرا

جس دم گیا وہ چھوڑ کے تنہا مجھے فراقؔ — میں دیکھتا ہوا در و دیوار رہ گیا

خواب سے چونکا جو، اُس کو دیکھ حیران رہ گیا
گاہ موندوں تھا، گہے کھولوں تھا سَو سَو بار چشم

احوالِ دل میں گو نہیں کہتا زبان سے
صورت سے میری دیکھ کے پہچان جائیے

شاداں، چندو لال

نام چندو لال، شاداں تخلص۔ ''راجا راجایان'' اور ''مہاراجا بہادر'' خطاب۔ قوم کھتری۔ ولادت تقریباً ۱۷۶۳ء۔ چندو لال کے باپ کے مرنے کے بعد اس کے چچا نانک رام نے پرورش کی اور عمدہ تعلیم دلائی۔ چندو لال محنتی، جفاکش اور فہم و فراست میں یکتائے روزگار تھے۔ انھوں نے اپنی ہوشیاری سے دربار آصف جاہی میں رسائی پیدا کی۔ ۱۸۰۴ء میں ترقّی کر کے پیش کاری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس زمانے میں نواب منیر الملک وزیر تھے۔ ان کی نالائقی کی وجہ سے سارا انتظام ملکی و مالی چندو لال کے ہاتھ میں آ گیا۔ چندو لال کی سخاوت و فیاضی کے کارنامے زبان زدِ عام تھے۔ وہ صبح سے ۱۲ بجے تک سلطنت کے کام میں مشغول رہتے، اس کے بعد شعرا و علما حاضر ہوتے۔ ان سے مشاعرہ و مذاکرہ رہتا۔ تقریباً پچاس برس پیش کاری کی خدمت انجام دینے کے بعد ۱۸۴۴ء میں مستعفی ہوئے اور ۱۸۴۵ء میں بیاسی برس کی عمر میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں مشقِ سخن کرتے تھے۔

منتخب اشعار

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا
کچھ تو اے موسیٰ! کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

آتا نہیں جو سامنے مارے حجاب کے
ہم دل سے ہیں نثار اُسی آفتاب کے

بھروسا ہے ترا ہی، اَور ہے تیرے سوا کس کا
نہ دیوے آسرا جب تُو، مجھے ہو آسرا کس کا

نیکی کا کوئی کام ہی آیا نہیں مجھ سے
کیا ہووے گا انجام مرا، کچھ نہیں معلوم

ممنون، میر نظام الدّین

میر نظام الدّین نام، ممنون تخلص۔ میر قمر الدّین منّت کے فرزند تھے۔ ان کے آبا و اجداد سونی پت کے رہنے والے تھے، مگر ممنون کی ولادت تقریباً ۱۷۶۶ء میں دہلی میں ہوئی اور وہیں نشو و نما ہوئی۔ اپنے والد کے شاگرد تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو ''فخر الشعرا'' کا خطاب عطا کیا۔ ممنونؔ لکھنؤ بھی گئے جہاں سرکار اودھ نے ان کی خاطر خواہ

قدردانی کی۔ برٹش گورنمنٹ نے انھیں اجمیر میں صدرالصدور کے عہدے پر فائز کیا۔ کبرسنی میں دلّی جا کر خانہ نشین ہو گئے اور وہیں مارچ ۱۸۴۵ء میں انتقال ہوا۔ کلّیاتِ میر نظام الدّین ممنون، مرتبہ ڈاکٹر صدیقہ ارمان، ناشر الوقار پبلیکیشنز، لاہور، شائع ہو گئی ہے۔

منتخب اشعار

خاموش ہم زباں! یہ لیا تُو نے کس کا نام — دل میں اُٹھی وہ ہوک کہ دَم سا نکل گیا

الٰہی! وہ جو وعدے تھے، وفا کس طرح سے ہوں گے — نہ واں خو یاد آنے کی، نہ شیوہ یاں تقاضا کا

یہ نہ جانا تھا کہ اُس محفل میں دل رہ جائے گا — ہم یہ سمجھے تھے، چلے آئیں گے دم بھر دیکھ کر

رات تھوڑی، حسرتیں دل میں بہت — صلح کیجیے، بس لڑائی ہو چکی

پُر درد کوئی شعر پڑھا، آہِ سرد کی — اِس مشغلے میں رات ہماری گزر گئی

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنوںؔ — وہی فتنہ ہے، لیکن یہ ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

سخت کچھ افسردہ و دل گیر سے رہتے ہو تم — خیر باشد میر ممنوںؔ! تم پہ کیا افتاد ہے؟

مرزا، حکیم میر فضل اللہ

نام حکیم میر فضل اللہ، مرزا تخلص۔ مرزا ائینا کے نام سے مشہور تھے۔ پانی پت کے رہنے والے تھے۔ طب کے ماہر تھے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ۱۸۳۶ء سے پہلے انتقال ہو گیا۔

منتخب اشعار

دل جو اپنا تھا، سو ہے بیگانہ — اِس زمانے میں کوئی یار نہیں

سخت مشکل ہے ہجر میں جینا — زندگی اپنے اختیار نہیں

ہوس، مرزا محمد تقی

نام مرزا محمد تقی خاں، ہوس تخلص۔ ۶۷-۱۷۶۶ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ نشو و نما لکھنؤ میں ہوئی۔ ہوسؔ نواب آصف الدّولہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ لکھنؤ میں مفتی گنج میں رہتے تھے۔ فیض آباد اور لکھنؤ دونوں جگہ بعض

شعرا ان کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے۔ میر حسن اور طالب علی خاں عیشی خاص طور پر مشہور ہیں۔ ہوسؔ آغازِ جوانی ہی سے شعر و سخن کی طرف راغب تھے اور میر حسن سے اصلاح لیتے تھے۔ میر حسن کے انتقال کے بعد مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدّین حیدر کی مدح میں انھوں نے قصائد لکھے۔ ان کا ایک قلمی دیوان نواب سالار جنگ، حیدر آباد (دکن) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ۳۶-۱۸۳۵ء میں وفات پا گئے۔ ہوسؔ نے ''اردو دیوان'' کے علاوہ ایک مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' اور مثنوی ''گل وصنوبر'' کے نام سے تصنیف کی ہے۔

منتخب اشعار

ترے ڈر سے میں آہ کا ضبط کیا، ولے گریہ کا ضبط تو ہو نہ سکا
بہے چپکے ہی چپکے نت آنسو مرے پہ میں کھول کے دل کبھی رو نہ سکا

عاشق تو تھا ہوسؔ، کہو، دیوانہ کب ہوا
لو اُٹھ گیا حجاب، بڑا ہی غضب ہوا

یارانِ رفتہ بھول گئے ہم کو اے ہوسؔ
رہ میں کسی نے لُوٹ لیا کارواں کو کیا؟

گذشتگانِ زمانے کا تم نہ وصف کرو
یہی غم و الم اُس روزگار میں بھی تھا

کیا جانے دل ہی دل میں وہ کرتا تھا کس کا ذکر
ہر دم زبانِ یار پہ 'یادش بخیر' تھا

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے!
یاد آوے گی تجھے میری وفا میرے بعد

اپنے مرنے کا مجھے غم نہیں، پہ غم یہ ہے
کون ہوگا ہدفِ تیرِ بلا میرے بعد

کبھی بھادوں کا عالم ہے، کبھی ساون کی جھڑیاں ہیں
ہماری چشم سے ہجراں میں کیا کیا مینہ برستے ہیں

دیکھنے سے جن کے سیری ہی کبھو ہوتی نہ تھی
برسوں اب وہ ہم کو صورت اپنی دکھلاتے نہیں

واماندگی نے ہم کو سب سے جدا کیا ہے
یارانِ رفتگاں کو بیٹھے پکارتے ہیں

جانا تو واں کا چھوڑ دیا میں نے پر ہوسؔ
اُس کا خیال دل سے میں کیوں کر جدا کروں

گئے ہم جی سے تب اُس شوخ نے یاروں سے کہا
کچھ یہ ہم پر نہ کھلا، کیا اِسے بیماری تھی

رخصت کے وقت ہم نے ہوسؔ آہ تو نہ کی
صدمے ہماری جان پہ، لیکن گزر گئے

منع کیوں کرتا ہے ناصح، آہ و زاری سے ہمیں
ہم سے کس دن خوش تھے وہ، جواب خفا ہو جائیں گے

کہاں کی نیند آ گئی ہے ایسی مسافرانِ رہِ عدم کو
کچھ ایسے سوئے کہ پھر نہ چونکے، تھکے انھیں ہم جگا جگا کر

صبا، لالا کانجی مل

نام لالا کانجی مل، صبا تخلص۔ ذات کے کائستھ سکسینہ تھے۔ وطن فیروز آباد۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش ہوئی۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ ۲۵ سال کی عمر میں دق کے مرض میں وفات پائی۔ یہ واقعہ ۹۵-۱۷۹۴ء سے قبل کا ہے۔

منتخب اشعار

نہیں معلوم اے یارو! صبا کے دل میں کیا آیا ۔۔۔ ابھی جو بیٹھے بیٹھے وہ یکا یک آہ کر اُٹھا

صبا ہم نے تو ہرگز کچھ نہ دیکھا جذبِ الفت میں ۔۔۔ غلط یہ بات کہتے ہیں کہ دل کو راہ ہے دل سے

منتظر لکھنوی

نام میاں شیخ نور الاسلام عباسی، منتظر تخلص۔ تقریباً ۶۹-۱۷۶۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ حکیم نثار احمد علوی مؤلف ''سخنورانِ کاکوری'' کی تحقیق کے مطابق ان کا تعلق کاکوری سے تھا۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ فارسی کے علاوہ عربی سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ آغاز جوانی میں کسی محبوب کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے محبوب کا تصور دل میں رہتا اور دیوانوں کی طرح فکرِ سخن میں مصروف نظر آتے۔ انشا اور مصحفی کے نزاع میں انھوں نے استاد کے دفاع میں جان کی بازی لگا دی تھی۔ وہ ۳۰ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۱۸۰۳ء میں سِل میں مبتلا ہو کر دنیا سے اُٹھ گئے۔ مصحفی کو اپنے اس باوفا اور جاں نثار شاگرد کی بے وقت وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ منتظر نواب آصف الدّولہ کی سرکار میں توپ خانے کی خدمت پر مامور تھے۔

منتخب اشعار

دن زندگی کے چشم زدن میں گزر گئے ۔۔۔ جھونکے ہوا کے تھے، اِدھر آئے، اُدھر گئے

میں آگے تو دیوانہ اِتنا نہ تھا ۔۔۔ خدا جانے، کیا مجھ کو اب ہو گیا

تھا عجب رنگِ گلشنِ ہستی ۔۔۔ ساتھ ہر گل کے ایک خار بھی تھا

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ ۔۔۔ سن رکھو تم، فسانہ ہیں ہم لوگ (۱)

---

(۱) مرزا غالب نے اپنے ایک خط، بنام ہرگوپال تفتہ، میں اس شعر کو مندرجۂ ذیل شکل میں رجب علی بیگ سرور سے منسوب کیا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ

یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

اصل شعر اوپر درج ہے جو منتظر لکھنوی کا ہے، بحوالہ: ''سخنورانِ کاکوروی'' مرتبۂ نثار احمد علوی، مے خانۂ ادب، کراچی، ص ۳۷۷

چندا، ماہ لقا

نام چندا بی بی، ماہ لقا بائی خطاب، چندا تخلص۔ ۱۸ اپریل ۱۷۶۸ء کو حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئی۔ ایک خوبصورت طوائف تھی جسے موسیقی میں خاص دستگاہ حاصل تھی۔ اکثر تذکرہ نویس شیر محمد خاں ایمان کا شاگرد بتاتے ہیں جبکہ میر عالم بہادر اسے اپنا شاگرد کہا کرتے تھے۔ ماہ لقا نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ یہ ہمیشہ سیکڑوں سپاہیوں کے باڈی گارڈ کے آگے اسلحہ لگائے گھوڑے پر سوار سیر وتفریح کو نکلا کرتی تھی۔ اردو کی یہ پہلی دیوان شاعرہ ہے۔ وفات ۳۴-۱۸۳۳ء حیدر آباد (دکن)۔

منتخب اشعار

اُن کو آنکھیں دکھا دے ٹک ساقی! — مانگتے ہیں جو بار بار شراب

گل کے ہونے کی توقع پہ جیے بیٹھی ہے — ہر کلی جان کو مٹھی میں لیے بیٹھی ہے

کبھی صیّاد کا کھٹکا ہے، کبھی خوفِ خزاں — بلبل اب جان ہتھیلی پہ لیے بیٹھی ہے

تیر وتلوار سے بڑھ کر ہے تری ترچھی نگہ — سیکڑوں عاشقوں کا خون کیے بیٹھی ہے

تشنہ لب کیوں رہے، اے ساقیٔ کوثر! چندا — یہ ترے جامِ محبت کو لیے بیٹھی ہے

صفا، منولال

نام منولال، صفا تخلص۔ قوم کائستھ، سکسینہ۔ منولال صفا مہاراجا جھاؤ لال، نائب آصف الدّولہ کے داماد تھے۔ شاہی اخبار نویسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ پہلے میر کے شاگرد ہوئے۔ میر کے انتقال کے بعد مصحفی سے رجوع کیا۔ فارسی میں مینڈو لال زار سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ صفا خطاطی کی اکثر اقسام میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے:

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں

مضطر، رام رتن

نام پنڈت رام رتن خلفِ پنڈت شیو پرشاد۔ تخلّص مضطر۔ وطن دہلی۔

وہی اِک رشتہ ہے زنّار اور تسبیح میں مضطر
یہ کیا مہمل سے جھگڑے پڑ گئے ہیں کفر و ایماں میں؟

سلیمان، مرزا سلیمان شکوہ

مرزا سلیمان شکوہ نام، سلیمان تخلّص۔ ولادت قلعۂ معلّٰی دہلی۔ شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔ باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ جب غلام قادر روہیلہ کی نمک حرامی کے باعث شاہ عالم اپنی بصارت کھو بیٹھے تو مرزا سلیمان شکوہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ نواب آصف الدّولہ نے اخراجات کے لیے چھ ہزار روپیہ ماہوار مقرر کر دیا تھا۔ جب غازی الدّین حیدر نے تاج شاہی پہنا تو شہزادے نے مصلحتاً اپنی بیٹی کی شادی مرزا نصیر الدّین حیدر، ولی عہد سلطنت کے ساتھ کر دی۔ انھوں نے سلطان بہو کا خطاب پایا۔ مرزا سلیمان شکوہ شاعروں کے قدردان تھے، چناں چہ مصحفی، انشا، رنگیں، جرأت ان کے دربار سے وابستہ رہے۔ مرزا سلیمان کافی عرصہ لکھنؤ میں قیام کے بعد کاسگنج اپنے دوست کرنل گارڈنر کے پاس چلے گئے۔ بعد میں اکبر آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں کئی بار دلّی آئے۔ ابتدا میں شاہ حاتم کو کلام دکھایا۔ اس کے بعد مصحفی اور انشا سے اصلاح لی۔ ۲۴ر فروری ۱۸۳۸ء کو اکبر آباد میں انتقال کر گئے اور سکندرہ میں دفن ہوئے۔ مرزا سلیمان شکوہ اردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔

منتخب اشعار

رہ گئے ہوش و حواس و خرد و طاقت، سب — یوں ترے کوچے سے میں بے سر و ساماں نکلا

ترے بیمار کی سنتے ہیں یہ حالت ہے کہ اب — جو گیا اس کی خبر کو سو وہ گریاں نکلا

جان دی راہِ محبت میں الٰہی، صد شکر — بات جو ہم نے کہی تھی سو نباہی، صد شکر

کبک رفتار اپنی بھول گئے — دیکھ اُس کے خرام کا عالم

تاج و تخت اپنے سلیمان کو یا شاہِ نجف — آپ چاہیں تو ابھی پل میں دلا سکتے ہیں

غیر کا نام جو تم پیار سے لیتے ہو تو بس ایک برچھی ہے کہ پہلو میں چبھو دیتے ہو

شفیق، لچھمی نرائن

رائے لچھمی نرائن نام، شفیق تخلص۔ ذات کھتری۔ ۷۲-۱۷۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نظام الملک آصف جاہ کے عہد میں پیش کارِ صدارتِ صوبۂ دکن تھے۔ شفیق نے فارسی، عربی صرف ونحو کی تعلیم پائی۔ سنِ شعور سے شعر وسخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ پہلے صاحب تخلص کرتے تھے۔ بعد میں شفیق ہوئے۔ ''دکن کی تاریخ،'' ''خاندانِ آصف جاہ کی تاریخ،'' ''مرہٹوں کی تاریخ،'' ''حالاتِ حیدر آباد'' وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ ''گلِ رعنا'' (فارسی شعرا کا تذکرہ) اور ''چمنستانِ شعرا'' (اردو شعرا کا تذکرہ) ان کی یادگار ہیں۔ ان کا حسبِ ذیل شعر ملاحظہ فرمائیے:

ہمیں کنجِ قفس میں چھوڑ کر صیّاد جاتا ہے
خدا جانے کہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

ناسخ، شیخ امام بخش

نام شیخ امام بخش، ناسخ تخلص۔ ۱۰ر اپریل ۱۷۷۲ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص مسمیٰ خدا بخش خیمہ دوز نے، جو لاہور کا ایک دولت مند سوداگر تھا اور اس کی کوئی اولاد نہ تھی، ان کو متبنّیٰ کر لیا تھا۔ ناسخ سے اُسے اولاد کی طرح محبت تھی اور ان کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا۔ محمد عیسیٰ تنہا جو مصحفی کے شاگرد تھے، ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے تن وتوش اور قوی ہیکل آدمی تھے۔ خوراک بہت تھی۔ تمام عمر مجرد رہے۔ بہت وضع دار آدمی تھے۔ غازی الدّین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ گئے۔ بادشاہ موصوف ان کو دربار سے متعلّق کرنا چاہتے تھے اور ملک الشعرا کا خطاب دینا چاہتے تھے۔ ناسخ نے خطاب قبول نہیں کیا۔ بادشاہ کو غصہ آ گیا اور ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ سے الہٰ آباد گئے۔ راجا چندو لال دیوان سلطنت آصفیہ، حیدر آباد (دکن) ان کو دکن کی دعوت دی، مگر وہ وہاں نہیں گئے۔ فیض آباد، الہ آباد، بنارس، کانپور اور پٹنہ میں تھوڑے عرصے قیام کیا۔ ۳۳-۱۸۳۲ء میں پھر لکھنؤ واپس آئے وہاں ۱۵ر اگست ۱۸۳۸ء کو انتقال کر گئے۔ دو دیوان ان کی یادگار ہیں۔ وزیر، بحر، برق، رشک، منیر اُن کے شاگرد تھے۔ ناسخ کو دبستان لکھنؤ کا بانی، زبان دان اور زباں شناس کہا گیا ہے۔

تاریخ گوئی میں ان کو خاص ملکہ تھا۔

ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شائستہ بنا دیا۔ آج تمام شعرا اسی زبان کے مقلد ہیں۔

(عبدالسلام ندوی)

انھوں نے شعر کہنے میں بڑا دماغ لڑایا اور دل محفوظ رکھا۔ (ایک نقاد)

منتخب اشعار

دم بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا جوں ہی سن سے نکل گیا

مانعِ صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں
دل دُکھا دیتا ہے میرا ٹوٹ جانا خار کا

پیری میں کسے زیست کی اُمید ہے ناسخ
ناداں! کوئی جھونکا ہے نسیمِ سحری کا

عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا
سیر کے قابل جو تھا، دل کا بیاباں رہ گیا

کب سے ناسخ کی جستجو تھی مجھے
آج وہ خانماں خراب ملا

او محتسب! سمجھ کے تُو شیشے کو توڑیو
دل بھی نہ ٹوٹ جائے کسی بادہ خوار کا

ہم ضعیفوں کو کہاں آمد و شد کی طاقت
آنکھ کی بند، ہوا کوچۂ جاناں پیدا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں
سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اُڑا کے ساتھ یہ مشتِ غبار لیتا جا
مجھے رکاب میں، او شہسوار! لیتا جا

بے خودی میں یہ کون یاد آیا
خود بخود دل ہے بے قرار اپنا

کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے
نہیں پاتے کہیں سراغ اپنا

تمام عمر یوں ہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا

لب ریز اُس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا
بنتا ہے عکسِ رُخ سے کٹورا گلاب کا

کہتے ہیں تیرے عارض و قامت کو دیکھ کر
بالائے سرو پھول کھِلا ہے گلاب کا

تُو نہیں ملتا تو ہم بھی تجھ سے اب ملتے نہیں
سنگ دل! ہم نے بھی اپنے دل کو اب پتھر کیا

کیا روزِ بد میں ساتھ رہے کوئی ہم نشیں
پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دُور

وہ نہیں بھولتا، جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں، کہاں جاؤں

یاد آتی ہیں ہمیں جان! تمھاری باتیں
ہائے وہ پیار کی آواز، وہ پیاری باتیں

زندگی زندہ دلی کا ہے نام — مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں!

سر رکھ کے کبھی وہ سو گیا تھا — اب تک زانو کو سونگھتا ہوں

آئینۂ دل میں ہے ترا عکس — دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

شبہہ ناسخؔ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں — آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میرؔ نہیں

گرچہ میں تجھ سے دُور ہوں، لیکن — تُو تو اے جان! مجھ سے دُور نہیں

گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھ کو — اب اُس کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں

تیری صورت سے کسی کی نہیں صورت ملتی — ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

تلاش جس کی ہے دن رات تجھ کو اے غافل! — چھُپا ہوا ہے وہ تیرے ہی تن کے پردے میں

گر آنکھ ہے تو باطنِ انساں کی دید کر — کیا کیا طلسم دفن ہیں مشتِ غبار میں

ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں — جی نہ آبادی میں لگتا ہے، نہ ویرانے میں

جس قدر ہم سے تم ہوئے نزدیک — اُس قدر دُور کر دیا ہم کو

میں خوب سمجھتا ہوں، مگر دل سے ہوں ناچار — اے ناصحو! بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھ کو

ہجر میں مضطر ہوں، لیکن ہے وہی اخفاے راز — چپکے رو لیتا ہوں گنگا کے کنارے رات کو

معشوقوں سے اُمیدِ وفا رکھتے ہو ناسخؔ — ناداں کوئی دنیا میں نہیں تم سے زیادہ

جنوں پسند بھی کیا چھاؤں ہے ببولوں کی — عجب بہار ہے اِن زرد زرد پھولوں کی

بھول کر او چاند کے ٹکڑے! اِدھر آ جا کبھی — میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

دشتِ غربت ہم نے دیکھا ہی نہیں — دھیان میں دن رات اپنا شہر ہے

وہ پری پیکر کہا کرتا ہے اکثر فخر سے — اب تو ناسخؔ بھی ہمارے چاہنے والے ہوئے

دشتِ غربت میں نگاہ اپنی جدھر جاتی ہے — وہی کوچہ، وہی بازار نظر آتا ہے

پہروں پھر بات مرے مُنہ سے نکلتی ہی نہیں — یاد آ جاتی ہے تیری جو کوئی بات مجھے

پوچھ اے ناسخؔ! نہ کچھ میری اداسی کا سبب — آپ مَیں دن رات حیراں ہوں، ہوا ہے کیا مجھے

کیوں سبک کرتا ہے واں لے جا کے اے بے چین دل! — میرا ہونا اُس کی ساری انجمن پر بار ہے

کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے — کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

شبِ فراق گئی، روزِ وصل آ پہنچا — طلوعِ صبح ہے، عالم تمام روشن ہے

ناسخ ہر ایک ملک کی ہوتی ہے اَور رسم — آزردہ وضعِ دہر سے ہم بے سبب رہے

مسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے — تماشا ہے، تہِ آتش دھواں ہے

آتا ہے رحم کافر و مومن کے حال پر — بت محوِ ناز ہے تو خدا بے نیاز ہے

طپش، مرزا جان

مرزا محمد اسماعیل نام، عرفیت مرزا جان اور طپش تخلّص تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت زبان کی تحصیل بھی کی۔ شعر گوئی ۱۶ برس کی عمر سے شروع کی۔ فنِ سخن میں طپش کے تین استاد تھے۔ ۱۔ مرزا محمد یار بیگ سائل، ۲۔ خواجہ میر درد اور ۳۔ ہدایت اللہ خاں ہدایت۔ طپش نے خوش نویسی میں کمال پیدا کیا تھا اور اپنے عہد کے نامور خطاطوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پیشۂ آبا سپہ گری کی مناسبت سے مرزا جہاں دار شاہ کی فوجی کمان کے ایک افسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ لکھنؤ سے جب مرزا جہاں دار شاہ بنارس گئے تو طپش بھی ساتھ تھے۔ جہاں دار شاہ کے انتقال کے بعد طپش ڈھاکے میں نواب شمس الدّولہ سیّد احمد علی خاں کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ طپش نے اردو محاورات، روز مرّہ اور ضرب الامثال پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" رکھا۔ طپش ڈھاکے سے کلکتے گئے اور فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے۔ فورٹ ولیم کالج میں رہ کر طپش نے ایک مثنوی میر حسن کی تقلید میں لکھی اور "بہارِ دانش" نام رکھا اور اپنا دیوان مرتب کیا۔ تقریباً ۱۸۱۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

منتخب اشعار

کیا جانیے، کس نے تجھے محبوب بنایا — پر جس نے بنایا ہے، بہت خوب بنایا

جب کہیں غنچۂ پژمردہ نظر آتا ہے — دل سمجھ کر اُسے چھاتی سے لگا لیتے ہیں

نہ شہر بھاوے، نہ صحرا لگے بھلا مجھ کو — الٰہی! بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوا مجھ کو

آپ کچھ مذکور پر میرے ہی ہوتے ہیں خفا — میں یہ حیراں ہوں کہ یارب! میں نے کیا تقصیر کی

ظفر، بہادر شاہ

میرزا ابوالمظفر سراج الدّین نام، بہادر شاہ لقب، ظفر تخلّص۔ ۱۷۷۵ء میں لال قلعہ، دہلی میں پیدا ہوئے۔

اپنے والد اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھے۔ شعروشاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ ان کی حکومت دہلی میں لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔ چوں کہ سلطنت کا کام کاج کچھ نہیں تھا اس لیے زیادہ تر وقت شعروسخن میں گزرتا تھا۔ شاہ نصیر، میر کاظم حسین، بے قرار، ذوق اور غالب سے تلمذ حاصل تھا۔ بہت اچھے خوش نویس تھے۔ اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآنِ شریف دلّی کی بڑی مسجدوں میں بطور ہدیہ بھیجتے تھے۔ موسیقی میں بھی ان کا اچھا خاصا دخل تھا۔ ان کی اکثر ٹھمریاں شمالی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد انگریزوں نے انھیں جلاوطن کر کے رنگون میں قید کر دیا تھا۔ جوان بیٹے اور پوتے ان کی آنکھوں کے سامنے گولی مار دیے گئے۔ ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں انتقال کر گئے۔ چار دیوان ان کی یادگار ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی تمام زندگی رنج وغم میں گزری۔ ان مصائب وآلام کا اثر ان کے کلام سے نمایاں ہے۔

منتخب اشعار

کارواں منزل پہ پہنچا اور سارے ہم سفر ؎ مثلِ گردِ کارواں اِک مَیں بھٹک کر رہ گیا

ہر نفس اس دامنِ مژگاں کی جنبش سے ظفرؔ ؎ دل میں اِک شعلہ سا بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا

مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پہ رنج وملال تھا ؎ وہ جب آ گیا مرے سامنے، نہ تو رنج تھا، نہ ملال تھا

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا ؎ کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

نہ پوچھ مجھ سے ظفرؔ میری تُو حقیقتِ حال ؎ اگر کہوں گا، ابھی تجھ کو میں رُلا دوں گا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے اَوروں کے عیب وہنر ؎ پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانیے گا، وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا ؎ جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر! ؎ تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا

ہے عشق کی منزل میں یہ حال اپنا کہ جیسے ؎ لُٹ جائے کہیں راہ میں سامان کسی کا

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا ؎ اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفرؔ آج دل کی آگ ؎ آگے تو شعلہ سا کئی بار اُٹھ کے رہ گیا

تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں ؎ ہم نے تمھاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں ؎ کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

اِن حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں ؎ اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے ؎ دو گز زمین بھی نہ ملی کوے یار میں

دل دے کے اُن کو ایسی اذیّت ہوئی ہمیں
اب دل کبھی نہ دیں گے، نصیحت ہوئی ہمیں

اُمنڈ آتا ہے دل جس وقت، کب روکے سے رکتا ہے
مجھے رونے دو یارو! میرے آنسو پونچھتے کیوں ہو؟

نہیں معلوم ظفرؔ اُن سے ہوئیں کیا باتیں
چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

پاے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آوازِ سلاسل، کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل! کبھی ایسی تو نہ تھی

اے وائے انقلاب! زمانے کے جور سے
دلّی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

جو اُس کی جان پر گزرے ہے وہ ہی جانے ہے
خدا کسی کو جہاں میں کسی کے بس نہ کرے

خدا بچائے ظفرؔ دوستی سے اِس دل کی
جو ہو یہ دوست تو حاجت نہیں عدو کی مجھے

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

خوابِ عدم سے چونکے ہیں مشتاق ہم ترے
دیکھا نہ تجھ کو اور اسی حسرت میں سو گئے

گر نہیں ہے ربط کچھ باہم تو پھر محفل میں شب
تم اُنھیں اور وہ تمھیں کیوں اے ظفرؔ دیکھا کیے

فراسو، فرانس گاٹلیب کوئیس

نام فرانس گاٹلیب کوئیس، تخلّص فراسو۔ ۱۷۷۷ء میں شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے ظفریاب خاں کی سالی سے شادی کی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد فراسو نے ظفریاب خاں کی سرپرستی میں زندگی گزاری۔ بیگم شمرو عرفیت زینت النسا بیگم ایک عرب لڑکی تھی جس نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ سردھنہ کی حکمران بنی۔ فراسو کی حیثیت سردھنہ کے حکمران خاندان کے فرد کی تھی۔ اکثر یورپین شعراے اردو کا تعلّق بیگم شمرو کے دربار سے تھا۔ چناں چہ فراسو کی تربیت شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ فراسو نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ خیراتی خاں دلسوز کے شاگرد تھے۔ فراسو سرکارِ برطانیہ میں سولہ برس ریونیو کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ ایک کُلّیات ان کی یادگار ہے جو زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکی۔ لالا سری رام کے کتب خانے میں موجود تھی۔ حسرت موہانی نے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے۔ کُلّیات کے علاوہ ''قصہ عشق افزا'' بھی ان کا ادبی کارنامہ ہے۔ فراسو ۱۸ر جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال کر گئے ان کی قبر میرٹھ میں ہے۔

منتخب اشعار

پھبتا ہے کیا ہی تجھ کو اے یار! مسکرانا — ٹک واسطے خدا کے اِک بار مسکرانا

یار سے دُور ہو گئے ہیں ہم — سخت رنجور ہو گئے ہیں ہم

رکھ اُس کے تصوّر میں سدا دیدۂ تر بند — لازم ہے کہ کاشانۂ خلوت کا ہو در بند

تسلّی، لالا ٹیکا رام

لالا ٹیکا رام نام، تسلّی تخلص۔ ولادت ۷۴-۱۷۷۳ء لکھنؤ۔ وطن پرگنہ کریل، ضلع ایٹہ۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۴۸ء میں حیات تھے۔

منتخب اشعار

آنکھیں سحر تلک مری در سے لگی رہیں — کیا پوچھتے ہو حال شبِ انتظار کا

گو دل میں خفا ہے تُو، پر اِس بات کو ناداں! — کہہ بیٹھیو مت عاشقِ دل گیر کے مُنہ پر

آتش، خواجہ حیدر علی

نام خواجہ حیدر علی، آتش تخلص۔ تقریباً ۱۷۷۸ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بہت چھوٹی عمر میں باپ کا سایہ سے سر اُٹھ گیا۔ کسی بزرگ کے نہ ہونے کی وجہ سے بُری صحبت میں بیٹھ کر مزاج میں شوریدہ سری اور بانک پن پیدا ہو گیا۔ جب روزی کی فکر لاحق ہوئی تو نواب مرزا محمد تقی خاں ترقّی کی ملازمت اختیار کر لی اور انھیں کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ میں جرأت، انشا اور مصحفی کی شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ انھیں بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا اور مصحفی کے شاگرد ہو گئے اور کچھ عرصے کی محنت میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ خود صاحبِ طرز ہو گئے۔ قناعت اور توکل پسند تھے۔ بادشاہ کے یہاں سے اسّی روپیہ ماہوار ملتا تھا جس سے بہ مشکل گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی شاگرد بھی اعانت کرتے تھے۔ پہلا دیوان ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ دوسرا دیوان جو پہلے دیوان کا ضمیمہ ہے ان کے عزیز شاگرد میر دوست علی خلیل نے ان کے مرنے کے بعد مرتب کر کے پہلے دیوان میں شامل کر دیا۔ ۱۳ر جنوری ۱۸۴۷ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ میر دوست علی خلیل، صاحب مرزا شاور، میر وزیر علی صبا، نواب سیّد محمد خاں رند، مرزا شوق لکھنوی اور دیا شنکر نسیم اُن کے مشہور شاگرد تھے۔

آتش کے یہاں عام لکھنوی رنگ کے اشعار کافی ہیں، لیکن اکثر اشعار میں درد اور تاثیر ہے۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منتخب اشعار

دکھلا کے جلوہ آنکھوں نے اِک شمعِ نور کا
گُل کر دیا چراغ ہمارے شعور کا

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

باراں کی طرح لطف و کرم عام کیے جا
آیا ہے جو دنیا میں تو کچھ نام کیے جا

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصّع ساز کا

دوستوں سے اِس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

فاتحہ پڑھنے کو آئے قبرِ آتشؔ پر نہ یار!
دو ہی دن میں پاسِ الفت اِس قدر جاتا رہا

شبِ وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتشؔ جواں تھا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نکلا

لگے مُنہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجے، دہن بگڑا

سن تو سہی، جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے، نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

نہ پوچھ حال مرا، چوبِ خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں
غنیمت جان جو آرام تُو نے کوئی دم پایا

وعدہ خلاف یار سے کہیو پیام بر!
آنکھوں کو روگ دے گئے ہو انتظار کا

سامنے آئینہ رکھتے تو غش آ جاتا
تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

جب دیکھیے، کچھ اَور ہی عالم ہے تمھارا
ہر بار عجب رنگ ہے، ہر بار عجب روپ

دو گھڑی بیٹھیے، تکلیف جو کی ہے صاحب!
بعد مدّت کے تم آئے ہو اِدھر آج کی رات

نہ کسی کو کڑی کہی ہم نے
نہ کسی کی کڑی اُٹھائی بات

یہ صدا آتی ہے خموشی سے
مُنہ سے نکلی ہوئی پرائی بات

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے، دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ، بچاؤں کدھر کی چوٹ

اے عندلیب! تجھ کو مبارک ترا چمن
کس کے مزاج سے ہے موافق ہوائے گل

مری طرف سے صبا! کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بُو تیری

وفا سرشت ہوں، شیوہ ہے دوستی میرا
نہ کی وہ بات جو دشمن کو ناگوار ہوئی

نگاہِ یار کے پھرتے ہی ہم سے اے آتش!
زمانہ پھر گیا، چلنے لگی ہوا اُلٹی

کسی کا ہو رہے آتش، کسی کو کر رکھے
دو روزہ عمر کو انساں نہ رائیگاں کاٹے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

کوئی تو دوش سے بارِ سفر اُتارے گا
ہزار راہ زن اُمّید وار راہ میں ہے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

پیامبر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے، ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے، چلیے سدھاریے

نقشِ پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آ رہی
دو قدم میں راہ طے ہے شوقِ منزل چاہیے

کشتہ ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں، یاد رہے
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے!

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش!
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو، پر انساں ہووے

فصلِ بہار آئی پیو، صوفیو، شراب
بس ہو چکی نماز، مصلاّ اُٹھائیے

وہی سر کا پٹکنا ہے، وہی رونا ہے دن بھر کا
وہی راتوں کی بیداری، جو آگے تھی سو اب بھی ہے

تکلّف سے بری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بُوٹا کہاں ہے

ہر شب شبِ برات ہے، ہر روز عید ہے
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے
زمیں سے دب گئے، دبتے جو آسماں سے نہ تھے

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے (آتش)
سر چڑھتا ہے، موت آئی ہے، دیوانہ ہوا ہے (شاہ نصیر)

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے، ہو جس کے مقدّر میں
مئے الفت نہ خُم میں ہے، نہ شیشے میں، نہ ساغر میں

وحشی تھے بُوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم
نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں کرتے (1)

سر شمع ساں کٹائیے، پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو، ہمّت نہ ہاریے

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہنچے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ، نہ دامن پساریے

نظر آتی ہیں ہر سُو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

حُسنِ پری اِک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

رضا، مولوی عبدالرّضا

مولوی عبدالرّضا تھانیسری، رضا تخلّص۔ امام بخش تھانیسری کے مرید تھے۔ اُن کا مندرجۂ ذیل شعر ضرب المثل بن چکا ہے:

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
کیا بھروسا ہے زندگانی کا

وِلا، مظہر علی خاں

مرزا لطف علی معروف بہ مظہر علی خاں، تخلّص وِلا۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ وِلا کی تعلیم اچھے ماحول میں ہوئی اور انھوں نے عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی میں مہارت حاصل کی۔ انھیں شاعری سے دلچسپی تھی۔ وہ مصحفی اور ممنون کے شاگرد تھے۔ جب فورٹ ولیم کالج کا قیام ہوا تو وہ کلکتہ چلے گئے اور وہاں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش پر

(1) ''کلیاتِ آتش'' (حصۂ اوّل)، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۳۹۳

تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے۔ وہ اچھے شاعر اور بلند پایہ نثر نگار تھے۔ لیکن نہ تو ان کا دیوان چھپا اور نہ وہ کتابیں شائع ہوئیں جو انھوں نے نثر میں لکھی تھیں۔ ان کی شاعری کا ایک قلمی نسخہ کوپن ہیگن، ڈنمارک کے شاہی کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ قلمی نسخہ قصائد اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ دیوانِ ولا، ترتیب ومقدمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ادارۂ ادب وتنقید، لاہور کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہو گیا ہے۔ مظہر علی خاں ولا کی تاریخ پیدائش اور تاریخِ وفات کا صحیح علم نہیں۔ بنی نرائن جہاں کے تذکرے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۱۴ تک زندہ تھے اور کلکتہ میں مقیم تھے۔ ان کی تصانیف نثر میں یہ ہیں: ’’ہفت گلشن،‘‘ ’’مادھونل اور کام کنڈلا،‘‘ ’’بیتال پچیسی،‘‘ ’’تاریخ شیر شاہی،‘‘ ’’جہانگیر نامہ۔‘‘

منتخب اشعار

ہر گز نہ لیٹے چین، نہ بیٹھے قرار ہے — یارو! یہ کیسا روگ مجھے وہ لگا گیا
یوں تو جو چاہو وِلا پر کیجیے جَور و ستم — پر نہ وہ کیجے کہ آخر جس سے ہو رسوائیاں
دل ہے ہزار جا پر، گو دیکھنے کو یاں ہوں — یارو! نہ چھیڑو مجھ کو، کیا جانیے، کہاں ہوں
جاتا ہوں پسِ قافلہ تنہا میں بھٹکتا — کیا جانیے، کیا ہو گیا آوازِ جرس کو
بعد مدّت کے تم نظر آئے — سچ کہو، تھے کہاں، کدھر آئے
ہم کو اغیار سے نہیں شکوہ — اپنی قسمت نے نارسائی کی
کسو سے اشارہ، کسو سے ہے بات — کسو پاس رہتے ہیں جا ساری رات
نہ وہ باغ ہے، نہ وہ بزم ہے، نہ گلابی مے کی بھری رہی — کھلی آنکھ اپنی جو ناگہاں، نہ تو وہ سماں، نہ پری رہی
نہ دماغ سیرِ چمن رہا، نہ ہوائے سبزہ ذری رہی — خُمِ دل میں میرے وصال کی مئے آرزو ہی بھری رہی
ترے عشق نے یہ اثر کیا کہ جگر بھی خون ہو بہہ گیا — تُو بتا کہ روؤں کن آنکھوں سے، نہ نمی رہی، نہ تری رہی

نوازش، مرزا نوازش حسین

مرزا نوازش حسین خاں نام، عرفیت مرزا خانی، نوازش تخلّص۔ تقریباً ۱۷۷۸ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ نبیرہ نواب ناصر خاں۔ نشو ونما لکھنؤ میں ہوئی۔ میر سوز کے شاگرد تھے۔ صاحبِ دیوان ہیں، مگر ان کا دیوان چھپا نہیں۔ ایک خطی نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں ہے۔ ۱۸۵۴ء میں وفات پا گئے۔

منتخب اشعار

گھر میں ترے کودا کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا — جو ہم سے ہوا فعل، وہ رستم سے نہ ہوگا

ایک عالم کو آزما دیکھا — جس کو دیکھا، سو بے وفا دیکھا

مسافر ہیں، ہمارے پاس بیٹھو — کوئی دم میں کہاں ہم اور کہاں تم

یادگارِ گذشتگاں ہیں ہم — دیکھ لو، سن لو، پھر کہاں ہیں ہم

خدا ملے تو ملے، آشنا نہیں ملتا — کوئی کسی کا نہیں دوست، سب کہانی ہے

آغازِ عشق ہی میں شکوہ بتوں کا اے دل! — ٹک صبر کر، ابھی تو کیا کیا ستم نہ ہوں گے

معروف، نواب الٰہی بخش

نواب الٰہی بخش خاں نام، معروف تخلّص۔ وطن دہلی۔ نواب فخر الدّولہ احمد بخش خاں رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی اور غالب کے خسر تھے۔ شعر و سخن کا مذاق عنفوانِ شباب سے تھا۔ شاہ نصیر الدّین نصیر سے تلمذ حاصل تھا۔ وہ بہت سخی تھے۔ جو بھی دروازے پہ آتا لوٹ کر نہ جاتا۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد "کسی کھانے کو جی چاہتا تو آپ نہ کھاتے، بہت سا پکواتے، لوگوں کو بلاتے، آپ کھڑے رہتے، انھیں کھلاتے، خوش ہوتے اور کہتے کہ دل سیر ہوگیا۔" ۲۷-۱۸۲۶ء میں دہلی میں وفات پاگئے۔ صاحب دیوان ہیں۔

منتخب اشعار

ہوگئے تم تو میرے دشمن جاں — ایسی مَیں دوستی سے درگزرا

دردِ سر ہے، ہو کے صندل لگانے کا دماغ — اِس کا اِک گھسنا، لگانا، دردِ سر یہ بھی تو ہے

معروف اب تو دیکھتے ہو تم ہمیں غریب — ٹک مُنہ لگائے یار تو پھر ہم کو دیکھیے

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے ولے — مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے

آشفتہ، عظیم الدّین

عظیم الدّین خاں نام۔ عرفیت بھورے خاں، آشفتہ تخلّص۔ میر محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ مشہور ہے کہ نواب الٰہی بخش معروف نے سو روپیہ دے کر ان سے ایک لفظ "ہری چگ" خریدا تھا۔ ۱۷۹۲ء تک کچھ عرصہ لکھنؤ میں رہے۔

اخیر عمر میں دینوی تعلّقات ختم کر دیے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں دیوان موجود ہیں۔ ۹۸-۱۷۹۷ء میں انتقال ہو گیا۔

منتخب اشعار

عقل ہوئی اب سلب ہماری، آہ جنوں! اے واہ جنوں!
کوچے کوچے اب تو لڑکے ہم کو گھیرے پھرتے ہیں

یوں کاندھے پر زلفیں اُس کے بل کھاتی ہیں وقتِ خرام
مارِ سیہ کو ڈال گلے میں جیسے سپیرے پھرتے ہیں

جوگ لیا آشفتہ ہم نے، دیکھ لٹک اُن زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں، بال بکھیرے پھرتے ہیں

شوق لکھنوی

نام حکیم تصدق حسین خاں، عرفیت نواب مرزا، تخلّص شوق۔ تقریباً ۸۳-۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ واجد علی شاہ کے طبیب تھے۔ مثنوی ''زہرِ عشق'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ دو مثنویاں ''بہارِ عشق''، ''فریبِ عشق'' بھی لکھیں۔ دیوان غزلیات اور مجموعہ واسوخت بھی ان کی تصانیف ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ان کی مثنویاں قابل گرفت سمجھی گئی ہیں۔ ۳۰/جون ۱۸۷۱ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ شوق نے غزلیں بھی کہیں، لیکن کوئی دیوان مرتب نہیں کیا۔

> ''زہرِ عشق'' دنیا کی مشہور عشقیہ نظموں میں شامل کیے جانے کے قابل ہے۔ اس لیے اس طویل نظم پر اردو ادب جس قدر ناز کرے کم ہے۔ (فراق گورکھ پوری)

منتخب اشعار

صبح کو طائرانِ خوش الحان
پڑھتے ہیں کلُّ مَن علیہا فان

گیسو رُخ پر ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے، اب دونوں وقت ملتے ہیں

لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی
بُو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

بے اثر کب یہ چاہ ہوتی ہے
دل سے اِک دل کو راہ ہوتی ہے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے
کون، صاحب! کسی کا ہوتا ہے

موت سے کس کو رُستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے
جس کو چاہے، خدا ذلیل کرے

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

شہیدی، کرامت علی

کرامت علی نام، شہیدی تخلص۔ وطن ہڑیاپور، ضلع اناؤ (یوپی)۔ مصحفی سے مشق سخن کی، جب ان کا انتقال ہو گیا تو شاہ نصیر کو کلام دکھانے لگے۔ یار باش، زندہ دل آدمی تھے۔ سرکار انگریزی میں ملازمت اختیار کی۔ بہت بڑی رقم یار باشی میں اُڑا دیا۔ جب حساب کتاب طلب ہوا تو بہت پریشان ہوئے جس مکان میں دفتر تھا اسی کے ایک حصّے میں رہتے تھے۔ رات کو اس میں آگ لگا دی۔ ان کے سامان کے ساتھ ان کا دفتر بھی جل گیا۔ کچھ دنوں کے لیے دیوانے بن گئے اور خدا خدا کر کے جان بچی۔ سرکاری ملازمت جانے کے بعد سیر و سیاحت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ بھوپال، دہلی، اجمیر، پنجاب میں اکثر دورہ رہتا تھا۔ ان مقامات میں بہت سے دوست پیدا کر لیے تھے۔ آخری عمر میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ حج کر کے مدینہ منورہ جارہے تھے، راستے میں بیمار پڑے۔ جب روضہ اطہر سامنے نظر آیا تو ۷/اپریل ۱۸۴۰ء کو روح پرواز کرگئی۔

منتخب اشعار

خدا مُنہ چوم لیتا ہے شہیدؔی کس محبت سے
زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمد کا

یاد میری آگئی، مُنہ پھیر کر رونے لگے
انجمن میں اُن کی جب ذکرِ وفا ہونے لگا

خوب رویا بیٹھ کر واماندگی کی جان کو
جب مری نظروں سے پنہاں قافلہ ہونے لگا

مجھے عذابِ جہنّم کہ بت پرست ہوں میں
وہ بت بہشت میں، دعوا جسے خدائی کا

اندوہِ دائمی میں کٹے کس خوشی سے غم
گر مجھ کو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

عام ہیں اُس کے تو الطاف شہیدؔی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تُو کسی قابل ہوتا

وعدۂ شام پہ کی ہم نے عبث جاگ کے صبح
وہ اُسی وقت نہ آتے، اگر آنا ہوتا

اغیار کا مُنہ تھا، مجھے محفل سے اُٹھاتے!
سچ یہ ہے، تری رنجشِ بے جانے اُٹھایا

کر چکے نیم نگہ پر مرے دل کا سودا
نہ خریدو، یہ ابھی اَور بھی ارزاں ہوگا

دوستو! گر ہم سے کج خلقی ہو، رکھنا تم معاف
فرقتِ جاناں میں اپنے جی سے ہیں بیزار ہم

رحم آتا ہے مجھے اِس نوجوانی پر تری
اے شہیدؔی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

دل کے جانے کا شہیدؔی واقعہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ! گر ہم عمر بھر رویا کیے

عیش، حکیم آغا جان

نام آغا علی خاں عرفیت آغا جان، عیش تخلّص۔ تقریباً ۱۷۷۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اس زمانے کے امرا اور فارغ البال مسلم خاندانوں کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔ فن طب کی علمی اور عملی تعلیم اپنے اب وجد سے حاصل کی۔ مجرم کے شاگرد تھے۔ شاہی اور خاندانی طبیب تھے۔ خوش مزاج، صاحبِ اخلاق اور زندہ دل تھے۔ انھیں موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ عیش صبح سے دوپہر تک آنے والے مریضوں کو دیکھتے اور نسخہ لکھتے۔ دلّی کے برباد ہونے کا منظر عیش نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وفات سے پہلے تپِ محرقہ کے مرض میں بیمار ہوئے اور اسی مرض میں ہفتے بھر بیمار رہ کر ۲۶ رجون ۱۸۷۴ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔

کلّیات حکیم آغا جان عیش، مرتبہ ڈاکٹر حبیبہ بانو، ترقّیٔ اردو بیورو، نئی دہلی کے توسط سے شائع ہوگئی ہے۔

ان کا مندرجہ ذیل شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

اے شمع! صبح ہوتی ہے، روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے، اِسے بھی گزار دے

سرور، مرزا رجب علی بیگ

نام رجب علی بیگ، سرور تخلّص۔ لکھنؤ میں تقریباً ۸۶-۱۷۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ ہی میں فارسی عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اپنے زمانے کے مشہور خطّاطوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ موسیقی سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ شاعری میں آغا نوازش عرفیت، مرزا خانی سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کے دوستوں میں اور احباب کے علاوہ مرزا غالب بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ غازی الدّین حیدر کے حکم سے وہ لکھنؤ سے جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ وہ کان پور چلے گئے۔ انھیں یہ شہر بالکل اچھا نہیں معلوم ہوا۔ ۱۸۴۶ء میں واجد علی شاہ کے درباری شعرا میں داخل ہوئے۔ وہ دہلی، میرٹھ اور راجپوتانہ بھی گئے۔ ۱۸۶۲ء میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لیے کلکتہ گئے اور واجد علی شاہ سے ملے جو اس وقت مٹیا برج میں نظر بند تھے۔ بالآخر آنکھوں کا علاج لکھنؤ میں کرایا۔ اس کے بعد سرور بنارس ایشری پرشاد نرائن سنگھ کے پاس چلے گئے اور وہیں ۱۵ رمارچ اور ۱۲ راپریل ۱۸۶۹ء کے درمیان قصبہ رام نگر، بنارس میں انتقال کر گئے۔ ''فسانۂ عجائب'' ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ ''فسانۂ عجائب'' میں جو

اشعار ان کے درج ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی دیوان مرتب نہیں کیا۔ خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت کے پاس ان کا ایک غیر مرتب دیوان موجود تھا۔

منتخب اشعار

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا　　پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی (۱)

کیسی خوشی، کہاں کی ہنسی، کیسا اختلاط　　ہم کو نہ چھیڑو تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے

آزردہ، مفتی صدرالدّین

نام صدرالدّین، آزردہ تخلص۔ ۱۲؍دسمبر ۱۷۸۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا فضل امام سے فیض تربیت حاصل کی۔ اپنے زمانے کے جید فاضل اور تبحر عالم اور دہلی کے مفتی اعظم تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ان کو دستگاہ کامل تھی۔ غالب، مومن، شیفتہ ان کے احباب میں سے تھے۔ اردو میں اصلاحِ سخن پہلے شاہ نصیر سے اور پھر مجرم اکبرآبادی سے اور آخر میں میر ممنون سے لیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہ قید ہوئے اور نصف جاگیر ضبط ہوگئی۔ ۱۵؍جولائی ۱۸۶۸ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

میں اور ذوقِ بادہ کشی! لے گئیں مجھے　　یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں　　اِک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

بیمار، علی بخش

شیخ علی بخش نام، بیمار تخلص۔ ولادت ۹۰-۱۷۸۹ء، آنولہ، مضافات بریلی۔ تعلیم و تربیت وطن میں ہوئی۔ شاعری کا شوق اوائلِ عمر سے پیدا ہوگیا تھا۔ فارسی اور عربی میں بہت اچھی استعداد رکھتے تھے۔ یہ مصحفی کے بھانجے

(۱) یہ شعر میر سوز سے منسوب ہے، لیکن ''کلیاتِ میر سوز''، مرتبہ ڈاکٹر سعید علی حیدر، ادارہ تحقیقاتِ عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۷۷ء میں یہ شعر نہیں ملا۔ سرور کی ایک کتاب ''شبستانِ سرور'' میں صفحہ ۱۵ پر یہ شعر مؤلف کے نام سے ملتا ہے۔
بحوالہ: ''فسانۂ عجائب'' رجب علی بیگ سرور، مرتبہ رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۴۰۸

تھے اور لکھنؤ جا کر ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے۔ نواب سعید خاں، والیٔ رام پور نے بیمار کی خوش گوئی کی تعریف سن کر انھیں بلوا بھیجا۔ یہ رام پور پہنچے اور نواب کے اشارے کے مطابق اخوند احمد خاں غفلت کے شاگرد ہو گئے۔ آخر عمر تک رام پور میں رہے۔ ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۴ء کو انتقال کر گئے۔ بیمار کی دو تصانیف ہیں۔ ''طلسم بیضا'' اور ''دیوانِ بیمار'' امیر مینائی نے لکھا ہے کہ کلام بہت تھا، مگر تکلف ہو گیا۔

منتخب اشعار

کون پرساں ہے حالِ بسمل کا — خلق مُنہ دیکھتی ہے قاتل کا

لبِ جُو کون سیر کو آیا — موج مُنہ چومتی ہے ساحل کا

ہو گئی سجدوں سے بت خانے کی پیشانی سیاہ — کیا کہیں گے مجھ کو کعبے میں مسلماں دیکھ کر

مسجد میں پی شراب، پڑھی دَیر میں نماز — بیمؔار کو شعور کسی بات کا نہیں

یوں چمکتے ہیں وہ دنداں لبِ خنداں کے تلے — جس طرح سلکِ گہر پارۂ مرجاں کے تلے

موجی، لالا موجی رام

نام لالا موجی رام، موجی تخلّص۔ ۹۰-۱۷۸۹ء میں قصبہ سانڈی، ضلع ہردوئی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ قوم کے کائستھ تھے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ تمام عمر نواب حسین علی خاں ولد سعادت علی خاں والیٔ اودھ کی ملازمت میں گزاری۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ بہت پُر گو تھے۔

منتخب اشعار

وصل بھی دیکھا، جدائی دیکھ لی — حق نے جو صورت دکھائی، دیکھ لی

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار — جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی

خان، اشرف علی خاں

نام اشرف علی خاں، تخلّص خان۔ لکھنؤ میں تقریباً ۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما ہوئی۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ ان کے بزرگ شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ سپہ گری، نیزہ بازی اور شہ سواری کے فن میں طاق تھے۔ دہلی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔

منتخب اشعار

روٹھ کر تو چلا ہے تُو مجھ سے — مُنہ تو اپنا مجھے دکھائے جا
باغ میں قد کو ترے دیکھ کے اے سروِ رواں! — آج تک سرو پشیماں نہ ہوا تھا، سو ہوا
مکھڑا کھُلا صنم کا، بندِ نقاب ٹوٹا — شکرِ خدا کہ اُس کا ہم سے حجاب ٹوٹا
اپنی آواز ہی پردے سے سنا جاؤ ذرا — گر تمھیں ہم سے ملاقات کا مقدور نہیں
جو کہ ہووے گا صبح سن لینا — جاؤ گھر اپنے تم، جو جاتے ہو
دیوانگی میں بھی مجھے اِتنا تو ہوش ہے — تصویر کی پسند تو تیری پسند کی

ذوق، شیخ محمد ابراہیم

شیخ محمد ابراہیم نام، ذوق تخلص۔ ۲۲ر اگست ۱۷۹۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ قوت حافظہ اتنا اچھا تھا کہ عالم شیر خواری تک کے واقعات یاد تھے۔ خوف خدا سے عمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ چند روز موسیقی کا بھی شوق ہوا۔ نجوم و رمل میں بھی دستگاہ پیدا کی۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا۔ کھری چارپائی پر بیٹھے رہتے اور مطالعہ کرتے جاتے یا شعر و سخن میں محو رہتے۔ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کے صلے میں ان کو ''خاقانی ہند'' کا خطاب ملا۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کا بہت کلام ضائع ہو گیا۔ محمد حسین آزاد جو ذوق کے شاگرد تھے ان کی بدولت ایک اچھا خاصا دیوان مرتب ہو گیا۔ اخلاقی مضامین، بیان میں صفائی و سادگی ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں۔ ان کے ہم عصروں میں ان سے بہتر قصیدہ کسی نے نہیں لکھا۔ سودا کے بعد ذوق اردو قصیدے کے دوسرے بڑے شاعر ہیں۔ ۱۶ر نومبر ۱۸۵۴ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ محمد حسین آزاد، نواب الٰہی بخش معروف، داغ اور ظہیر ان کے نام ور شاگرد تھے۔

منتخب اشعار

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا — کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا
غافل! ہے بہارِ چمنِ عمر جوانی — کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا
کسی بے کس کو اے بے داد گر! مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں — اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

نہ ہوا پر نہ ہوا میؔر کا انداز نصیب ۔۔۔ ذوقؔ! یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

زاہد! شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں ۔۔۔ کیا ڈیڑھ چلّو پانی میں ایمان بہہ گیا؟

ہے قفس سے شور اِک گلشن تلک فریاد کا ۔۔۔ خوب طوطی بولتا ہے اِن دنوں صیّاد کا

سب کو دیکھا اُس سے اور اُس کو نہ دیکھا جوں نگاہ ۔۔۔ وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگِ بُوے گل ۔۔۔ وہ رہا آغوش میں، لیکن گریزاں ہی رہا

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز ۔۔۔ کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا ۔۔۔ پر ذکر ہمارا نہیں آتا، نہیں آتا

قسمت سے ہی لاچار ہوں اے ذوقؔ! وگرنہ ۔۔۔ سب فن میں ہوں میں طاق، مجھے کیا نہیں آتا؟

اے ذوقؔ! تکلّف میں ہے تکلیف سراسر ۔۔۔ آرام میں ہے وہ، جو تکلّف نہیں کرتا (۱)

گل اُس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا ۔۔۔ یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

اُس رُوے تاب ناک پہ ہر قطرۂ عرق ۔۔۔ گویا کہ اِک ستارہ ہے صبحِ بہار کا

ہو تُو عاشق سوچ کر اُس دشمنِ ایمان کا ۔۔۔ دل نہ کر جلدی کہ جلدی کام ہے شیطان کا

اِن دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن ۔۔۔ کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

مجھ سا مشتاقِ جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں ۔۔۔ لاکھ ڈھونڈو گے چراغِ رُخِ زیبا لے کر

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس ۔۔۔ بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

وقتِ پیری، شباب کی باتیں ۔۔۔ ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

احسان ناخدا کا اُٹھائے مری بلا ۔۔۔ کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ۔۔۔ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

رندِ خراب حال کو، زاہد! نہ چھیڑ تُو ۔۔۔ تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تُو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے مُنہ بناتے ہو ۔۔۔ وہ لب پہ آئی ہنسی، دیکھو، مسکراتے ہو

بجا کہے جسے عالم، اُسے بجا سمجھو ۔۔۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ ۔۔۔ پست ہمت یہ نہ ہووے، پست قامت ہو تو ہو

---

(۱) ''دیوانِ ذوق'' مرتبہ حافظ ویران، ظہیر و انور میں مصرع ثانی اِس طرح درج ہے: آرام سے وہ ہے جو تکلّف نہیں کرتا
بحوالہ: ''کلّیاتِ ذوق'' (جلد اوّل)، مرتبۂ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۲/ اور ۴۲۳

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمرور کو جھکا کر — جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اَور زیادہ

اے ذوقؔ! دیکھ دخترِ رز کو نہ مُنہ لگا — چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

پلاے آشکارا ہم کو، کس کی، ساقیا! چوری — خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے — یہی چراغ ہے اِس تیرہ خاک داں کے لیے

جو پاسِ مہر و محبت یہاں کہیں بکتا — تو مول لیتے ہم اِک اپنے مہرباں کے لیے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے — ہنستے ہیں، مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

غمِ جدائی میں تیرے ظالم! کہوں میں کیا مجھ پہ کیا بنی ہے — جگر گدازی ہے، سینہ کاوی ہے، دل خراشی ہے، جاں کنی ہے

گُل ہاے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن — اے ذوقؔ! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے — اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے — پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہم سے بھی اِس بساط پہ کم ہوں گے بدقمار — جو چال ہم چلے، سو نہایت بری چلے

جاتے ہواے شوق میں ہیں اِس چمن سے ذوقؔ — اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

اے ذوقؔ! کسی ہم دمِ دیرینہ کا ملنا — بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے — اور اِس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بت سے خدا سمجھے

کیا غرض، لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے — اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

ناز ہے گُل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ! — اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے — لے چلا آج وہیں پھر دلِ بے تاب مجھے

کہتے ہیں، آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا — کیا خوب آدمی تھا، خدا مغفرت کرے

توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی — دنیا میں گراں باریٔ اولاد غضب ہے

اے شمع! تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اِسے رو کر گزار دے

مؤذّن، مرحبا! بروقت بولا — تری آواز مکّے اور مدینے

اس جبر پر تو ذوقؔ بشر کا یہ حال ہے — کیا جانے، کیا کرے جو خدا اختیار دے

کِھل کے گل کچھ تو بہار اپنی، صبا! دکھلا گئے　　　حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے (۱)

برق، مرزا محمد رضا

نام مرزا محمد رضا، تخلّص برق، فتح الدولہ، بخشی الملک، فتح جنگ خطاب۔ لکھنؤ میں تقریباً ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ زمانے کے دستور کے مطابق تعلیم وتربیت پائی۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ بانک، بنوٹ اور شمشیر زنی سے اچھی طرح واقف تھے۔ نواب واجد علی شاہ کے استاد اور مصاحب خاص تھے۔ سقوط سلطنت اودھ کے بعد یہ بھی واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ گئے۔ بہت پُر گو تھے۔ ۱۷/اکتوبر ۱۸۵۷ء کو کلکتہ میں انتقال ہوا۔ ایک ضخیم دیوان اُن کی یادگار ہے جس میں مختلف اصناف سخن موجود ہیں۔ لکھنؤ کی تباہی پر ایک شہر آشوب بھی لکھا۔ برق نے قطعاتِ تاریخ میں اکثر اپنا تخلّص رضا بھی استعمال کیا ہے۔

منتخب اشعار

اذاں دی کعبے میں، ناقوس دَیر میں پھونکا　　　کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

نکلا غبار دل سے، صفائی تو ہو گئی　　　اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا

آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو　　　غم میں پھنسا ہوں دامِ محبت سے چھوٹ کر

قیس کا نام نہ لو، ذکرِ جنوں جانے دو　　　دیکھ لینا مجھے تم، موسمِ گل آنے دو

اے صنم! وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے　　　وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

شکوہ میں نے جو کیا، جائے شکایت یہ نہیں　　　جس سے ہوتی ہے اُمید، اُس سے گِلہ ہوتا ہے

وزیر، خواجہ محمد

نام خواجہ محمد وزیر، تخلّص وزیر۔ تقریباً ۱۷۹۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ خاندان باپ کی جانب سے حضرت خواجہ بہاء الدّین سے ملتا ہے۔ خاندان اور ذاتی تقدس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان کی بہت عزت تھی۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ نہایت پُر گو تھے۔ ان کا ضخیم دیوان ان کی زندگی میں ضائع ہو گیا۔ موجودہ دیوان

(۱) ''کُلّیاتِ ذوق'' (جلد اوّل)، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۹۹۔ مصرعِ اولیٰ اس طرح مشہور ہے:
پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے

''دفترِ فصاحت'' ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں اور دوستوں نے شائع کیا۔ ان کے کئی شاگرد تھے۔ جن میں سب سے مشہور فقیر محمد گویا ہیں۔ ان کی شاگردی کی وجہ سے وزیر کے معاشی حالات بہتر ہو گئے تھے، لیکن بعد میں کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی جس سے یہ سہارا ختم ہو گیا۔ وزیر نے کسی اور رئیس کی ملازمت نہیں کی۔ باقی عمر مفلسی اور تنگ دستی میں گزاری۔ آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ فتوح اور تسخیر اعمال کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے۔ ۱۱ر اگست ۱۸۵۴ء کو لکھنؤ میں وفات پا گئے۔

غزل کی جان، یعنی تاثیر کے نہ ہونے سے ان کے کلام کی حیثیت ایک حسین، مگر جسد بے روح سے زیادہ نہیں قرار پا سکتی۔ ان کے تمام دیوان کو اوّل سے آخر تک پڑھو، اُس میں دس شعر بھی ایسے نہ ملیں گے جن سے اہلِ دل کے قلوب کو سرور اور اربابِ نظر کو نور حاصل ہو۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منتخب اشعار

کیا خبر تھی، انقلابِ آسماں ہو جائے گا
دوست کا ملنا نصیبِ دشمناں ہو جائے گا

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کُوے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

کیا غیروں کو قتل اُس نے، موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی، دوستو! آئی نصیبِ دشمناں ہو کر

اسی خاطر تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

جو خاص بندے ہیں، وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے، غلام نہیں

کسی کے آتے ہی ساقی کے یہ حواس گئے
شراب سیخ پہ ڈالی، کباب شیشے میں (۱)

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دل گیر کو
کیسے تیر انداز ہو! سیدھا تو کر لو تیر کو

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب توقع نہیں رہائی کی

یوں پھر رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں
آلودہ میرے خون سے داماں کیے ہوئے

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، عجب خوابِ ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے، درِ فتنہ باز ہے

دیکھ پچھتاؤ گے، او بت! مرے ترسانے سے
اُٹھ کے کعبے کو چلا جاؤں گا بت خانے سے

(۱) ''دفترِ فصاحت'' (دیوان وزیر) خواجہ وزیر، مصطفائی پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء)، ص ۱۳۵

زکی مرادآبادی

منشی مہدی علی خان نام، زکی تخلص۔ تقریباً ۹۴-۱۷۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ پہلا تخلص مہدیؔ تھا۔ ابتدائی تعلیم مرادآباد میں حاصل کی۔ اعلا تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے۔ لکھنؤ میں تعلیم سے فارغ ہوکر دہلی چلے گئے۔ دہلی سے سہارن پور گئے اور وہاں تحصیل دار کے فرائض انجام دیے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ملازمت ترک کرکے حیدرآباد، دکن چلے گئے اور نواب ناصر الدّولہ نظام الملک والیٔ ریاست کی مدح میں قصائد کہہ کر پیش کیے اور خلعت اور انعام سے سرفراز ہوئے۔ واجد علی شاہ کی سرکار میں بھی ملازم رہے اور ''ملک الشعرا'' کا خطاب پایا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد خانہ نشین ہوگئے تھے۔ ہنگامۂ غدر میں اُن کے گھر کے اسباب کے ساتھ اُن کا بہت سا کلام بھی تلف ہوگیا۔ نواب یوسف علی خاں ناظم نے جب ان کے کمال کا شہرہ سنا تو انھیں رام پور بلالیا۔ جب تک نواب زندہ رہے یہ رام پور میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد ۶۵-۱۸۶۴ء میں انبالہ گئے اور وہیں مارچ ۱۸۶۷ء میں انتقال کرگئے۔ نول کشور، لکھنؤ کے مطبع سے ان کا کلام ''کلامِ زکی'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ مصحفی سے انھیں تلمذ حاصل تھا۔ فارسی میں مرزا قتیل سے اصلاح لیتے تھے۔ وہ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

منتخب اشعار

اے نامہ بر! جو پڑھ کے وہ خط ہو رہیں خموش — زنہار تُو سوال نہ کرنا جواب کا

آیا وہ چاندنی میں تو رنگت ہوئی سفید — نکلا جو دھوپ میں تو سنہرا بدن ہوا

غبارِ قیس میں جاں آگئی ٹھوکر سے لیلیٰ کی — اُڑا جاتا ہے جگنو بن کے ہر ذرّہ بیاباں کا

چل بسے اہلِ جنوں، خالی بیاباں رہ گیا — جابجا اُلجھے ہوئے کانٹوں میں داماں رہ گیا

شمع گل ہونے لگی، یارانِ محفل اُٹھ گئے — ایک میں رونے کو تنہا انجمن میں رہ گیا

جوہر تو مجھ میں ہیں ملکوتی صفات کے — انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

زمیں سے لالہ نکلتا ہے داغ کھائے ہوئے — بہارِ عشق کے ہیں یہ بھی گل کھلائے ہوئے

رند، سیّد محمد خاں

نام نواب سیّد محمد خاں، تخلص رند۔ اگست ۱۷۹۷ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ نوابانِ اودھ کے خاندان

سے قرابت تھی۔ چناں چہ نواب بہو بیگم زوجہ شجاع الدّولہ کی سرپرستی میں پرورش نازونعم سے ہوئی۔ بچپن سے طبیعت شعروسخن کی طرف مائل تھی۔ فیض آباد کے دوران قیام وفا تخلّص کرتے تھے اور میر مستحسن خلیق سے جو میر انیس کے والد تھے، اصلاح لیتے تھے۔ نواب بہو بیگم کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے گئے، اور آتش کے شاگرد ہو گئے۔ ان کی خواہش کے مطابق رند تخلّص اختیار کیا۔ رند نے وفا کا سارا کلام دوستوں کی موجودگی میں کنویں میں ڈال دیا اور آتش کی پیروی میں اپنا مزاج شامل کر کے نئے طرز میں شاعری کرنے لگے۔ رند ایک خوبصورت، عاشق مزاج اور دولت مند رئیس تھے۔ انھوں نے رندانہ زندگی بسر کی۔ آخر عمر میں تائب ہو گئے تھے۔ مقام مقدسہ کی زیارت کو روانہ ہوئے، مگر بمبئی میں ۱۸۵۷ء میں فوت ہو گئے۔ ایک کُلّیات ان کی یادگار ہے جس میں دو دیوان شامل ہیں۔ ایک دیوان ''گل دستۂ عشق'' اور دوسرا دیوان غیر مکمل۔

کلام ان کا نہایت صاف اور سادہ ہے جس میں محاورات کی برجستگی اور تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے۔ بلند پروازی اور خیال آفرینی ان کے یہاں کم ہے۔ ان کے اشعار مہذب کانوں پر ناگوار نہیں ہوتے۔ غرضے کہ آتش کے شاگردوں میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ (رام بابو سکسینہ)

منتخب اشعار

چھوڑا قفس سے تب ہمیں، صیّاد! تُو نے آہ
جب موسمِ بہار چمن سے نکل گیا

پھینک دوں دل کو ابھی چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں، دل پر تو ہے قابو اپنا

توڑ بت مسجد بنی، مسمار بت خانہ ہوا
جب تو اِک صورت بھی تھی، اب صاف ویرانہ ہوا

دیدِ لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیّاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیّاد

دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیّاد

آ عندلیب! مل کے کریں آہ و زاریاں
تُو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

پھر وہی کنجِ قفس ہے، وہی صیّاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھا لے بلبل!

بس اب آپ تشریف لے جائیے
جو گزرے گی مجھ پر، گزر جائے گی

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

وہ کون لوگ ہیں بیگانے، ہیں جو اپنوں سے
ہمیں تو غیر سے بھی بُوئے آشنا آئی

بت کریں آرزو خدائی کی — شان ہے تیری کبریائی کی

وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

کیا ملا عرضِ مدّعا کر کے — بات بھی کھوئی التجا کر کے

سیر کی، خوب پھرے، پھول چنے، شاد رہے — باغ باں! جاتے ہیں، گلشن ترا آباد رہے

دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی بادِ بہاری — کیا اب کی برس چاک گریباں نہ کریں گے؟

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیّاد! — میں ماجرائے چمن کیا بیاں کروں صیّاد!

غالب، مرزا اسداللّٰہ خاں

نام مرزا اسداللّٰہ خاں، غالب تخلّص، عرفیت مرزا نوشہ۔ ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ غالب نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ ملّا عبدالصمد سے عربی اور فارسی زبانوں کے علاوہ منطق اور فلسفہ کے متعلق اہم نکات حاصل کیے۔ غالب نے مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا پہلا تخلّص اسد تھا۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالب بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔ غالب کو تین خطابات نجم الدّولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ، بہادر شاہ کے عہد میں دربارِ عالیہ سے ملے۔ مرزا بہت شگفتہ مزاج تھے۔ شوخی و ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی لیے حالی نے انھیں حیوان ظریف کہا ہے۔ غالب زندگی بھر کرائے کے مکان میں رہے۔ ان کی گزر اوقات کا اہم ذریعہ ان کے چچا کی ریاست سے ملنے والی پنشن تھی، لیکن وہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی تھی۔ انھیں مختلف ریاستوں سے امداد بھی ملتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پچاس روپیہ ماہانہ مشاہرے پر خاندان مغلیہ کی سوانح (''مہرِ نیم روز'') لکھنے پر معمور تھے۔ وہ آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے تھے اس لیے ان کی پوری زندگی قرضوں میں گزری۔ وہ نثر میں جدید اسلوب کے بانی ہیں۔ وہ انیسویں صدی کے اردو کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے گئے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں 'جب مغلیہ سلطنت ختم ہوگئی، غالب نہایت مشکلات سے دوچار ہوئے۔ ان کے زیادہ تر ساتھی اور دوست دوسرے شہروں میں ہجرت کر گئے تھے۔ مرزا جب ۳۰ر برس کے تھے تو وہ لکھنؤ، بنارس ہوتے ہوئے ۱۸۲۶ء میں اپنی پنشن کے اجرا کے سلسلے میں کلکتہ گئے۔ وہاں تقریباً دو برس تک رہے، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ آخری عمر میں وہ ذیابیطس اور رعشہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ علالت کے دوران بھی غالب اپنے احباب کو خطوط لکھتے رہے۔ ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو دنیائے ادب کا یہ درخشاں ستارہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگیا۔ غالب حضرت سلطان نظام الدّین کی درگاہ میں اپنے خسر نواب الٰہی بخش معروف کے پائین مزار دفن ہوئے۔ غالب اردو اور فارسی

کے عظیم شاعر تھے۔ دیوان غالب (اردو) کی عالمگیر شہرت حاصل ہوئی اور اس کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کئی اہل علم نے دیوان غالب کی شرحیں لکھی ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوان غالب کو ہندوستان کی الہامی کتاب کہا ہے۔ حسبِ ذیل تصانیف ان کی یادگار ہیں:

(۱) دیوان اردو (۲) کلّیات نظم فارسی (۳) عودِ ہندی (۴) اردوئے معلّٰی (خطوط کا مجموعہ) (۵) کلّیات نثر فارسی (۶) لطائفِ غیبی (۷) تیغ تیز (۸) قاطع برہان (۹) پنج آہنگ (۱۰) نامۂ غالب (۱۱) مہرِ نیم روز (۱۲) دستنبو (۱۳) سبد چین۔

منتخب اشعار

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شِیر کا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، درد لادوا پایا

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بُوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

فائدہ کیا سوچ آخر تُو بھی دانا ہے اسدؔ — دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تُو راضی ہوا | مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز | پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی | کیوں ترا راہگذر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے | دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ | سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

توفیق بہ اندازۂ ہمّت ہے ازل سے | آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم | میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

تُو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں | کبھی فتراک میں میرے کوئی نخچیر بھی تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے | حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی | ہیولا برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ | لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا | ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

دوست غم خواری میں میری، سعی فرمائیں گے کیا؟ | زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا؟

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک | ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

حضرتِ ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ | کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا؟

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا | نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرف دار نہیں | دیکھیں، اِس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں | آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا | جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے | ہوں شمع کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار | لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا | درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللّٰہ اللّٰہ ! | اِس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا | اگر اَور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچّھا ہوا، بُرا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اِس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ، دشمن آسماں اپنا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا!

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھُلا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صَلا میرے بعد

آئے ہے بے کسیٔ عشق پر رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دُونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تُو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اَور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اَور

ہیں اَور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اَور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اَور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اَور

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
تُو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اَور جان عزیز

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوتے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اِک چھیڑ ہے، وگرنہ مراد امتحاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
سَو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

ہے تجلّی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

کہتے ہیں، جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے، ولے اِس قدر آباد نہیں

کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اِک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، اِنھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل! غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

قاصد کے آتے آتے خط اِک اَور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

لاکھوں لگاو ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناو ایک بگڑنا عتاب میں

غالبؔ چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سُوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دَورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نَے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ 'یاد نہیں'

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

نینداُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

وفا داری بشرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے
مَرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

قطع کیجیے نہ تعلّق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
کعبے کس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ — شرم تم کو، مگر نہیں آتی

واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبے سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نا، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ — کیوں کسی کا گِلا کرے کوئی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں! — شوقِ فضول جرأتِ رندانہ چاہیے
توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا؟ — آسماں سے بادۂ گل فام گر برسا کرے
ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے — مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے — وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
یارب! ہمیں تُو خواب میں بھی مت دکھائیو — یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے
غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے — ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے!

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوّری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو — اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے با ایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی، خاک میں مل جائے گی — یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں — ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے — یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

غافل اِن مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی! کیا قیامت ہے؟ — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اولیئم! — تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں — پر کچھ اب کے سرگرانی اَور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اَور ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ — کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ آخر اِس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟

'ہاں! بھلا کر ترا بھلا ہوگا' اَور درویش کی صدا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

اَور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مُنہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پرتَو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ رہو، ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے ہم نشیں اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہیے

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے، تو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سفینہ جب کہ کنارے پر آ لگا غالبؔ خدا سے کیا ستم و جَورِ ناخدا کہیے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا — اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

نَے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے — اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اَور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ، بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

سَو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

روز اِس شہر میں اِک حکم نیا ہوتا ہے — کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے — عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے (۱)

طنزیہ ومزاحیہ اشعار

میں نے کہا کہ 'بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی' — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ 'یوں'

میں جو کہتا ہوں کہ 'ہم لیں گے قیامت میں تمھیں' — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ 'ہم حور نہیں'

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام — قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

چاہتے ہیں خوب رُویوں کو اسدؔ — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں، مُنہ سے، مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ — پر اِتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

درم و دام اپنے پاس کہاں — چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں (۲)

---

(۱) ''غالب کا منسوخ دیوان'' مرتبہ مسلم ضیائی، مطبع ایجوکیشنل پریس، کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۳۲۸، حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں لکھا ہے:
''مرنے سے قبل اکثر یہ شعر وردِ زباں رہتا تھا۔''

(۲) ''دیوانِ غالب کامل'' مرتبہ کالی داس گپتا رضا، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۵۴

نسیم، اصغر علی

نام اصغر علی خاں، تخلص نسیم۔ پہلا تخلص اصغر۔ ۱۸۰۰-۱۷۹۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے علاوہ خوش خطی سیکھی۔ مومن کے شاگرد تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کا اپنے بھائیوں سے جائیداد کی تقسیم پر جھگڑا ہوا اور وہ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے۔ دہلی میں ان کی زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ لکھنؤ میں فقر و فاقے کی حالت میں رہے، مگر کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ کافی عرصہ مطبع مصطفائی میں خوش نویس رہے۔ غدر کے بعد نول کشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم ترجمے کی خدمت پر مامور رہے اور وہیں الف لیلہ جلد اوّل منظوم کی۔ عدم توجہی اور لاپروائی کے سبب ان کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں کو جتنا کلام مل سکا اس کو ''دفترِ شنگرف'' کے نام سے چھپوایا۔ ۳۱ رجنوری ۱۸۶۶ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ امیر اللہ تسلیم ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

نسیم نے تمام اصنافِ سخن میں قدرتِ کامل پائی تھی۔ خصوصاً مثنوی میں ان کو یدِ بیضا حاصل تھا۔ ان کے کلام میں خیال کی دل فریبی اور بیان کی رنگینی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی اِس قدر نمایاں اور واضح ہے کہ اِس کے ساتھ کسی دوسرے کا کلام لگا نہیں کھاتا۔ (مولانا حکیم سیّد عبدالحیؒ)

منتخب اشعار

نام میرا سنتے ہی شرما گئے — تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

مُنہ میرا نہ کھلواؤ کہ ہو جائیں گے لب بند — دیکھو، یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کبھی آغوش میں رہتا، کبھی رخساروں پر — کاش، اے آفتِ جاں! میں ترا آنسو ہوتا

آنکھوں میں ہے لحاظ، تبسّم فزا ہیں لب — شکرِ خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

نسیم دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں — کوئی اردو کو کیا سمجھے گا، جیسا ہم سمجھتے ہیں

ہم اسیرانِ قفس کیا جانیں لطفِ بوستاں — مدّتوں سے بتلائے زحمتِ صیّاد ہیں

شوقِ شراب و خواہشِ جام و سبو نہیں — ہے سب حرام جب سے کہ پہلو میں تو نہیں

سفر ہے دشوار، خواب کب تک، بہت بڑی منزلِ عدم ہے — نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

مومن، مومن خاں

نام حکیم مومن خاں، تخلص مومن۔ ۱۸۰۰ء میں دہلی کے محلّہ کوچہ چیلان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بعد میں مولانا شاہ عبدالقادر سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ درسیات کو ختم کرنے کے بعد اپنے والد اور چچا سے طب کی کتابیں پڑھیں۔ فن طب ان کا موروثی پیشہ تھا۔ شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا، لیکن چند ہی روز بعد ان سے اصلاح لینی چھوڑ دی۔ خوش وضع رنگین مزاج، خوددار اور غیرت مند تھے۔ علم نجوم میں ماہر تھے۔ شطرنج سے بھی انھیں بہت شغف تھا۔ طب، رمل، نجوم اور شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ کوٹھے سے گرنا موت کا باعث ہوا جس کی تاریخ انھوں نے خود کہی ''دست و باز وشکست'' اور پیشین گوئی کی کہ پانچ دن یا پانچ ماہ یا پانچ سال میں مرجاؤں گا۔ چناں چہ پانچ ماہ بعد ۲۱ رمئی ۱۸۵۲ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ لطیف طنزیہ انداز بیان کی بنا پر وہ اپنے ہم عصر شعرا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اردو کلّیات کے علاوہ فارسی کا بھی دیوان یادگار چھوڑا۔ شیفتہ، میر حسین تسکین، اصغر علی نسیم اور حکیم منور علی آشفتہ ان کے مشہور شاگرد تھے۔

> اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرا متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامّل کہہ دوں گا کہ مجھے ''کلّیات مومن دے دو اور باقی سب اُٹھا لے جاؤ۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

نہ کرو اب نباہ کی باتیں ۔۔۔ تم کو اے مہربان! دیکھ لیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی ۔۔۔ آشیاں اپنا ہوا برباد کیا؟

کن نصیبوں پر کیا اختر شناس ۔۔۔ آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا؟

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا ۔۔۔ میں الزام اُس کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

غیروں پہ کُھل نہ جائے کہیں راز، دیکھنا ۔۔۔ میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں ۔۔۔ اے ہم نفس! نزاکتِ آواز دیکھنا

میں نے تم کو دل دیا، تم نے مجھے رسوا کیا ۔۔۔ میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

روز کہتا تھا، کہیں مرتا نہیں، ہم مر گئے ۔۔۔ اب تو خوش ہو بے وفا! تیرا ہی لے کہنا کیا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
'بے وفا' کہنے کی شکایت ہے تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمھارے سوا نہیں ہوتا
اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں لو آپ اپنے دام میں صیّاد آ گیا
عشق سے لوگ منع کرتے ہیں جیسے کچھ اختیار ہے اپنا
نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا
چارہ گر زنداں میں اُس کے آستاں سے لے گئے ایک بھی میری نہ مانی، لاکھ سر پٹکا کیا
کیا خجل ہوں اب علاجِ بے قراری کیا کروں دھر دیا ہاتھ اُس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا
اِس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کِیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
کس دن تھی اُس کے دل میں محبت، جواب نہیں سچ ہے کہ تُو عدو سے خفا بے سبب ہوا
درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا
کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا
دل لگانے کے تو اُٹھائے مزے جی بلا سے رہا، رہا، نہ رہا
'ہائے صنم، ہائے صنم' لب پہ کیوں خیر ہے مومنؔ، تمھیں کیا ہو گیا
کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو، بولو سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری تیرے چُھپتے ہی کچھ چُھپا نہ رہا
کعبے سے جانبِ بت خانہ پھر آیا مومنؔ کیا کرے، جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا
دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مرے تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا
مومنِؔ دیں دار نے کی بت پرستی اختیار ایک شیخ وقت تھا سو بھی برہمن ہو گیا
رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہنچا کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا؟
آپ کی کون سی بڑھی عزّت میں اگر بزم میں ذلیل ہوا
تھے ہمیں مومنؔ کی خودداری پہ کیا کیا اعتماد کیا خبر تھی یہ کہ یوں محوِ بتاں ہو جائے گا
اثرِ غم ذرا بتا دینا وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق

آپ مجھ سے نباہیں گے، سچ ہے | باوفا حُسن و بے وفا ہے عشق

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں، رضا کی تیری خواہش ہے | نہ میں بیزار دوزخ سے، نہ میں مشتاق جنت کا

نے تابِ ہجر میں ہے، نہ آرام وصل میں | کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

بن جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے | کیا کیجیے، ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

امتحاں کے لیے جفا کب تک | التفاتِ ستم نما کب تک

چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومنؔ، ولے | کیا کروں بت خانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل

شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم | ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردشِ ایام ہم

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم | پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

صاحب نے اِس غلام کو آزاد کر دیا | لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا مؤثر ہو دعا وصلِ صنم کی مومنؔ | ہم طلب کرتے ہیں وہ شے جو مقدّر میں نہیں

دم بدم رونا ہمیں، چاروں طرف تکنا ہمیں | یا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا | جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

اے حشر! جلد کر تہ و بالا جہان کو | یوں کچھ نہ ہو، اُمید تو ہے انقلاب میں

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں | تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے | صیّاد کی نگاہ سُوئے آشیاں نہیں

کیسے گِلے رقیب کے، کیا طعنِ اقربا | تیرا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

شبنم خرابِ مہر، کتاں سینہ چاکِ ماہ | لو اَور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

دن بھی دراز رات بھی، کیوں ہے فراقِ یار میں | کاہے سے فرق آ گیا گردشِ روزگار میں

دوست کرتے ہیں ملامت، غیر کرتے ہیں گِلہ | کیا قیامت ہے، مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

میں گلہ کرتا ہوں اپنا، تُو نہ سن غیروں کی بات | ہیں یہی کہنے کو وہ بھی، اَور کیا کہنے کو ہیں

ہو گئے نامِ بتاں سنتے ہی مومنؔ بے قرار | ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

کہتے ہیں، تم کو ہوش نہیں اضطراب میں | سارے گِلے تمام ہوئے اِک جواب میں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدّعا ہو کاش | وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع | مومنؔ خدا کو بھول گئے اضطراب میں

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ
بدنامیِ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے، آواز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دُزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز، تو دیکھو

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیش تر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گِلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اک لحظہ نہیں قرار جی کو
موت آئے بس ایسی زندگی کو

کوئی نہ رہا جو پونچھے آنسو
کیا رووٗں میں اپنی بے کسی کو

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیے ستانے کو

صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال
ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

اے ناصحو! آ ہی گیا وہ فتنۂ ایّام، لو
ہم کو کہتے تھے بھلا، اب تم تو دل کو تھام لو

مومنؔ تم اور عشقِ بتاں اے پیرومرشد! خیر ہے
یہ ذکر اور مُنہ آپ کا، صاحب! خدا کا نام لو

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومنؔ چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

قفس کے سامنے بجلی کچھ اِس طرح چمکی
نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا، نباہ نہ کی

رشکِ دشمن بہانہ تھا، سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تُو نے کس توقّع پر وفا کی

وہ سوتے بے حجابانہ رہے اور
نگاہِ شوق کام اپنا کیا کی

کر علاجِ وحشتِ دل چارہ گر!
لادے اِک جنگل مجھے بازار سے

سامنے سے جب وہ شوخِ دل رُبا آ جائے ہے
تھامتا ہوں، پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

تاب وطاقت، صبر وراحت، جان وایماں، عقل وہوش
ہائے، کیا کہیے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے کہ اِک حرفِ غلط
لیک اُٹھے بھی تو اِک نقش بٹھا کے اُٹھے

بختِ بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اُٹھتا ہوں
تُو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے
زباں تھک گئی 'مرحبا' کہتے کہتے

ہم حال کہے جائیں گے، سنیے کہ نہ سنیے
اِتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی! لاؤں کہاں سے

نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیّاد
نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے

دیکھو، مت دیکھیو کہ آئینہ
غش تمھیں دیکھ کر نہ ہو جائے

کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم
کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے

میرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

پامال اِک نظر میں قرار وثبات ہے
اُس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

چھوٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

اب شوق سے تم محفلِ اغیار میں بیٹھو
یاں گوشۂ خلوت میں عجب لطف اُٹھا ہے

تابِ نظّارہ نہیں، آئینہ کیا دیکھنے دوں
اَور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

ناصحا! دل میں تُو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

تُو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لیے

کہاں وہ عیشِ اسیری، کہاں وہ امنِ قفس
ہے بیمِ برق بلا روز آشیاں کے لیے

کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہرِ درویش، بجانِ درویش

صبا، میر وزیر علی

میر وزیر علی نام، صبا تخلص۔ ولادت تقریباً ۱۸۵۰ء وطن لکھنؤ تھا اور یہیں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں نشو ونما ہوئی۔ زمانے کی ضرورت کے مطابق فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ آتش کے شاگرد تھے۔ دو سو روپیہ واجد علی شاہ کی سرکار سے اور تیس روپیہ ماہوار نواب محسن الدّولہ کے یہاں سے ملتا تھا۔ بہت خلیق اور ملنسار تھے۔ دوستوں کا جمگھٹا ہر وقت رہتا تھا۔ افیون کے بہت شوقین تھے۔ جو شخص ان سے ملنے جاتا اس کی تواضع منجملہ دیگر تکلفات افیون سے بھی ضرور کرتے۔ ۱۳؍جون ۱۸۵۵ء کو لکھنؤ میں گھوڑے سے گر کر انتقال ہوا۔ ایک ضخیم دیوان ''غنچۂ آرزو'' ان کی یادگار ہے۔ ۱۹۹۲ء میں دیوانِ صبؔا مجلس ترقیِ ادب، لاہور سے شائع ہوا۔

منتخب اشعار

دل میں اِک درد اُٹھا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں، کیا جانیے، کیا یاد آیا

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی
لیجیے، آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب، اگلے زمانے والے

بلبل کہاں، بہار کہاں، باغ باں کہاں
وہ دن گزر گئے، وہ زمانہ گزر گیا

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

نادان ہیں جو رکھتے ہیں اُمید کسی سے
جز ذاتِ خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا

اسیر، مظفر علی

سیّد مظفر علی نام، اسیر تخلص، ۱۸۰۰ء میں امیٹھی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی کتابیں اپنے والد سے اور عربی صرف ونحو اپنے چچا اور علمائے فرنگی محل سے لکھنؤ میں پڑھیں۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ نصیر الدّین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ واجد علی شاہ نے 'تدبیر الدّولہ مدبّر الملک بہادر جنگ' کا خطاب عنایت کیا۔ بادشاہ کبھی کبھی اُن سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ جب بادشاہ (واجد علی شاہ) کلکتہ جانے لگے تو انھوں نے رفاقت منظور نہ کی جس سے بادشاہ آزردہ خاطر ہوئے۔ زوال سلطنت اودھ کے بعد رام پور میں نواب

یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے دربار سے منسلک رہے۔ ۶ رفروری ۱۸۸۲ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ امیر مینائی، ریاض خیر آبادی اور شوق قدوائی ان کے مشہور تلامذہ ہیں۔ چھ دیوان اردو کے چھوڑے جن میں چار چھپ چکے ہیں۔ ایک دیوان فارسی، ایک مثنوی، ''درۃ التاج'' اور رسالہ عروض بھی شائع ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مرثیے اور قصائد بھی بہت سے لکھے۔

> اسیر کی شہرت کا زیادہ دارومدار ان کے شاگردوں کی فہرست پر ہے جن میں سے امیر مینائی، احمد علی شوق، ریاض خیر آبادی وغیرہ بہت مشہور ہیں، لیکن خود اسیر کی شاعری ایک خاص رنگ کی ترجمان ہے۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منتخب اشعار

دل جلا کر رُخِ محبوب کا جلوا دیکھا — ہم نے گھر پھونک کے کیا خوب تماشا دیکھا

رونقِ گلشن جو وہ رندِ شرابی ہو گیا — پھول ساغر بن گیا، غنچہ گلابی ہو گیا

بت کدے کی میں سیر کر آیا — واں خدا ہی خدا نظر آیا

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست — مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

ضعفِ پیری بڑھ گیا، زورِ جوانی گھٹ گیا — اب عصا بنوایئے نخلِ تمنا کاٹ کر

آج ساقی میں نہیں گو کہ مروّت باقی — خیر، زندہ ہے اگر یار تو صحبت باقی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا — ہزاروں اُٹھ گئے کثرت وہی باقی ہے محفل کی (۱)

باقی ابھی ہے ترکِ تمنا کی آرزو — کیوں کر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

بے گنہ جائے کہاں اب کہ تری رحمت نے — بھر دیا گلشنِ جنت کو گنہگاروں سے

---

(۱) ''دیوانِ اسیر''، مطبع نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۰ء، ص ۴۳۲ اور ''جواہرِ سخن'' (جلد سوم)، مرتبۂ مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ص ۲۶۴

''تلامذۂ مصحفی'' مؤلفۂ افسر صدیقی، شیخ شوکت علی پرنٹرز، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۳۴ اور ''گلِ رعنا'' مؤلفۂ سیّد عبدالحیٔ، مطبع ''معارف'' اعظم گڑھ، ۱۳۵۲ھ، ص ۳۹۵ پر یہ شعر اس طرح درج ہے:

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا
بہت آگے گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

شیدا، مرزا قمر الدّین

نام میر اقمر الدّین، شیدا تخلّص، عرفیت میر کلّو۔ شاہ عالم کے پوتے اور بہادر شاہ ظفر کے داماد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ۵۷ سال کی عمر میں انگریزوں نے پھانسی دی۔

منتخب اشعار

عدم سے آئی نہ یارانِ رفتگاں کی خبر — خبر نہیں وہ کہاں جا کے قافلہ ٹھہرا

کہتے نہ تھے ہم اے دل! مت نام لے وفا کا — تُو نے وفا کا ثمرہ خانہ خراب دیکھا؟

ہم نہ کہتے تھے کہ شیدؔا اُس پری وش سے نہ مل — اِک نگہ میں کر دیا، دیکھا نہ، دیوانہ تجھے؟

قیصر دہلوی

نام مرزا خدا بخش، قیصر تخلّص۔ شاہ عالم کے نواسے اور مومن کے شاگرد تھے۔ جھوٹی شہادت کی بنا پر سن رسیدہ مرزا قیصر کو انگریزوں نے پھانسی دی۔

منتخب اشعار

اپنی صورت آئینے میں تم نہ دیکھو ہر گھڑی — کر دیا، دیکھو، اِسی صورت نے دیوانہ ہمیں

چُرا کے مٹھی میں دل کو چھپائے بیٹھے ہیں — بہانہ یہ ہے کہ مہندی لگائے بیٹھے ہیں

نہ جانا حضرتِ زاہد کے تسبیح و مصلّے پر — بڑے چلتے ہوئے حضرت ہیں، ان کو ہم سمجھتے ہیں

بادشاہ، نصیر الدّین حیدر

نصیر الدّین حیدر نام، بادشاہ/ بادشہ تخلّص۔ ۹ر ستمبر ۱۸۰۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ غازی الدّین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدّین حیدر ۲۰ر اکتوبر ۱۸۲۷ء کو فرماں روائے اودھ کی حیثیت سے تخت پر بیٹھے۔ ۸ر جولائی ۱۸۳۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (بادشاہ کو زہر دے دیا گیا) ان کی ایک غزل مشہور ہے جس کے دو اشعار ذیل میں درج ہیں۔

سمایا ہے جب سے تُو نظروں میں میری — جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے

گلستاں میں جا کے ہر اِک گل کو دیکھا　　نہ تیری سی رنگت، نہ تیری سی بو ہے (۱)

انیس، میر ببر علی

میر ببر علی نام، انیس تخلص۔ ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۵ء کے درمیان فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ میر حسن کے پوتے اور میر خلیق کے فرزند تھے۔ اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی۔ شروع میں غزل کہتے تھے اور حزیں تخلص کرتے تھے۔ ناسخ کے ایما پر انیس تخلص رکھا۔ مرثیہ گوئی میں اپنے والد ہی سے استفادہ کیا۔ جب ان کا پورا خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا تو یہ بھی لکھنؤ آ گئے۔ ورزش کے بہت شائق تھے۔ فنون سپہ گری اور فن شہ سواری سے واقف تھے۔ تمام عمر لکھنؤ میں رہے، لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد عظیم آباد اور حیدرآباد (دکن) گئے اور وہاں کی مجلس عزا میں اپنے معرکہ آرا مرثیوں سے لوگوں کو مستفیض اور داخلِ حسنات کیا۔ میر انیس کا کلام جس طرح لاجواب ہے، ان کا اپنے کلام کا پڑھنا بھی بے مثل تھا۔ مولانا شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں انیس کی شاعرانہ کمال کو جس رنگ میں ظاہر کیا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ بقول حالی، ''میر انیس نے مرثیہ کو معراج کمال تک پہنچایا۔'' وہ منظر نگاری، واقعہ نگاری اور سیرت نگاری میں کمال رکھتے تھے۔ ان کا کلام پانچ جلدوں میں شائع ہو گیا ہے۔ ۱۰؍ دسمبر ۱۸۷۴ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے اور اپنے باغ میں دفن ہوئے۔

> میر انیس کی شاعری کا وہ پہلو جس میں دنیا کے بہت سے شاعران کے مدِ مقابل قرار دیے جا سکتے ہیں وہ ان کی انسانی نفسیات سے واقفیت اور اس کی مصوری ہے۔ اس میں محاکاتی شاعری، جذبات نگاری، اجتماعی مواقع کی ہلچل اور ان کی مرقع کشی اور انفرادی کش مکش کے مناظر اور اس کی مصوری کی تمام چیزیں شامل ہیں۔　　(پروفیسر احتشام حسین)

منتخب اشعار

زینب کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذوالجلال　　بچ جائے اس فساد سے خیر النسا کا لال

---

(۱) فقیر محمد گویا نصیر الدین حیدر کے ہم عصر تھے۔ ان کے دیوان میں نصیر الدین حیدر کی مدح میں ایک قصیدہ درج ہے۔ حیدر کی غزل کی زمین میں گویا کی بھی ایک غزل ہے۔ یہ شعر:

گلستاں میں جا کے ہر اک گل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت، نہ تیری سی بو ہے

گویا کی غزل میں بھی شامل ہے۔

یارب! رسولِ پاکؐ کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ، بچوں سے گودی بھری رہے

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی، شباب نہ تھا

بھٹک کے راہ میں پیچھے کہیں نہ رہ جاؤ
اُٹھو انیسؔ اُٹھو، قافلہ روانہ ہوا

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

گل دستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اِک پھول کا مضموں ہو تو سَو رنگ سے باندھوں

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

عمر گزری ہے اِسی دشت کی سیّاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا، میں حُسین ہوں

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

تمام عمر جو کی ہم سے بے رخی سب نے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے مُنہ چھپا کے چلے

انیسؔ دم کا بھروسا نہیں، ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

دل زندگی سے تنگ ہے، جینے سے سیر ہے
پیمانہ بھر چکا ہے، چھلکنے کی دیر ہے

کریم! جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں پہ نہیں عادتِ سوال مجھے

خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کِھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

آبِ رواں سے مُنہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر

اُڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمیں پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا
مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا

پنہاں نظر سے رُوئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں، وہ بیاباں، وہ سحر
دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر

نافے کھلے ہوئے تھے گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد جو جھونکے نسیم کے

شبنم کے وہ گلوں پہ گُہر ہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

خندہ گلوں کو بادِ بہاری نے کر دیا
مُنہ موتیوں سے غنچوں کا شبنم نے بھر دیا

وہ دشت، وہ نسیم، وہ جھونکے، وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بہ جا وہ گہر ہائے آب دار

وہ جھومنا درختوں کا، پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ مہک

پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سَبدِ گل فروش تھے

وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نسیم کے
ہر سُو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی ہے
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی ہے

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

دبیر، مرزا اسلامت علی

مرزا اسلامت علی، نام، دبیر تخلص۔ ۲۹/اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ سات سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ آ گئے۔ شعر و سخن سے قدرتی لگاؤ تھا۔ مرثیہ گوئی کے بچپن سے دلدادہ تھے۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہو گئے اور تھوڑے عرصے میں اپنی ذہانت اور طبعی جودت سے اپنے ہم مشقوں پر سبقت لے گئے۔ تمام عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی۔ ۱۸۵۷ء تک وطن میں رہے۔ ۱۸۵۸ء میں مرشد آباد اور ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد گئے۔ ۹/مارچ ۱۸۷۵ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے اور اپنے مکان میں دفن ہوئے۔

مرثیہ گوئی میں انیس کے بعد دوسری بڑی شخصیت دبیر کی ہے۔ دبیر کے یہاں شوکتِ الفاظ زیادہ ہے۔ میر انیس سے مقابلے میں متانت اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

منتخب اشعار

نہ پھول تھے، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا
چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

فوّارے کو نہ حوض سے گرمی میں کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف، چرخِ کہن کانپ رہا ہے

برقع جو اُٹھ گیا تھا رخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبح ملمّع نقاب کا

لیلاے شب کی رات کو دولت جو لُٹ گئی　　افشاں جبیں سے مہرِ درخشاں کے چھٹ گئی

چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں　　خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب　　دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

مخفی، نواب سلطان جہاں بیگم

نام نواب سلطان جہاں بیگم، مخفی تخلّص۔ مرزا قادر بخش کی بیگم تھیں۔۱۸۵۴ء میں زندہ تھیں۔ ان کا یہ شعر مشہور ہے:

ذرا ان کی شوخی تو دیکھنا، لیے زلف خَم شدہ ہاتھ میں
میرے پاس آئے دبے دبے، مجھے 'سانپ' کہہ کے ڈرا دیا

فیض، میر شمس الدّین

نام میر شمس الدّین، فیض تخلّص۔ ۰۱-۱۸۰۰ء میں برار میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد آصف جاہ ثانی کے زمانے میں دہلی سے حیدر آباد (دکن) آئے۔ فیض کا شمار امرائے دربار آصفی میں ہوتا ہے۔ منصب اور جاگیر سے سرفراز تھے۔ حافظ تاج الدّین مشتاق دہلوی سے تلمذ حاصل تھا جو خواجہ میر درد کے شاگرد تھے ۲۷/نومبر ۱۸۶۶ء کو حیدر آباد (دکن) میں انتقال کر گئے۔ اُن کا مندرجہٗ ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں:

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم
صنم ہم، دیَر ہم، بت خانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم

شناور، صاحب مرزا

صاحب مرزا۔ خلف الصدق شاہ میر خاں، (ابن آغا نصر خاں) فیض آبادی۔ تلمیذ خواجہ حیدر علی آتش۔ عین جوانی میں انتقال ہوا۔ ان کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے:

کب ہے عریانی سے بہتر کوئی دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا

تسکین، میر حسین

میر حسین، نام تسکین تخلص۔ ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شاہ نصیر سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے۔ آخر میں رام پور گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ نواب یوسف علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی۔ ۴؍ اگست ۱۸۵۲ء کو رام پور میں پیوند خاک ہوئے۔ ان کا دیوان دستیاب نہیں، مگر حسرت موہانی نے رام پور کے کتب خانے میں ایک مختصر مجموعہ ان کی غزلوں کا دیکھا ہے۔ جس کو کسی قدر دان سخن نے مرتب کر کے نواب کلب علی خاں کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا تھا۔

منتخب اشعار

خوب صورت نہ ہو کوئی تو نہ ہو بدنامی
سچ تو یہ ہے کہ بُرا ہوتا ہے اچھا ہونا

کوچۂ یار میں تسکیںؔ میں نے
پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

ہم کو طوفِ حرم میں یاد آیا
لڑکھڑانا شراب خانے کا

جس وقت نظر پڑتی ہے اُس شوخ پہ تسکیںؔ
کیا کہیے کہ جی میں مرے کیا کیا نہیں آتا

تسکیںؔ نے لے کے نام ترا وقتِ مرگ آہ
کیا جانے، کیا کہا تھا، کسی نے سنا نہیں

یاں انتظار ہی میں کٹی میری ساری رات
واں، وعدہ کیا کیا تھا، اُنھیں یاد بھی نہیں

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی

ابھی اِس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

تسکیںؔ کروں کیا دلِ مضطر کا علاج اب
کم بخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا

یہ کہہ کے شبِ ہجر میں کرتا ہوں تسلّی
جور نج و مصیبت ہے سو انساں کے لیے ہے

فتنۂ محشر کا تھا سب کو گماں
تجھ کو پہچانا تری رفتار سے

قاصد آیا ہے وہاں سے، تُو ذرا تھم تو سہی
بات تو کرنے دے اُس سے دلِ بے تاب مجھے

بنا تسکیںؔ نہ وہ بت دوست اپنا
بگاڑی کس لیے سارے جہاں سے

شاد لکھنوی

نام شیخ محمد جان، تخلص شاد۔ تقریباً ۱۸۰۵-۶ء میں پیدا ہوئے۔ وطن لکھنؤ تھا۔ شاد فارسی میں مرزا علی اکبر شیرازی اور اردو میں میر حسن عسکری عرفیت میر کلّو عرش (فرزند میر تقی میر) کے شاگرد تھے۔ شاد نے جب ان کی شاگردی اختیار کی تو انھوں نے شاد کو ''پیرِ ومیر'' کا لقب عطا کیا۔ شاد کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا۔ تمام عمر شادی نہیں کی۔ ریاست محمود آباد سے ایک رقم ان کے لیے بطور وظیفہ بغیر کوئی خدمت انجام دیے مقرر تھی۔ ضعیفی میں رعشہ کی وجہ سے لکھنے سے معذور ہو گئے تھے۔ آخر عمر میں کربلائے معلیٰ کی زیارت کی۔ ۱۴/اگست ۱۸۹۹ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ شاد ایک پُرگو شاعر تھے۔ دیوان شاد لکھنوی مرتبہ شیخ حامد حسن، ۱۹۷۰ء میں لاہور سے شائع ہو گیا ہے۔

منتخب اشعار

ہے ساقی ایک، تم بھی ایک اور ایک سی مے ہے ۔۔۔ تو پھر اے مے کشو! آپس میں یہ تکرار کیا باعث

غمِ حبیب مبارک ہے زندگی کے لیے ۔۔۔ چراغ ڈھونڈ لیا ہم نے روشنی کے لیے

نہ تڑپنے کی اجازت ہے، نہ فریاد کی ہے ۔۔۔ گھٹ کے مر جاؤں، یہ مرضی مرے صیّاد کی ہے

جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے ۔۔۔ بھڑکتا ہے چراغِ صبح، جب خاموش ہوتا ہے

خدا کا ڈر نہ ہوتا گر بشر کو ۔۔۔ خدا جانے، یہ بندہ کیا نہ کرتا

جوائے بت! تجھے جلوہ فرما نہ دیکھا ۔۔۔ برابر ہے، دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

شیفتہ، نواب مصطفےٰ خاں

نواب مصطفےٰ خاں نام، شیفتہ تخلص۔ فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۰۹ء کے آخری مہینوں میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم وتربیت کے جو بہترین سامان ہو سکتے تھے وہ ان کو میسر تھے۔ شعروسخن سے فطری مناسبت تھی۔ تلمیذ مومن اور غالب۔ بہت بڑے سخن فہم تھے۔ غالب بھی ان کی سخن فہمی کے مدّاح تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصّہ لینے کے جرم میں قید کی سزا ہوئی۔ بعد میں انھوں نے اپنی ریاست جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر میں سکونت اختیار کر لی۔ سفر حج کے بعد شعروسخن سے دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ زیادہ وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ آپ کے اور مرزا غالب کے گہرے مراسم تھے۔ جب غالب پر افتاد پڑی تو شیفتہ نے ان کی دستگیری کی۔ ستمبر/اکتوبر ۱۸۶۹ء میں دہلی

میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''دیوان اردو،'' ''دیوان فارسی،'' ''مجموعہ انشاے فارسی،'' سفرنامہ موسوم بہ ''ترغیب السالک الی المسالک،'' ''گلشنِ بے خار'' (اردو شعرا کا تذکرہ)

میری راے میں شیفتہ اپنے زمانے کا نہایت اچھا شاعر تھا اور یہ ممکن نہیں کہ مومن اور غالب کے ذکر کے ساتھ اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

وہ مجھ سے خفا ہے تو اُسے یہ بھی ہے زیبا
پر شیفتہ میں اُس سے خفا ہو نہیں سکتا

سب باتیں اُنھی کی ہیں، یہ سچ بولیو قاصد!
کچھ اپنی طرف سے تو تصرّف نہیں کرتا

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟

شیفتہ! ضبط کرو ایسی بھی کیا بے تابی
جو کوئی ہو تمھیں احوال سنانا دل کا

تم لوگ بھی غضب ہو کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا، سحر آہن بنا دیا

اظہارِ عشق اُس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کِیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

ابھی اے شیفتہ! واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

حسرت سے اس کے کوچے کو کیوں کر نہ دیکھیے
اپنا بھی اِس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا؟

اے تابِ برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خار وخسِ آشیاں ہنوز

یوں وفا اُٹھ گئی زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذّت گناہ میں

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم! فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

اُڑتی سی شیفتہ کی خبر کچھ سنی ہے آج
لیکن خدا کرے یہ خبر معتبر نہ ہو

ہاے وہ شیفتہ کی بے تابی
تھام لینا وہ تیرے محمل کو

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

میری خاطر سے چلو شیفتہ واں — خیر ان سے تمھیں نفرت ہی سہی

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر — یہ اہلِ مروّت ہیں، تقاضا نہ کریں گے

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی — میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ — بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے

ہر چند سیر کی ہے بہت تم نے شیفتہ — پر میکدے میں بھی کبھی تشریف لائیے

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا — قاصد وہ بہت الم کریں گے

جس لب کے بوسے غیر لے، اس لب کے شیفتہ — کم بخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے

صابر، مرزا قادر بخش

نام مرزا قادر بخش، صابر تخلّص۔ ۱۸۰۸ء میں لال قلعہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ حافظ عبدالرحمٰن احسان اور امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بنارس چلے گئے۔ وطن کی کشش میں اکثر دہلی آتے رہتے اور اپنے دوستوں سے مل کر واپس چلے جاتے۔ ۱۹؍جون ۱۸۸۲ء کو بنارس میں انتقال کر گئے۔ اردو شاعروں کا تذکرہ ''گلستانِ سخن'' ان کی یادگار ہے۔ ان کا بس ایک ہی شعر انتخاب میں آسکا ہے۔

ہائے پہنچا نہ گیا قیدِ خودی سے اُس تک — اپنے ہی دام سے چھٹنا مجھے دشوار رہا

مہر، سیّد آغا علی

امین الدّولہ سیف الملک سیّد آغا علی خاں بہادر فیروز جنگ، مہر تخلّص۔ تقریباً ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ کانپور میں سکونت تھی۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۰ء میں مقام مقدسہ کی زیارت کے لیے عراق روانہ ہوئے۔ ۱۸۵۲ء میں بمقام کاظمین انتقال کر گئے۔ نجف اشرف میں دفن ہوئے۔ اُن کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے:

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں، پیمبری ہو جائے (۱)

(۱) ''یہ لوگ بھی غضب تھے'' (خاکے اور شخصی مطالعے)، ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۶۳ تا ۶۶

عشق دہلوی

نام حکیم میر عزت اللہ خاں، عشق تخلص۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ثناء اللہ فراق کے شاگرد تھے۔ طب کے ماہر اور شیفتہ کے ہم عصر تھے۔ ان کا یہ شعر دیکھیے:

تم غیر کے گھر بیٹھ کے دل شاد کرو گے
ہم کون ہیں صاحب، ہمیں کیوں یاد کرو گے

بحر، امداد علی

شیخ امداد علی نام، بحر تخلص۔ تقریباً ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ عمر بھر پریشانی اور عسرت میں گزری۔ صحت الفاظ، تحقیق لغت اور فن عروض کے ماہر تھے۔ نواب کلب علی خاں کو خبر ہوئی کہ لکھنؤ میں ایک زبان دان موجود ہے، بلوا بھیجا اور عزت افزائی فرما کر تنخواہ مقرر کر دی۔ عرصے تک رام پور میں رہے۔ آخر وقت میں وطن واپس آ گئے۔ لکھنؤ میں چھوٹی شہزادی دختر امجد علی شاہ کے یہاں سے کچھ وظیفہ ملتا تھا جس سے گزارہ ہوتا تھا۔ افیون کا شوق تھا اور یہ شوق اس زمانے میں شرفا کی محفلوں میں عام تھا۔ ۱۸۷۸ء میں لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ وارفتہ مزاج ہونے کی وجہ سے ان کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب نہ ہو سکا۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے دوست سیّد محمد خاں رند نے ان کا دیوان مرتب کیا۔ ''بحر البیان'' بحر کی مختصر تصنیف ہے جو اُردو زبان کی قواعد کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اِس کا واحد مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے جسے رشید حسن خاں نے مرتّب کر کے شائع کر دیا ہے۔

منتخب اشعار

آمدِ یار کی کیا کیا نہ سنی گرم خبر
عمر بھر راستہ دیکھا، کوئی آیا نہ گیا

میں دوڑ رہا ہوں اس کے پیچھے
جو سائے سے اپنے بھاگتا ہے

شب کو جو روئے یار سے آنچل سرک گیا
اک نور چاندنی کی طرح سے چھٹک گیا

اُس گل بدن کی بوئے بدن کچھ نہ پوچھیے
بندِ قبا جو کھول دیے گھر مہک گیا

اے صنم! اپنی زباں سے نہ کسی بات کو کہہ
فرض ہو جائے گا ناحق کو مسلمانوں پر

ظالم! ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بُرا نہیں

کٹی برسات پھر اس سال بھی فریاد و شیون میں — خبر ہم کو نہیں بادل کدھر آئے، کدھر برسے
کسی کے مُنہ سے نہ نکلا ہمارے دفن کے وقت — کہ ان پہ خاک نہ ڈالو یہ ہیں نہائے ہوئے

جوہر فرّخ آبادی

نام لالا مادھورام، جوہر تخلّص۔ فرّخ آباد (یوپی) میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ جوہر کی پرورش و تعلیم متموّل گھرانے میں ہوئی۔ شاعروں اور ادیبوں کا ان کی کوٹھی پر جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ اپنے استاد منیر شکوہ آبادی کے یہاں مدّتوں رہے۔ خود جوہرؔ بھی کبھی دہلی، لکھنؤ، اور آگرہ جا کر وہاں مہینوں قیام کرتے تھے۔ بہادر شاہ کے آخری دورِ حکومت میں جوہرؔ کو مختار شاہی کے معزز عہدے پر سرفراز کیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں محبّانِ وطن کی حمایت کرنے کے انتقام میں انگریزوں نے ان کی جائیداد ضبط کر لی۔ جوہر فرخ آبادی ۱۸۹۰ء میں وفات پا گئے۔ جوہر کا دیوان ان کی وفات کے بعد ۱۹۰۲ء میں ان کے صاحبزادے شیو پرشاد جوہری نے حسینی پریس، فتح گڑھ میں چھپوا کر شائع کیا۔

منتخب اشعار

اب عطر بھی ملو تو تکلّف کی بُو کہاں — وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینا گلاب تھا (۱)
بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا — تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں (۲)
نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کر — اب جگر تھام کے بیٹھو، مری باری آئی (۳)
شوق سے پیچھے ہمراہ رقیبوں کے شراب — ہم چلے بزم سے، کیوں آپ خفا ہوتے ہیں

نسیم، دیا شنکر

پنڈت دیا شنکر کول نام، نسیم تخلّص۔ ۱۸۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلّق تھا۔ فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ امجد علی شاہ، بادشاہ اودھ کی فوج میں بخشی گری کے عہدے پر فائز تھے۔ ''مثنوی گلزارِ نسیم'' ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ دوسری اِن کی تصنیف ''دیوانِ نسیم'' ہے۔

---

(۱) ''جواہرِ سخن'' (جلد چہارم)، مرتبہ محمد مبین کیفی چریا کوٹی، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۹

(۲) ''خم خانۂ جاوید'' (جلد چہارم)، مؤلفہ لالا سری رام، دہلی، ۱۹۱۱ء، ص ۳۰۳

(۳) ''انتخاب کلام لالا مادھورام جوہر فرخ آبادی، مرتبہ راجندر بہادر موج، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، پہلا ایڈیشن، ۱۹۹۷ء، ص ۵۳

عین جوانی میں ہیضے کے مرض میں ۱۸۴۵ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

''گلزارِ نسیم'' کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے۔ مثنوی ''سحر البیان'' کے بعد مثنوی ''گلزارِ نسیم' سب سے بہتر مثنوی تسلیم کی گئی ہے۔

منتخب اشعار

انسان و پری کا سامنا کیا — مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

لائے اُس بت کو التجا کر کے — کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

ہوتا ہے وہی، خدا جو چاہے — مختار ہے، جس طرح بنا ہے

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے — پتّا نہیں حکم بن ہلا ہے

دونوں کی رہی نہ جان تن میں — کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے — دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے — جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

کس سوچ میں ہو نسیم بولو — آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

ساقی قدحِ شراب دے دے — مہتاب میں آفتاب دے دے

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے — جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے

منیر شکوہ آبادی

سیّد محمد اسماعیل حسین نام، منیر تخلّص۔ ۱۸۱۳ء میں شکوہ آباد، ضلع مین پوری (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ میر علی اوسط رشک سے بھی استفادہ کیا۔ بہت پُر گو تھے۔ مرثیہ بھی کہتے تھے۔ مرثیہ میں دبیر کے شاگرد تھے۔ ناسخ کے ساتھ کانپور، لکھنؤ اور مرشد آباد کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ لکھنؤ سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ فرماں روائے ریاست فرخ آباد اور ریاست باندا کے دربار سے منسلک رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عملی طور سے حصّہ لیا۔ ایک طوائف نواب جان کے قتل میں ملوث کر کے کالے پانی کی سزا ہوئی۔ ۱۸۶۵ء میں رہائی پائی۔ بعد میں نواب رام پور نے زادِ راہ بھیج کر اپنے یہاں بلوالیا۔ وہیں ۱۰/اگست ۱۸۸۰ء کو انتقال ہوا۔ تین دیوان یادگار چھوڑے۔

منتخب اشعار

مہمان ایک رات رہا، صبح چل دیا — خوشبوئی دلھن کی ہمارا شباب تھا

خواب میں آنے کی اُس بت سے قسم لیتے ہیں — نیند بکتی ہوئی مل جائے تو ہم لیتے ہیں

کیا ہاتھ مرے پہنچیں گے دامانِ بتاں تک — اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی

روداد منیرؔ اپنی زمانے سے جدا ہے — دنیا میں کسی سے مری قسمت نہیں ملتی

ان روزوں لطفِ حُسن ہے آؤ تو بات ہے — دو دن کی چاندنی ہے، پھر اندھیاری رات ہے [1]

بیصبر، منشی بال مکند

نام منشی بال مکند، بیصبر تخلّص۔ تقریباً ۱۳-۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ وطن سکندر آباد، ضلع بلند شہر۔ ۱۶ سال کی عمر میں انھوں نے فارسی، عربی کے علاوہ ریاضی میں بھی دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ نجوم، ہیئت، منطق، تصوف اور ویدانت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہؔ ان کے ماموں تھے۔ لہٰذا اپنے ماموں سے عروض اور شاعری کے نکات حاصل کیے اور انھی کی ایما پر غالب کے شاگرد ہو گئے۔ بے صبر نے انگریزی عمل داری میں محکمہ پرمٹ میں ملازمت اختیار کر لی۔ بعد ازاں یہ نوکری چھوڑ کر سہارن پور کلکٹری میں ملازم ہو گئے۔ ۱۸۶۱ء میں جوان بیٹے کی موت سے دل شکستہ ہو کر ۱۸۶۳ء میں پنشن لے کر میرٹھ میں خانہ نشین ہو گئے۔ ۱۳؍ فروری ۱۸۸۵ء کو میرٹھ میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ اردو کے تین دیوان، دیوانِ عام، دیوانِ خاص اور دیوانِ قصائد۔ نثر میں ''ادیب البنات''، ''گلستانِ ہند''، ''بدیع البدائع'' تین کتابیں ہیں۔

منتخب اشعار

بوٹا سا قد، چھریرا بدن، چمپئی سا رنگ — بھولی سی صورت، آنکھ لجائی ہوئی سی ہے

زمیں سے آسماں اور آسماں سے لامکاں پہنچے — تلاشِ یار میں دیکھو کہاں سے ہم کہاں پہنچے

حال سن کر کہا کہ جھوٹ نہ بول — قصّہ کر مختصر، خدا سے ڈر!

کہیں آتے ہو تم نہ جاتے ہو — روز باتیں ہی تم بناتے ہو

موسمِ گل میں مثل برق وسحاب — گہ ہنساتے ہو، گہ رلاتے ہو

(۱) ''دیوانِ منیر شکوہ آبادی'' مطبوعہ سعید پریس، رام پور، سنہ ندارد، ص ۲۰۴

مہر، حاتم علی بیگ

مرزا حاتم علی بیگ نام، مہر تخلص۔ ۱۸۱۵ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں تحصیل دار تھے۔ مہر کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۴۰ء میں سرکاری امتحان پاس کر کے چنار گڑھ، ضلع مرزا پور کے منصب کے عہدے پر فائز رہے۔ وہ عدالت عالیہ ہائی کورٹ کے وکیل بھی تھے۔ آگرہ میں کچھ عرصے آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انھوں نے انگریزوں کو پناہ دی تھی جس کے صلے میں خلعت فاخرہ اور دو گاؤں جاگیر میں سرکار سے عطا ہوئے۔ غالب کے اکثر خطوط ان کے نام اردوئے معلیٰ میں موجود ہیں۔ تاریخ کہنے کا خاص ملکہ تھا۔ مہر کی کئی تصانیف زمانۂ غدر میں تلف ہو گئیں، لیکن کتب ذیل مطبوعہ وغیر مطبوعہ یادگار ہیں:

۱۔ دیوان اردو موسوم بہ ''الماس درخشاں'' ۲۔ پیرایۂ عروض ۳۔ ایاغ فرنگستان۔
۴۔ ''داغِ دل مہر'' (واسوخت) ۵۔ ''مثنوی شعاعِ مہر'' جس کی تعریف مرزا غالب نے اپنے خطوط میں کی ہے۔ ۱۸؍ اگست ۱۸۷۹ء کو انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

تمھارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر — جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

کدھر کا چاند ہوا، مہر کے جو گھر آئے — تم آج بھول پڑے کس طرف، کدھر آئے

مرے گھر میں قدم رنجہ کیا تو سرفرازی کی — نوازش ہے، کرم ہے، مہربانی ہے، عنایت ہے

خورشید، منشی خوش وقت علی

نام منشی خوش وقت علی خاں، تخلص خورشید۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ مرزا فتح الدولہ برق سے تلمذ حاصل تھا۔ منیر شکوہ آبادی کے ہم عصر تھے۔ نواب کلب حسین خاں نادر کے دوستوں میں تھے۔ نواب فرخ آباد کے یہاں ۱۸۴۰ء میں ملازم تھے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار ''ضرب المثل'' کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

منتخب اشعار

پیری میں ولولے وہ کہاں ہیں شباب کے　　　اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے[1]

جب تک ہے روح جسم میں چلتے ہیں ہاتھ پاؤں　　　دولھا کے دم کے ساتھ ہی ساری برات ہے[2]

مشاق لکھنوی

نواب محمد باقر علی خاں عرفیت نواب بنّے صاحب، تخلّص مشاق۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ تعشق لکھنوی، مولوی علی میاں کامل، مہدی حسین ماہر، سیّد عباس حسین فصاحت، ضامن علی جلال لکھنوی اور میر خورشید علی نفیس کے ہم عصر تھے۔ زکی بلگرامی سے تلمذ حاصل تھا۔ آخری عمر میں نواب صاحب رام پور چلے گئے تھے۔ ریاست سے ان کا تعلق بھی ہو گیا تھا۔ وہیں بعمر ۵۰ سال ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو انتقال ہوا۔ آپ کے فرزند نواب محمد مرتضیٰ خاں مشق تخلّص کرتے تھے۔ مشاق لکھنوی کا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے:

ڈھلا ہے حُسن، لیکن رنگ ہے رخسارِ جاناں پر
ابھی باقی ہے کچھ کچھ دھوپ دیوارِ گلستان پر

ناظم، نواب یوسف علی خاں

نواب محمد یوسف علی خاں نام، ناظم تخلّص۔ ۴ر فروری ۱۸۱۶ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ نواب محمد سعید خاں والیٔ رام پور کے فرزند تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شروع میں مومن سے اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد غالب کو کلام دکھانے لگے۔ منطق اور فلسفے کے ماہر تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، مرزا غالب، میر حسین تسکین، مظفر علی اسیر اور دوسرے علما اور شعرا ان کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ یکم اپریل ۱۸۵۵ء کو رام پور میں جلوسِ ریاست نکلا۔ ۲۰ر اپریل ۱۸۶۵ء کو رام پور میں بعارضہ سرطان انتقال کر گئے۔ صاحبِ دیوان تھے۔

منتخب اشعار

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں، کیا بتلاؤں　　　میں نے مے خانے سے کس کس کو نکلتے دیکھا

---

(۱) ''خم خانۂ جاوید'' (جلد سوم)، مؤلفۂ لالا سری رام، دہلی، ۱۹۱۷ء، ص ۷۰

(۲) ایضاً، ص ۷۰

ناظم وفائے عہد کی امید ہو کسے — مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہو گیا

معتقد ہوں کعبے کا ناظم، مگر جا کر وہاں — عبرت آتی ہے کہ کیا بت خانہ خالی ہو گیا

بھید اپنوں سے بھی نہ کہہ ناظم — مُنہ سے نکلی ہوئی پرائی بات

میں نے کہا کہ دعویٔ الفت، مگر غلط — کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

فسانۂ ستمِ ہجر ہے، سوال نہیں — نہ دو جواب، سنے جاؤ، کچھ ملال نہیں

مجھے اُٹھاتے ہو کہہ کر کہ ہے یہ خلوتِ خاص — وہ لوگ کون چلے آتے ہیں، اِدھر دیکھو

رمز دہلوی

مرزا فخر الدّین فتح الملک بہادر معروف بہ مرزا فخرو، تخلّص رمز۔ ۱۸۱۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بہادر شاہ ثانی کے ولی عہد دوم تھے۔ ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالب کو کلام دکھانے لگے۔ ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر — بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا

آنکھیں تو اس کو دیکھ کے ہوتی ہیں بے قرار — دن دیکھے دل تڑپنے لگا اس کو کیا ہوا

نظام رام پوری

نام زکریا شاہ اور نظام شاہ، تخلّص نظام۔ ۱۸۱۹ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ نظام حافظ احمد شاہ سے رام پور میں بیعت تھے۔ ابتدا میں شعر و شاعری میں انھی کے شاگرد ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین بھی ہوئے۔ بعد میں نظام نے علی بخش بیمار جو مصحفی کے شاگرد تھے، ان سے اصلاح سخن لینا شروع کی۔ نظام ریاست رام پور کے سواروں میں ملازم تھے۔ تنخواہ بہت قلیل تھی جس کی وجہ سے مالی پریشانی میں مبتلا رہتے تھے۔ کُلّیات نظام، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور کے تعاون سے چھپ گئی ہے۔ بقولِ غالب: ''نظام رام پور کا میر تھا۔'' ۲۹ر اکتوبر ۱۸۷۲ء کو نظام کا رام پور میں انتقال ہو گیا۔

منتخب اشعار

نامہ بر! اُس نے تو کہا سب کچھ — تُو نے بھی حال کچھ کہا میرا؟

یوں تو روٹھے ہیں، مگر لوگوں سے
پوچھتے حال ہیں اکثر میرا

مُنہ پھیر کے ہنس ہنس کے وہ اقرار کی باتیں
اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں ہوتا

تمھیں یہ بھی کبھی خیال آیا
کہ کوئی راہ دیکھتا ہوگا

اب حالِ نظاؔم کچھ نہ پوچھو
غم ہوگا تمھیں بھی، گر کہوں گا

وہ اشاروں میں اُس کا کہنا ہائے
دیکھو، اپنے پرائے بیٹھے ہیں

اے جان! کہو پھر اُس ادا سے
میں آج نظاؔم سے خفا ہوں

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں، کوئی دیکھتا نہ ہو

چین ملتا نہیں ذرا دل کو
تم سے مل کر یہ کیا ہوا دل کو

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں
کیا مُنہ پہ اس نے رکھ لیے آنکھیں چرا کے ہاتھ

کس کا ہے انتظار، کہاں دھیان ہے لگا
کیوں چونک چونک جاتے ہو آوازِ پا کے ساتھ

دینا وہ اس کا ساغرِ مَے یاد ہے نظاؔم
مُنہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

اب کیا ملیں کسی سے، کہاں جائیں اب نظاؔم
ہم وہ نہیں رہے، وہ طبیعت نہیں رہی

جز اس گلی کے دل نہیں لگتا کہیں نظاؔم
سَو بار ہم تو ساکنِ دیر و حرم ہوئے

ہم دم نہ کہہ وہ بات جو دل کو بُری لگے
اُس بے وفا سے گو مری رنجش ہزار ہے

تسلیم لکھنوی

احمد حسین نام، لیکن امیر اللہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ تخلص تسلیم۔ ۲۰-۱۸۱۹ء میں منگلیسی نواح فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ فن خوشنویسی کے استاد تھے۔ اصغر علی نسیم کے شاگرد تھے۔ ان کے والد محمد علی شاہ کے عہد میں فوج میں ملازم تھے۔ ان کی علاحدگی کے بعد تسلیم ان کے عہدے پر فائز ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ان کی پلٹن توڑ دی گئی اور وہ بے کار ہو گئے۔ اس کے بعد وہ شعرائے شاہی کے زمرے میں داخل ہو گئے اور ۳۰/روپیہ ماہوار ملنے لگے۔ زوال سلطنت کے بعد یہ رام پور چلے گئے۔ وہاں انھیں کوئی ملازمت نہ ملی۔ یہ لکھنؤ واپس آئے اور نول کشور کے مطبع میں ملازم ہو گئے۔ جب نواب کلب علی خاں ریاست کے حکمران بنے تو ان کے ایما پر یہ رام پور آ گئے جہاں ڈپٹی انسپکٹر، مدارس مقرر ہوئے۔ کلب علی خاں کی رحلت کے بعد ٹونک ہوتے ہوئے

منگرول پہنچے۔ کچھ دنوں بعد نواب حامد علی خاں والئ رام پور کی طلبی پر پھر رام پور آ گئے اور ازراہِ قدر دانی چالیس روپیہ پنشن مقرر ہو گئی جو ان کو آخر وقت تک ملتی رہی۔ تسلیم نے اپنی عمر کا زیادہ حصّہ افلاس اور تنگ دستی میں بسر کیا۔ ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں ۹۶ برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ تین دیوان اور متعدد مثنویاں یادگار چھوڑیں۔ حسرت موہانی انھی کے شاگرد تھے۔

تسلیم لکھنوی نے مشکل ردیف اور قوافی کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ ان کے یہاں وہ نسائیت مضمون یا محاورہ میں نہیں ملتی جو عام لکھنوی شعرا کے یہاں بہ کثرت موجود ہے۔ صاف اور سادہ اشعار ان کے یہاں بہ کثرت ہیں جن میں تغزل کی شان پوری موجود ہے۔

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منتخب اشعار

آبرو گر چاہتا ہے کنجِ خلوت کر قبول — قطرۂ نیساں صدف میں آ کے گوہر ہو گیا

اللہ رے اضطراب تمنائے دیدِ یار — اک فرصتِ نگاہ میں سَو بار دیکھنا

تسلیم رُوئے یار کو حسرت کی آنکھ سے — اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا اے دشتِ جنوں — اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

نالہ کھنچا ہے، دل ہے خفا، شوق ہے اُداس — تُو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

کچھ کہہ دو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے — توڑو نہ آسرا دلِ امیدوار کا

تسلیم کس کے واسطے بیٹھو ہو، گھر چلو — کیا اعتبار، وعدۂ بے اعتبار کا

یاد میری آ گئی، مُنہ پھیر کر رونے لگے — انجمن میں ان کی جب ذکرِ وفا ہونے لگا

خوب رویا بیٹھ کر واماندگی کی جان کو — جب مری نظروں سے پنہاں قافلہ ہونے لگا

رکھ کے مُنہ سو رہا ان آتشیں رخساروں پر — چین تھا دل کو تو نیند آ گئی انگاروں پر

شمع کے مانند چمکے سر اُتر جانے کے بعد — زندگی بخشی خدا نے ہم کو مر جانے کے بعد

چاہیے انسان کو ہر وقت حفظِ آبرو — پھر گہر رہتا نہیں آب گہر جانے کے بعد

ہر وقت یار تھا رگِ جاں سے قریب تر — تسلیم تُو خراب پھرا عمر بھر کہاں

ہنستے ہیں گل بھی دیکھ کے اپنی خبر نہیں — گویا چمن میں چاک گریباں ہمیں تو ہیں

کعبے کا ارادہ کیے نکلے تو ہیں گھر سے — آ جائے وہ بت سامنے اس دم تو مزا ہو

شکستہ پا ہوں کہیں ساتھ سے نہ رہ جاؤں
مجھے بھی ہاتھ ذرا دوستو لگائے چلو

بخت برگشتہ ہے اچھی بھی بُری ہو جائے گی
دوستی جس سے کروں گا دشمنی ہو جائے گی

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

تھی تمنا باغِ عالم میں گل و بلبل کی طرح
بیٹھ کر ہم تم کہیں، اے یار! ہنستے بولتے

افسانہ گو نے اور بھی بے خواب کر دیا
ظالم سنا رہا ہے مری داستاں مجھے

جی میں آتا ہے کہ اک دن مر کے ہم
ہمّتِ دوشِ عزیزاں دیکھ لیں

التفاتِ جوشِ وحشت پھر کہاں
ہو سکے جب تک، بیاباں دیکھ لیں

گر انھیں ہے خوفِ عرضِ آرزو
دُور سے حالِ پریشاں دیکھ لیں

مذاق بدایونی

نام سیّد شاہ محمد دلدار علی، مذاق تخلّص۔ ۲۸ر دسمبر ۱۸۱۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آبائی نسب حضرت صدیق اکبر تک پہنچتا ہے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں آپ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ آتش اور ناسخ کے مشاعروں میں شریک ہوئے اور عیار تخلّص رکھا۔ عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ پیدا کی۔ اس کے بعد دہلی گئے اور ذوق کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ خوش گفتار، سلیم الطبع، نہایت خلیق اور سنت رسول اللہؐ سے سرشار تھے۔ نمود و نمائش سے کوسوں دور تھے۔ آپ کو ایک نسبت خاص شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ غریب نواز شیخ معین الدّین چشتی سے تھی۔ جب تک دہلی میں رہے، مومنؔ اور غالبؔ کے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ جب ان کے اعزّا کو معلوم ہوا کہ یہ دہلی میں قیام پذیر ہیں تو ان کو دہلی سے بدایوں بلوا لیا۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۹۴ء کو بدایوں میں وفات پا گئے۔ ہر سال ان کے مزار پر تین دن عرس ہوتا ہے۔ ان کے دیوان میں غزلوں کی تعداد کم ہے، زیادہ تعداد حمد، نعت، منقبت، مسدّس، مثنوی کی ہے۔

منتخب اشعار

روتے ہیں، پر نہیں معلوم سبب رونے کا
پڑ گیا دل کو مزہ ہائے غضب رونے کا

ہم سے وحشی نہیں ہونے کے گرفتار کبھی
لوگ دیوانے ہیں زنجیر لیے پھرتے ہیں

اللہ رے شوقِ قتل کہ اپنے ہی ہاتھ سے
اپنی ہی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

حیرت الہ آبادی

نام محمد جان خاں، حیرت تخلّص ۔ وطن الہ آباد تھا۔ مرزا اعظم علی اعظم شاگرد آتش سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کے دادا جہانگیر خاں فوج میں رسالدار تھے۔ ۱۸۹۲ء تک زندہ تھے۔ صاحبِ دیوان تھے۔

منتخب اشعار

اپنا ہی حال تک نہ کھلا مجھ کو تا بہ مرگ　　میں کون ہوں، کہاں سے چلا تھا، کہاں گیا

یہ عکس ہے تمھارے رُخِ بے نقاب کا　　یا آئینے میں پھول کھلا ہے گلاب کا

روتا ہوا آتا ہے خراباتِ جہاں میں　　ہنستا ہوا دنیا سے بشر جائے تو اچھا

حیرت جمال جلوۂ جاناں کہاں نہیں　　کعبے میں بھی وہی ہے، وہی ہے کنشت میں

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں　　سامان سَو برس کے ہیں، کل کی خبر نہیں

اختر، واجد علی شاہ

سلطان عالم حضرت محمد واجد علی، تخلّص اختر۔ ۱۹ر جولائی ۱۸۲۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو تخت نشین ہوئے شاعری کا شوق پیدائشی تھا۔ انھیں فن تعمیر سے بے حد شوق تھا۔ قیصر باغ کی تعمیر کی جس پر تقریباً دو کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ یہاں برسات میں ایک خاص میلہ ہوتا تھا۔ شروع میں کچھ عرصہ انتظام مملکت کی طرف توجہ کی۔ بعد میں خود غرض مصاحبوں اور بد خواہ ہم نشینوں نے عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ ۷ر فروری ۱۸۵۶ء کو انگریزوں نے سلطنت سے معزول کر دیا۔ قلعہ فورٹ ولیم، کلکتہ میں ڈیڑھ دو سال نظر بند رہنے کے بعد مٹیا برج، کلکتہ میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں بھی عالیشان کوٹھیاں اور باغات تعمیر کرائیں۔ ان کا کلکتے کا چڑیا خانہ دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ فن موسیقی علی الخصوص ناچنے اور بتانے کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی ٹھمریاں اور دادرے جس میں وہ جانِ عالم پیا تخلّص کرتے تھے، اب تک لکھنؤ میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ مظفر علی اسیر اور فتح الدّولہ برق سے اصلاح لیتے تھے۔ ۲۱ر ستمبر ۱۸۸۷ء کو مٹیا برج، کلکتہ میں انتقال کر گئے۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کی متعدّد تصانیف ہیں۔ انھوں نے کم و بیش ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

منتخب اشعار

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں — لکھنؤ پھر کبھی دکھلائے مقدّر میرا

مجھی کو، واعظا! پند و نصیحت — کبھی اُس کو بھی سمجھایا تو ہوتا

وسعتِ خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حُبِّ وطن — تنگیٔ گور سے بدتر ہے فضائے غربت

یوں تو شاہانِ جہاں پر ہے پڑا وقت، مگر — ختم ہے اخترِ بے کس پہ جفائے غربت

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں — رخصت اے اہلِ وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں (۱)

عاشق کو نہ اس قدر ستاؤ — پچھتاؤ گے، اب بھی باز آؤ

ہم تو اُٹھتے ہیں اب جہاں سے — چاہو جسے، پاس تم بٹھاؤ

تعشق لکھنوی

نام سیّد میرزا عرفیت سیّد صاحب، تخلّص تعشق۔ ۱۱ر مارچ ۱۸۲۴ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سیّد محمد میرزا اُنس کے صاحبزادے تھے اور انھی کے شاگرد تھے۔ ایک عرصے تک کربلا میں قیام کیا۔ اپنے بڑے بھائی میر عشق کے انتقال کے بعد وطن واپس آ گئے۔ میر انیس کو ان کے ساتھ بہت محبت تھی اور یہ ان کی صحبت سے بہت فیض یاب ہوئے۔ مرثیہ اور غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ ۱۲ر اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

بھرے ہیں آنکھ میں آنسو، اُداس بیٹھے ہو — یہ کس غریب کی تربت کے پاس بیٹھے ہو

قفس میں بھی ہے اسیرو! تمھیں وہی سودا — لگائے فصلِ بہاری کی آس بیٹھے ہو

مرا پیام صبا! میرے گل سے کہہ دینا — چلی گئی مجھے بے ہوش کر کے بو تیری

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا — کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

ہمارے بعد یہ ہے حال ہم صفیروں کا — اِس آشیاں میں صدا دی، اُدھر پکار آئے

چھوٹ جائیں ہم عذابِ ہجر سے — اب تو ایسی کوئی صورت کیجیے

مفت میں مر جائیں گے بیمارِ ہجر — دیکھیے، اِتنی نہ غفلت کیجیے

---

(۱) ''جانِ عالم'' (واجد علی شاہ کے مٹیابرج کے حالات)، مؤلفہ عبدالحلیم شرر، ادارۂ فروغِ اردو، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۲۰ اور ۲۱۔ مصرعِ اولیٰ یوں مشہور ہے: خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

سالک، قربان علی بیگ

نام قربان علی بیگ، سالک تخلّص۔ نومبر/دسمبر ۱۸۲۴ء میں حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں نشو ونما ہوئی۔ پہلے قربان تخلّص کرتے تھے اور مومن سے اصلاح لیتے تھے۔ مومن کے انتقال کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلّص اختیار کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں الور چلے گئے جہاں کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد حیدر آباد، دکن گئے اور وہاں محکمۂ تعلقات میں سر رشتے دار مقرر ہوئے۔ حیدر آباد میں ''مخزن القواعد'' کے نام سے ایک اردو رسالہ زیر سر پرستی نواب عماد الملک بہادر نکلتا تھا، سالک کچھ عرصے تک اس کے مدیر رہے۔ جون ۱۸۸۰ء میں حیدر آباد (دکن) میں انتقال کر گئے۔ ''کلّیاتِ قربان علی سالک''، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور کے تعاون سے چھپ گئی ہے۔

سالک کے کلام میں اکثر ترکیبیں غالب کی ترکیبوں سے ملتی جلتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ان کے کلام کی خوبی کا بڑا سبب ہے۔ (حسرت موہانی)

منتخب اشعار

دل کو کیا جانے کیا ہوا سالکؔ — چین کیوں رات بھر نہیں آتا

نہیں اک بار بھی اب سننے کی طاقت دل میں — پہلے سَو بار ترا نام لیا کرتا تھا

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی — بے وفا تو بھی اسے لے کے پشیماں ہوگا

کس کو دل دیتے ہو، کیا کرتے ہو سالکؔ — ہائے نادان بنے جاتے ہو، دانا ہو کر

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں بجا — میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

تم آ گئے تو ہوش کہاں، میزباں ہو کون — آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم

پھرتے ہیں دادخواہ ترے حشر میں خراب — تُو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

کہاں ہم اور کہاں سالکؔ وہ ہنگامے محبت کے — اب اک گوشے میں بیٹھے ہیں، خدا کو یاد کرتے ہیں

برسوں گزاری دشت نوردی میں کیوں کہ قیس — ہم سے تو رات کٹ نہ کسی انتظار کی

زباں کٹ جائے گر لب سے تمھارا کچھ گلا نکلے — مگر یہ تو کہوں گا تم کو کیا سمجھا تھا کیا نکلے

جو پاس ہیں میرے وہ خدا جانے کہاں ہیں — تم دور ہو پر بیٹھے ہو گویا مرے آگے

اس کے آنسو ٹپک پڑے سالکؔ　　　حال اس درد سے کہا تو نے

صیّاد اور قیدِ قفس سے کرے رہا　　　جھوٹی خبر کسی کی اُڑائی ہوئی سی ہے

تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ　　　تندرستی ہزار نعمت ہے

شرر، مرزا صادق

نام مرزا صادق، تخلّص شرر۔ ۱۸۲۵ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔ تارک الدّنیا تھے۔ ان کا یہ شعر زباں زدِ خاص وعام ہے:

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

ظہیر دہلوی

سیّد ظہیر الدّین حسین نام، ظہیرؔ تخلّص۔ ۱۸۲۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں آپ فارسی کی درسی کتابیں اور عربی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھنے پائے تھے کہ دربارِ شاہی میں ملازم ہو گئے۔ ان کے والد خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ ظہیر ترقّی کر کے بہادر شاہ ظفر کے داروغۂ ماہی ومراتب مقرر ہوئے اور راقم الدّولہ خطاب پایا۔ شعر وسخن کا شوق کم سنی سے تھا۔ ذوق کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پہلے بریلی پھر رام پور چلے گئے۔ وہاں چار سال رہے، اس کے بعد دہلی آئے اور محکمہ چونگی میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد اخبار ''جلوۂ طور'' کے اڈیٹر ہو گئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ مہاراجا الور نے ان کے مضامین کو بہت پسند کیا اور ان کو الور بلا لیا۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو کر جے پور میں تقریباً انیس برس رہے۔ پندرہ برس ٹونک میں رہے۔ آخری عمر میں حیدر آباد (دکن) چلے گئے اور وہیں مارچ ۱۹۱۱ء میں انتقال ہوا۔ چار دیوان ان کی یادگار ہیں۔

مجموعی حیثیت سے ظہیرؔ کی شاعری دلّی کی اصلی اور قدیم شاعری کا ایسا نمونہ ہے جس کی مثال ان کے بعد اور کسی کے کلام میں نہیں مل سکتی۔ (مولانا حکیم سیّد عبدالحئی)

منتخب اشعار

بہت ظہیرؔ کو ہم یاد کر کے واں روئے　　　کہیں جو ذکر حریفانِ بادہ خوار آیا

ظہیرؔ آؤ چلو اب مے کدے کو　　　نکالا زہد وتقویٰ ہے کہاں کا

قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے
بڑھا جاتا ہے یاں شوقِ سجودِ آستاں کیا کیا

اعجاز دلفریبیٔ انداز دیکھنا
ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا

کیا بُری شے ہے محبت بھی، الٰہی توبہ
جرم ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں

وہ ہیں اور غیر ہیں اور عیش کے سامان ظہیرؔ
ہم الگ سب سے گنہگار بنے بیٹھے ہیں

یوں تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ہم ان کو چھوڑ بیٹھے ہیں
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروّت آ ہی جاتی ہے

پان بن بن کے مری جان کہاں جاتے ہیں
یہ مرے قتل کے سامان کہاں جاتے ہیں

شرف، آغا جو

سیادت حسن سیّد جلال الدّین حیدر خاں نام، عرفیت آغا جو، شرف تخلّص۔ تقریباً ۱۸۱۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ میرزا حامد علی کوکب، ولی عہد واجد علی شاہ کے خسر تھے۔ ۶۴-۱۸۶۳ء میں جب کہ اودھ کا خاندان شاہی اپنی اقبال کی داستان ختم کر چکا تھا اور کلکتے کے مٹیا برج میں قیام پذیر تھا، یہ بھی ولی عہد کے ہمراہ وہاں موجود تھے۔ ۱۸۸۷ء سے قبل وفات پا گئے۔ آغا جو شرف سے تین تصانیف یادگار ہیں۔ ''شکوۂ فرنگ''، ''افسانۂ لکھنؤ'' اور ''دیوانِ شرف''۔

منتخب اشعار

ٹھہرا گیا ہے لا کے جو منزل کے سامنے
کیا جانے رہنما تھا کہ رہزن تھا، کون تھا؟

شاخِ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

دردِ دل بھی انھیں صیّاد نے کہنے نہ دیا
رہ گئے مرغِ قفس کھول کے منقاروں کو

جُھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی، دل نہ ہمارا ٹھہرا

نکل کے جاؤں کہاں تیری انجمن کے سوا
چمن کی بو ہوں بسوں پھر کہاں چمن کے سوا

ذکر آئے خوشی کا تو نکل پڑتے ہیں آنسو
ہم ایسے ستم دیدہ ہیں، دکھ پائے ہوئے ہیں

عالم میں حُسن و عشق کا افسانہ رہ گیا
یوسف ہی رہ گئے نہ خریدار ہی رہا

آزاد، کپتان الیگزینڈر ہیڈرلی

نام کپتان الیگزینڈر ہیڈرلی (Alexander Hederley)، آزاد تخلص۔ ولادت تقریباً ۱۸۲۹ء۔ ان کے والدان چند یورپین میں سے تھے جنھیں ہندوستان کی آب وہوا نے گرویدہ بنالیا تھا۔ آزاد کے والد نے ہندوستانی عورت سے شادی کر لی تھی اور ہندوستان کی طرز معاشرت اختیار کر لی تھی۔ آزاد کی تربیت وپرورش دہلی کے شرفائے اسلام کے مانند ہوئی اور یہاں کی صحبتوں نے ان میں شعروسخن کا مذاق پیدا کر دیا تھا۔ آزاد کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ مشورہ سخن نواب زین العابدین عارف سے لیتے تھے۔ آزاد کے دیوان میں غزلیات کے علاوہ دیگر اصناف سخن بھی ہیں۔ وفات ۷؍جولائی ۱۸۶۱ء، الور۔

منتخب اشعار

ہم نے دکھا دکھا تری تصویر جا بجا — ہر اک کو اپنی جان کا دشمن بنا لیا

عیاں ہے سب میں، کہاں ہے مخفی، کب اُس کا جلوہ نقاب میں ہے — قصور اپنی نگاہ کا ہے، وگرنہ کب وہ حجاب میں ہے

امیر مینائی

امیر احمد مینائی نام، امیر تخلص۔ ۲۱؍فروری ۱۸۲۹ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے تعلق تھا اس لیے مینائی کہلائے۔ عربی وفارسی کی تعلیم دستور کے مطابق ہوئی۔ طب، جفر اور نجوم سے بھی واقف تھے۔ اپنے علم وفضل اور قابلیت میں اپنے معاصرین سے ممتاز تھے۔ شعروسخن کا شوق بچپن سے تھا۔ مظفر علی اسیر سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق قائم ہوا اور ان کے حکم سے دو کتابیں ''ارشاد السلطان'' اور ''ہدایت السلطان'' تصنیف کیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد رام پور چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں نے انھیں اپنا استاد مقرر کیا۔ رام پور میں ۴۳ برس بڑی عزت وآرام سے زندگی بسر کی اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ نواب کے انتقال کے بعد داغ کے ایما پر امیر مینائی حیدر آباد (دکن) گئے اور وہیں ۱۳؍اکتوبر ۱۹۰۰ء کو انتقال ہوا۔

''مرآۃ الغیب'' اور ''صنم خانۂ عشق'' دو دیوان ان کی یادگار ہیں۔ تیسرا دیوان ''محامد خاتم النبین'' نعت کا مجموعہ ہے۔ ''امیر اللغات'' کی صرف دو جلدیں الف ممدودہ اور الف مقصورہ شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ان کی

نثر و نظم میں متعدّد تصانیف ہیں۔

ریاض خیر آبادی، جلیل مانک پوری، مضطر خیر آبادی اور حفیظ جون پوری ان کے مشہور شاگرد ہیں۔ وہ ایک مسلّم الثبوت استاد تھے۔ ان کے کلام میں صحتِ زبان اور فنّی پختگی بہت نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں سقم مشکل ہی سے ملے گا۔

منتخب اشعار

یاد جب مجھ کو مدینے کی فضا آتی ہے — سانس لیتا ہوں تو جنّت کی ہوا آتی ہے

مدینے جاؤں پھر آؤں دوبارہ پھر جاؤں — تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

بلاؤ جلد مدینے میں، ہے امیرؔ کو خوف — کہیں نہ عمرِ دوروزہ تمام ہو جائے

قریب ہے یار روزِ محشر چھُپے گا کشتوں کا قتل کیوں کر — جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا(۱)

مرغانِ باغ! تم کو مبارک ہو سیرِ گل — کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

دلبری سے کام ہے، ہم کو دل آزاری سے کیا — یار کی یاری سے مطلب اس کی عیّاری سے کیا

ہلتی نہیں ہوا سے چمن میں یہ ڈالیاں — مُنہ چومتے ہیں پھول عروسِ بہار کا

شاخوں سے برگِ گل نہیں جھڑتے ہیں باغ میں — زیور اُتر رہا ہے عروسِ بہار کا

زیست کا اعتبار کیا ہے امیرؔ — آدمی بلبلہ ہے پانی کا

بت بن کے وقتِ نزع نہ بالیں پہ میرے بیٹھ — ہوتا ہے آج خاتمہ گفت و شنید کا

کہتے ہیں دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیرؔ — دیکھو تو چار روز میں کیا حال ہوگیا

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے — تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں — شوقِ دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر

بہارِ لالہ و گل پھر کبھی کا ہے کو دیکھیں گے — چلے ہیں اِس چمن سے ہم نگاہِ واپسیں ہو کر

قدم کو لغزش، زباں کو لکنت، ہے رعشہ ہاتھوں کو، سر کو جنبش — کدھر گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں ہمیں پھنسا کر

گرہ سے کچھ نہیں جاتا ہے پی بھی لے زاہد! — ملے جو مفت تو قاضی کو بھی حرام نہیں

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں — بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

یہ چرچے، یہ صحبت، یہ عالم کہاں — خدا جانے کل تم کہاں، ہم کہاں

(۱) ''دیوانِ امیر معروف بہ مرآۃ الغیب''، مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء، ص ۹۸، مصرعِ اولیٰ میں ''قتل'' کے بجائے ''خون'' مشہور ہے۔

اپنی محفل سے عبث ہم کو اُٹھاتے ہیں حضور
چپکے بیٹھے ہیں الگ، آپ کا کیا لیتے ہیں

اے برق! تُو ذرا کبھی تڑپی، ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

کبابِ سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جل اُٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذّت ہے اگر دل میں مزا ہو

دل ہی نہ رہا، اُمید کیسی
جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

اپنی کہو، گزرتی ہے کس طرح اے امیرؔ
ہم ہیں فقیر لوگ، ہماری بھلی کہی

ہے آج جو سرگذشت اپنی
کل اِس کی کہانیاں بنیں گی

پوچھو نہ اس زمانے میں الفت کا حال کچھ
اِک رسم تھی قدیم، سو موقوف ہو گئی

کہانی مرے درد کی کچھ نہ تھی
مگر ساری محفل کو رلوا گئی

جو ہے بہار، اُس کو خزاں کا خطر بھی ہے
اے باغ باں! بسنت کی تجھ کو خبر بھی ہے

ہم چلے دَیر سے کعبے کو تو وہ بت بولا
جا کے لے لیجیے، کعبے میں خدا رکھا ہے

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصّے پہ پیار آتا ہے

باقی ہے امیرؔ اب تو فقط جان کا جانا
ہوش و خرد و تاب و تواں جا چکے کب کے

شورِ محشر امیرؔ کو نہ جگا
سو گیا ہے غریب، سونے دے

اِک کنارے پڑا ہوا ہے امیرؔ
کچھ تمھارا غریب لیتا ہے!

ذکرِ ہُو کس دلِ وحشی نے کیا ہے کہ امیرؔ
وہی آواز چلی آتی ہے ویرانے سے

ہم فقیروں کو کہاں حوصلۂ وصل امیرؔ
مہرباں اُس کو جو پایا تو کبھی جا بیٹھے

ہوئے نام ور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیرؔ
کیوں مری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفات دلِ دوستاں رہے نہ رہے

وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں بُرا — ہم برے سب سے ہوئے جن کے لیے
ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا — میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے
آنکھیں دکھلاتے ہو، جوبن تو دکھاؤ صاحب — وہ الگ باندھ کے رکھا ہے، جو مال اچھا ہے

وحید الہ آبادی

مولوی وحید الدّین نام، وحید تخلّص۔ ۱۸۲۹ء میں قصبہ کٹرا ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ زمانے کے دستور کے مطابق فارسی، عربی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ آتش کے ایک شاگرد شیخ بشیر علی بشیؔر سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ وحیدؔ اکبر الہ آبادی کے استاد تھے۔ ایک مرتبہ وحید کے گھر میں آگ لگی۔ ان کو اپنا دیوان یاد آیا جو اُن کی ساری عمر کی کمائی تھی۔ اُس کو نکالنے کے لیے کوٹھری میں گئے۔ دیوان تو ہاتھ لگ گیا، مگر دھواں گھر میں اتنا بھر گیا تھا کہ نکلنے کا راستہ ان کو نہ ملا۔ جب لوگ انھیں تلاش کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا، دیوان ہاتھ میں ہے، ایک کرسی پر بیٹھے ہیں اور دم نکل چکا ہے۔ وفات: ۹؍ اپریل ۱۸۹۲ء، کٹرا، الہ آباد۔

منتخب اشعار

کچھ کہہ کے اُس نے پھر مجھے دیوانہ کردیا — اِتنی سی بات تھی، جسے افسانہ کر دیا
یہ نہ پوچھو مجھے الفت نے دکھایا کیا کیا — کچھ جواب اِس کا نہیں، آنکھ میں آنسو کے سوا
فقط اظہارِ الفت سے ہوئے وہ جان کے دشمن — اِسی قصّے کو اُن سے اَور پیرائے میں کہنا تھا
یہ سُوئے دَیر و حرم کیوں گئے برہمن و شیخ — خیالِ یار میں آنکھوں کو بند کیوں نہ کیا؟
کیا بتاؤں، کس قدر زنجیرِ پا ثابت ہوئے — چار تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں
ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا — دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو
رہ گیا راز دل کا سربستہ — یہ کلی اب نہیں چٹکنے کی
کہا عمر بھر ہم نے دل کا فسانہ — کبھی آخرِ داستاں تک نہ پہنچے
محبت بھی ہوا کرتی ہے، دل بھی دل سے ملتا ہے — یہ سب ہوتا ہے، لیکن آدمی مشکل سے ملتا ہے

سیّاح، میاں داد خاں

نام میاں داد خاں، تخلّص سیّاح۔ ۳۰-۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل وطن اورنگ آباد تھا، لیکن ان کے خاندان نے گردشِ روزگار کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر سورت میں سکونت اختیار کرلی۔ یہ مرزا غالب کے دوست اور شاگرد تھے۔ مشورۂ سخن کے لیے اکثر ان کا دہلی آنا ہوتا تھا۔ سیّاحت کے بہت شوقین تھے۔ ابتدا میں عشاق تخلّص کرتے تھے۔ غالب نے ان کے شوق سفر کی مناسبت سے تخلّص سیّاح رکھا۔ سیّاح نے پنجاب، بنگال، کشمیر، عرب اور دوسرے کئی ملکوں کی سیر کی تھی۔ سفر میں روپیہ بے حساب خرچ کرتے تھے۔ عرصہ دراز تک سیّاح نوٹ بناتے رہے۔ ایک اسٹیشن پر انھوں نے ٹکٹ کے لیے سو روپے کا نوٹ بھنایا۔ ان کی بدقسمتی سے فوراً ہی دوسرا مسافر بھی اسی نمبر کا سو کا نوٹ لے کر ٹکٹ خریدنے آ گیا۔ تفتیش کے بعد ان پر مقدمہ چلا اور چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔ خوش قسمتی سے جیلر اُن کے علم وفضل کا قدرداں تھا، چناں چہ قید خانے میں ممکنہ مراعات حاصل ہوگئیں۔ اس دَوران میں ملکہ وکٹوریا کی سلور جوبلی کا موقع آیا تو سیّاح نے مدحیہ قصیدہ جیلر کے توسّط سے اجازت نامہ حاصل کر کے ملکہ کو بھجوایا، جس کے صلے میں اُسیری کی مدّت میں کئی سال کی تخفیف ہوگئی۔ رہائی کے بعد سیّاح نے سیّاحت ترک کردی۔ بقیہ زندگی سورت میں بہت سخت گزری۔ کہتے ہیں سیّاح کا ایک دیوان کسی میر صاحب کی بکری کھا گئی۔ وفات ۱۹۰۷ء سورت۔ سیّاح کی ایک تصنیف ''سیر سیّاح'' ہے۔ یہ ان کا شمالی ہند کا سفر نامہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی تصانیف ان سے منسوب ہیں۔

منتخب اشعار

جہاں کی سیر تو کی تُو نے، لیکن اے شہِ حسن!   کبھی فقیر کے تکیے پہ تُو نہ آ نکلا

قیس جنگل میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو   خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

زندگی میں تو بہت عیش اُٹھائے سیّاحؔ   اب مناسب ہے کہ فکرِ رہِ عقبیٰ کیجے

داغ، نواب مرزا خاں (ابراہیم)

اصل نام نواب ابراہیم، لیکن بعد میں مرزا خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ داغ تخلّص تھا۔ ۲۵ رمئی ۱۸۳۱ء کو دہلی کے محلّہ چاندنی چوک میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نواب شمس الدّین خاں تھا۔ مسٹر فریزر، ایجنٹ ٹو گورنر جنرل، دہلی کے قتل کے سازش میں نواب شمس الدّین کو انگریزوں نے اکتوبر ۱۸۳۵ء میں پھانسی دے دی، چناں چہ ان کی

والدہ انھیں ریاست لوہارو سے لے کر دہلی آ گئیں۔ داغ کی والدہ نے مرزا فخرو، ولی عہد، بہادر شاہ سے شادی کرلی۔ ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ پہنچے جہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ چوں کہ بہادر شاہ ظفر اور مرزا فخرو دونوں ذوق کے شاگرد تھے، لہٰذا داغ بھی ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد داغ رام پور چلے گئے۔ ولی عہد ریاست نواب کلب علی خاں بہادر کے مصاحب مقرر ہوئے اور داروغہ اصطبل کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ اپنی عمر کے ۲۴ سال رام پور میں عیش و آرام سے زندگی بسر کی۔ نواب کے ہمراہ حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ نواب کلب علی خاں کی موت کے بعد انھیں رام پور چھوڑنا پڑا۔ مختلف مقامات میں ٹھہرتے ہوئے ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد (دکن) پہنچے جہاں میر محبوب علی آصف کے استاد مقرر ہوئے۔ آخر عمر تک حیدر آباد میں رہے۔ ۱۴ر فروری ۱۹۰۵ء کو حیدر آباد (دکن) میں انتقال کر گئے۔

ان کے کلام کی خوبی لطف زبان ہے۔ چار دیوان ''گلزارِ داغ''، ''آفتابِ داغ''، ''مہتابِ داغ'' اور ''یادگارِ داغ'' ان کی یادگار ہیں۔ ایک مشہور طوائف منّی جان حجاب رام پور کا میلہ ''بے نظیر'' دیکھنے کے لیے کلکتے سے آئی تھی۔ داغ کو اس کے ساتھ عشق ہو گیا تھا۔ اپنے عشق کا حال ایک مثنوی ''فریادِ داغ'' میں شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ داغ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مشہور و معروف یہ ہیں۔ علّامہ اقبال، محمد علی جوہر، آغا شاعر قزلباش، سیماب اکبر آبادی، سائل دہلوی، بیخود دہلوی، نوح ناروی، احسن مارہروی، حسن بریلوی، ناطق کلاوٹھوی، جوش ملسیانی۔

> جس حد تک زبان کی صفائی و بیان کی سلاست، محاورات کی برجستگی اور بے تکلفانہ اظہار خیال کا تعلق ہے، بہت کم شاعر ایسے ہیں جو داغ کے مقابلے میں پیش کیے جا سکیں اور یہ داغ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اردو ادب کا کوئی مؤرخ اس کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔
>
> (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

عذر اُن کی زبان سے نکلا — تیر گویا کمان سے نکلا

خارِ حسرت بیان سے نکلا — دل کا کانٹا زبان سے نکلا

سمجھو پتھر کی تم لکیر اسے — جو ہماری زبان سے نکلا

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم — کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

ہر چند راہ کعبہ و بت خانہ ایک ہے — اے راہ رَو ہے کام یہاں امتیاز کا

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام — تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

وہی ہم تھے کہ جو روتوں کو ہنسا دیتے تھے
وہی ہم ہیں کہ جو تھمتا نہیں آنسو اپنا

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف
ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

نگاہِ شوق پہ الزام بے قراری کا
تمھارے برقِ تجلّی کو اضطراب نہ تھا

اب دل ہے مقام بے کسی کا
یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا

لگ گئی چُپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

نہ رونا ہے طریقے کا، نہ ہنسنا ہے سلیقے کا
پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع عشق کی
سامنے مہمان کے جو تھا میسّر رکھ دیا

کہاں کہاں دلِ مشتاقِ دید نے یہ کہا
وہ چمکی برقِ تجلّی، وہ کوہِ طور آیا

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع، یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

کہاں صیاد، کیسا باغباں، کس پر گری بجلی
چمن میں آتشِ گل نے ہمارا آشیاں پھونکا

جاؤ بھی کیا کرو گے مہر و وفا
بارہا آزما کے دیکھ لیا

اک حرفِ آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے
اتنی سی بات کہہ کے گنہگار ہو گیا

اے داغ! کیا بتائیں محبت میں کیا ہوا
بیٹھے بٹھائے جان کو آزار ہو گیا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلّتیں ہوئیں
لیکن اُسے جتا تو دیا، جان تو گیا

ہوش و حواس، تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، سامان تو گیا

گزر گئے اسی گردش میں اپنے لیل و نہار
شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا

تمھارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا؟

تمام بزم جسے سن کے رہ گئی مشتاق
کہو وہ تذکرۂ ناتمام کس کا تھا؟

دی مؤذن نے شبِ وصل اذاں پچھلی رات
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں گے
تمھیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

بارہا دیکھ لیا ہے اس کو
اور اکثر نہیں دیکھا جاتا

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال
دشمنی کا لطف، شکووں کا مزا جاتا رہا

جہاں تیرے جلوے سے معمور نکلا پڑی آنکھ جس کوہ پر طور نکلا

ملتا نہیں ہم کو دلِ گُم گشتہ ہمارا تُو نے تو کہیں اے غمِ جاناں نہیں دیکھا؟

گلشن میں ترے لبوں نے گویا رس چوس لیا کلی کلی کا

دلِ پُر اضطراب نے مارا اسی خانہ خراب نے مارا

جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا تمھیں منصفی سے کہہ دو، تمھیں اعتبار ہوتا

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو وہ طریقہ تو بتا دو تمھیں چاہیں کیوں کر

شرم سے آنکھ ملاتے نہیں دیکھا اُن کو پار ہوتی ہیں کلیجے کے نگاہیں کیوں کر

جھکی ذرا چشمِ جنگ جُو بھی، نکل گئی دل کی آرزو بھی بڑا مزہ اُس ملاپ کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر دل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا، کہاں کی سیر

ساقیا! تشنگی کی تاب نہیں زہر دے دے، اگر شراب نہیں

آئے وہ بے وفا یہاں، اُس کی بلا کو کیا غرض جائے درِ قبول تک، میری دعا کو کیا غرض

وہ دن گئے کہ داغؔ تھی ہر دم بتوں کی یاد پڑھتے ہیں پانچ وقت کی اب تو نماز ہم

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

جو رہِ عشق میں قدم رکھیں وہ نشیب و فراز کیا جانیں

جو گزرتے ہیں داغؔ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں

مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغؔ ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت، اِدھر کہاں!

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد! ہائے کم بخت! تُو نے پی ہی نہیں

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں صاف چھُپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

خط میں لکھے ہوئے رنجش کے کلام آتے ہیں کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

رہ روِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

فلک دیتا ہے جن کو عیش، اُن کو غم بھی ہوتے ہیں جہاں بجتے ہیں نقارے، وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

سب لوگ جدھر وہ ہیں، اُدھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اَور کُھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے، جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

الٰہی کیوں نہیں اٹھتی قیامت، ماجرا کیا ہے؟
ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

بہت رویا ہوں میں، جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

خبر سن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

دل کہ ویرانہ ہو گیا بالکل
اب بھی ہے تیری آرزو اس میں

ہزار کام مزے کے ہیں داغ، الفت میں
جو لوگ کچھ نہیں کرتے، کمال کرتے ہیں

کسی کا مجھ کو نہ محتاج رکھ زمانے میں
کمی ہے کون سی یارب! ترے خزانے میں

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے، بتا دو مجھ کو
دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھ کو

خط اُن کا بہت خوب، عبارت بہت اچھی
اللہ کرے حُسنِ رقم اور زیادہ

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

تدبیر سے قسمت کی بُرائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

مے پی تو سہی، توبہ بھی ہو جائے گی زاہد!
کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

رہتی ہے کب بہارِ جوانی تمام عمر
مانندِ بُوئے گل اِدھر آئی، اُدھر گئی

بُرے حال سے یا بھلے حال سے
تمھیں کیا، ہماری بسر ہو گئی

دوست یک رنگ جو یک جا کبھی مل بیٹھتے ہیں
لطف کے ساتھ گزر جاتی ہے صحبت کیسی

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے
ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے
سیر تو جب ہے کہ جنّت میں نہ جانے پائے

ساتھ شوخی کے کچھ حجاب بھی ہے
اِس ادا کا کہیں جواب بھی ہے

وہ عیادت کو مرے آتے ہیں، لو اور سنو — آج ہی خوبیِ تقدیر سے حال اچھا ہے

حضرتِ داغؔ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے — اور ہوں گے تری محفل سے اُبھرنے والے

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ — ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

شریر آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ — تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لیے

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ — وہ منتوں سے کہیں، چپ رہو خدا کے لیے

عرضِ احوال کو گِلا سمجھے — کیا کہا میں نے، آپ کیا سمجھے

تم آئینے میں دیکھ کے حیران رہ گئے — واللہ میرے دل میں اِک ایسا ہی اور ہے

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی — بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو — کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ذکرِ مہر و وفا تو ہم کرتے — پر تمھیں شرمسار کون کرے

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے — مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے — جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے — چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

روح کس مست کی پیاسی گئی مے خانے سے — مے اُڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے[1]

سچ ہے، بے عیب ہے خدا کی ذات — تجھ میں کیا جانے کیا بُرائی ہے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دلِ بے مدّعا دیا تُونے

جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی — اس سے مجھ کو سوا دیا تُونے

مجھ گنہگار کو جو بخش دیا — تو جہنم کو کیا دیا تُونے

داغؔ کو کون دینے والا تھا — جو دیا اے خدا دیا تُونے

---

(۱) یہ شعر حسبِ ذیل بہ ادنا تغیّر کے ساتھ لکھنؤ کی ایک طوائف لعل بہا گوہر کے نام منسوب ہے:

روح پیاسی گئی کسی مست کے مے خانے سے
مے اُڑی جاتی ہے ساقی تیرے پیمانے سے

بحوالہ: تذکرہ ''بہارستانِ ناز''، حکیم فصیح الدین رنج، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقّیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۲

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور — کیا چیز حرام ہوگئی ہے

بیٹھے اُداس، اُٹھے پریشاں، خفا چلے — پوچھے تو کوئی آپ سے، کیا آئے، کیا چلے

حجاب، منّی جان

نام منّی جان، حجاب تخلّص۔ کلکتہ کی ایک مشہور طوائف تھی جس کے ساتھ داغ کو عشق تھا۔ شاعری کے علاوہ موسیقی میں بھی مشاق تھی۔ اس کا یہ شعر دیکھیے:

دل بہت بے چین بے آرام ہے
کیا محبت کا یہی انجام ہے

حجاب، نواب بیگم

نواب بیگم، عرفیت چھوٹی بیگم، تخلّص حجاب۔ داروغہ اعظم علی خاں کی دختر تھیں اور نواب معتمدالدّولہ بہادر وزیر غازی الدّین والیٔ اودھ کی پوتی تھیں۔ ۱۸۴۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔

منتخب اشعار

دامنِ محبوب تک پہنچا نہ جب دستِ جنوں — بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریباں کی طرف

کچھ خوفِ خدا کیجیے اس طرح نہ چلیے — سَو بار تو اس چال پہ تلوار چلی ہے

جواب دو کہ نہ دو، اے بتو نہیں پروا — کہوں جو کچھ وہ برائے خدا سنو تو سہی

حجاب کو تو زمانے میں جانتے ہیں سب — مگر جو کہتے ہیں تم کو ذرا سنو تو سہی

آزاد، محمد حسین

نام محمد حسین، آزاد تخلّص۔ ۱۰؍جون ۱۸۳۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ذوق کے گہرے دوست تھے، اس وجہ سے آزاد کی ابتدائی تعلیم استاد ذوق کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ انھی کی صحبت میں شعر گوئی اور فنِ عروض سیکھا۔ آزاد پرانے دلّی کالج سے فارغ التحصیل تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد آزاد لکھنؤ اور پھر ۱۸۶۴ء

میں لاہور پہنچے اور سررشتۂ تعلیم کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ آزاد نے ''پنجاب میگزین'' کے سب اڈیٹر کے فرائض بھی انجام دیے۔ یہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں عربی اور اردو کے پروفیسر بھی رہے۔ وہ کسی سرکاری کام سے کلکتہ اور ایک سفارتی مشن پر کابل و بخارا گئے۔ دو دفعہ ایران بھی گئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے سلور جوبلی کے موقع پر ان کی قابلیت کے صلے میں ان کو ''شمس العلما'' کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں ان کا دماغی توازن خراب ہو گیا اور جنون کی حالت میں ۲۲؍جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ وہ حسبِ ذیل کتابوں کے مصنف ہیں:

''آبِ حیات،'' ''نیرنگِ خیال،'' ''سخندانِ فارس،'' ''قندِ فارسی،'' ''دربارِ اکبری،'' اس کے علاوہ اَور بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

آزاد بہت بڑے انشاپرداز تھے۔ مولانا شبلی نے ان کی موت پر ان کو ''خدائے اردو'' کہہ کر یاد کیا۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ بھی ان کے بڑے مدّاح اور قدردان تھے۔

منتخب اشعار

پوچھتا حالت ہے کیا میرے دلِ ناشاد کی — آہ کی ہمّت نہیں، طاقت نہیں فریاد کی

اِدھر بھی چشمِ عنایات ہو ذرا ساقی — کہ مست دیر سے امیدوار بیٹھے ہیں

جل تھل ہیں کوہ و دشت میں تالاب آب کے — گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے

سبزے کے برگ برگ میں موتی جڑے ہوئے — شاخ و شجر تمام مرصّع کھڑے ہوئے

شبنم کا جوش گر یہی طوفاں اُٹھائے گا — ہیرا چمن کی اوس پہ الماس کھائے گا

رنج، حکیم فصیح الدّین

نام حکیم فصیح الدّین، تخلّص رنج اور طبیب۔ رنج ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ علم درسی اور عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ طب کی کتابیں مشہور طبیب سعادت علی خاں سے پڑھیں۔ تحصیل علم کے بعد رنج نے محکمہ بندوبست میں ملازمت کی۔ بعدازاں اپنا مطب شروع کیا اور جلد ہی اس فن میں مہارت حاصل کر لی۔ انھیں مرزا غالب سے تلمذ حاصل تھا۔ وہ ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ انھوں نے شاعرات کا تذکرہ ''بہارستانِ ناز'' کے نام سے ترتیب دیا۔ یہ تذکرہ پہلی بار ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا۔ مجلس ترقّیِ ادب، لاہور نے اس کا نیا اڈیشن ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ رنج

۳۱ر مارچ ۱۸۸۵ء کو میرٹھ میں انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند حکیم فخر الدین نے ان کی کلّیات ''مخزن الفصاحت'' کے نام سے ترتیب دے کر ۱۸۹۱ء میں شائع کیا۔

منتخب اشعار

عشق میں ہم نے کیا اپنوں کو غیر — تم نے کیوں کر غیر کو اپنا کیا

کیوں چھوا دامن کو وہ چھپنے لگے — تُو نے اے دستِ تمنا کیا کیا

اک بار اور میری عیادت کو آئیے — اچھی طرح سے میں ابھی اچھا نہیں ہوا

ہم عشق میں بدنام ہیں، تم حُسن میں رسوا — عزت نہ تمھاری ہے، نہ توقیر ہماری

مضطرب، مرزا اکبر علی

مرزا علی اکبر نام، مضطرب تخلّص۔ ان کا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے:

وصالِ یار سے دونا ہوا عشق
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی (۱)

قلق، خواجہ اسد علی خاں

نام خواجہ اسد علی خاں، قلق تخلّص۔ خطاب ''آفتاب الدولہ شمس جنگ بہادر'' وطن لکھنؤ۔ خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ عرصے تک واجد علی شاہ کے مصاحب خاص رہے۔ جب وہ لکھنؤ سے کلکتہ گئے تو قلق بھی ان کے ساتھ تھے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ۱۳ر نومبر ۱۸۷۹ء کو رام پور میں انتقال کر گئے۔ ان کی مثنوی ''طلسم الفت'' مشہور ہے۔ دیوان ''مظہرِ عشق'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ ان کا یہ شعر دیکھیے:

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا — بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

ماہر، مرزا جمعیت شاہ

نام مرزا جمعیت شاہ۔ مرزا قادر بخش صابر سے تلمذ حاصل تھا۔

(۱) تذکرۂ ''خوش معرکۂ زیبا'' (جلد اوّل)، سعادت علی خاں ناصر، مرتبۂ مشفق خواجہ، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۲۹۳
مصرعِ اولیٰ یوں مشہور ہے: مریضِ عشق پر رحمت خدا کی

منتخب اشعار

ہم بھی ضرور کعبے کو چلتے پر اب تو شیخ	قسمت سے بت کدے ہی میں دیدار ہو گیا
اے ہم نشیں وہ حضرتِ ماہر نہ ہو کہیں	اک پارسا سنا ہے کہ مَے خوار ہو گیا

نادر لکھنوی

نام شیخ نادر حسین، نادر تخلص۔ اسیر لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کا یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے:

نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار اُن سے
یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

اصغر، نواب علی اصغر خاں

نواب علی اصغر خاں نام، اصغر تخلص۔ ''ناصر جنگ'' خطاب۔ وطن لکھنؤ۔ خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ بہت خوش گو تھے، مگر وارفتہ مزاج۔ غزل پڑھنے کے بعد پھینک دیتے تھے۔ اکثر لوگوں میں ان کے اشعار آتش کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں۔ ۳۰؍جون ۱۸۶۰ء کو کلکتہ میں وفات پا گئے۔ ان کا حسبِ ذیل شعر زباں زدِ خاص و عام ہے:

اگر بخشے زہے قسمت، نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے، جو مزاجِ یار میں آئے

شوخ، شہزادی جان

شہزادی جان شوخ اکبر آبادی۔

منتخب اشعار

تمھارے گیسو و رُخ پر نثار ہم بھی ہیں	اسی خیال میں لیل و نہار ہم بھی ہیں
جو دیکھا جانبِ غیر اس نے دل پکار اُٹھا	نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں
تمھارے ساتھ ہمیں بھی ہے ایک نسبتِ خاص	جو آپ شوخ ہیں تو بے قرار ہم بھی ہیں

عالم، نواب بادشاہ محل

نواب بادشاہ محل بیگم صاحبہ۔ نواب علی نقی خاں کی دختر اور نواب واجد علی شاہ کی منکوحہ بیوی تھیں جن کے ساتھ ان کا نکاح ۱۸۳۷ء میں ہوا تھا۔

منتخب اشعار

کل تو ہنس ہنس کے کر رہے تھے کلام	بات کرنے میں مجھ سے عار ہے آج
اے باغباں! چمن میں یہ کہہ دے پکار کے	لو بلبلو چلو کہ دن آئے بہار کے

حسامی، مرزا حسام الدّین حیدر

مرزا حسام الدّین حیدر نام اور حسامی تخلّص تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آبا و اجداد ایک زمانے میں متمول تھے، مگر انقلاب زمانہ کے ہاتھوں عسرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ حسامی روزگار کی فکر کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ انھوں نے داستان گوئی اور جلا کاری کو وسیلہ معاش بنایا۔ بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف طبیعت مائل تھی۔ خدا بخش تنویر کے شاگرد تھے۔ علم موسیقی میں بھی کچھ دخل تھا، لہٰذا اپنا کلام گایا کرتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں ان کی عمر ۵۲ رسال کی تھی۔ ان کی ایک مشہور غزل کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:

گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ، نہیں دل کو اپنے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، مرا غم سے سینہ فگار ہے (۱)

ولے شہر دہلی یہ تھا چمن، کہ تھا سب طرح یہاں امن
وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا، فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

جو سلوک اوروں سے کرتے تھے، وہی اب ہیں کتنے ذلیل و خوار
وہ ہیں تنگ چرخ کے جَور سے، رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے

کیا حسامیؔ ڈر تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا، وہی تیرا حامیِ کار ہے

(۱) ''آوارہ گرد اشعار،'' قاضی عبدالودود، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۸۔۳۷

خضر، مرزا خضر سلطان

مرزا خضر سلطان نام اور خضر تخلّص تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے فرزند ارجمند تھے۔ ۱۸۳۱ء میں لال قلعہ، دہلی میں پیدا ہوئے۔ لال قلعے ہی میں دیگر شہزادوں کی طرح تعلیم و تربیت ہوئی۔ غالب کے شاگرد تھے۔ ان کا کلام ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ضائع ہو گیا۔ غدر کے ابتلا میں لیفٹننٹ ہڈسن انھیں، ان کے بھائی مرزا مغل اور بھتیجے مرزا ابوبکر کو مقبرہ ہمایوں سے گرفتار کر کے شہر لا رہا تھا۔ راستے میں رتھ روک کر ان کو اور ان کے بھائی اور بھتیجے کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ ان کا ایک شعر تبرکاً پیش ہے:

ظلم ہم پر ذرا سمجھ کے کرو

اے بتو! بندۂ خدا ہیں ہم

قلق، حکیم غلام مولیٰ

حکیم غلام مولیٰ نام، قلق تخلّص، عرفیت مولیٰ بخش۔ تقریباً ۳۳-۱۸۳۲ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ قلق نے ابتدائی تعلیم محلے کے مکتب میں شروع کی۔ چند سالوں میں فارسی اور عربی کی بنیادی کتابیں ختم کر لیں۔ ۱۸۴۵ء میں کسبِ کمال اور تحصیل علم کی غرض سے دہلی پہنچے۔ دہلی کالج میں فارسی کے استاد مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد ہوئے۔ اس ادارے میں مغربی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ طب کی تعلیم معروف طبیب حکیم غلام نقشبند خاں سے حاصل کی۔ شاعری میں مومن کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی تباہی کے بعد اپنے وطن میرٹھ چلے گئے اور بقیہ عمر وہیں بسر کی۔ میرٹھ میں بعض سرکاری مدرسوں میں مدرس فارسی کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ خالی وقت میں بطور خدمتِ خلق مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ آخری عمر کے دس سال بہت پریشانی میں گزرے۔ ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اس پر انھیں سِل کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ ۱۵؍جولائی ۱۸۸۰ء کو میرٹھ میں وفات پا گئے۔ قلق نے انگریزی نظموں کا ترجمہ ''جواہرِ منظوم'' کے نام سے کیا۔ ''کلّیاتِ قلق''، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے شائع ہو گئی ہے۔

آپ کا کلام اپنے استاد مومن کے طرز پر ہے۔ ترکیب کی برجستگی، مضمون آفرینی، خیال بندی، شوخی اور ندرت سب باتیں پائی جاتی ہیں۔ (محمد یحیٰی تنہا)

منتخب اشعار

تری امید میں ہر رہگذر کو دیکھتے ہیں　　تری نوید میں ہر داستاں کو سنتے ہیں

ہر جگہ کعبہ ہے، لیکن سجدے کی مہلت کہاں — ہر قدم منزل ہے، لیکن فرصتِ منزل نہیں

یوں تو وہ عالم آشنا ہے، مگر — اک مجھی سے ذرا لڑائی ہے

تُو ہے ہر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی — تُو نہیں اَور سہی، اَور نہیں اَور سہی (۱)

کثرتِ سجدہ سے پشیماں ہیں — کہ ترا نقش پا مٹا بیٹھے

اس بزم کی طرفہ میہمانی دیکھی — ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی (۲)

جو آکے نہ جائے پھر، بڑھاپا دیکھا — جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

خلیل، میر دوست علی

میر دوست علی نام، خلیل تخلّص۔ ان کا وطن بڑولی (اودھ) تھا، مگر زیادہ تر لکھنؤ میں رہے۔ آتش کے شاگرد تھے۔ ۱۸۶۲ء میں نواب نادر مرزا کی رفاقت میں کلکتہ گئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں نظامت اور چکلہ داری کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کا اردو دیوان مطبع نامی، لکھنؤ سے شائع ہوا۔

منتخب اشعار

چُپ کس لیے رہتے ہو خلیلِ جگر افگار — بتلاؤ تو، کیا حال ہے اے یار! تمھارا؟

اہلِ دنیا ہیں تمام اپنی غرض کے بندے — پڑ گئی جب کوئی مشکل تو خدا یاد آیا

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا مجھ کو — اُٹھیے، گھر جائیے، دم لے چکے، سُستائے بہت

مسافرِ رہِ ناآشنائے منزل ہیں — مثالِ ریگِ رواں جائیں گے کدھر، دیکھیں

لاکھ نازک ہو رشتۂ الفت — ٹوٹتا ہے یہ تار مشکل سے

جنوں میں بھی یہی دُھن ہے، کوئی اُدھر لے جائے — جدھر وہ دشمنِ ہوش و حواس رہتا ہے

درویش، درویش علی

درویش علی نام، درویش تخلّص۔ وطن سہارن پور، مہدی علی زکی مرادآبادی کے شاگرد تھے۔ ریاست رام پور سے

---

(۱) ''کُلّیاتِ قلق،'' حکیم غلام مولیٰ قلق، مرتبۂ کلب علی خاں فائق، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۳۵

(۲) ایضاً، ص ۲۹۴

بصلہ خدمت آبائی کچھ وظیفہ مقرر تھا، اسی پر قناعت کر کے مکان کا دروازہ بند کر کے تنہائی میں بسر اوقات کرتے تھے اور میل جول سے حتی الوسع گریز کرتے تھے۔ تقریباً ۱۸۷۴ء میں چالیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کا یہ شعر مشہور ہے:

پڑا جو سایۂ گیسو، جھجک کے ساقی نے
یہ کہہ کے رکھ دیا ساغر کہ ہے شراب میں سانپ

نواب، نواب کلبِ علی خاں

نام نواب کلبِ علی خاں (خلد آشیاں)، تخلّص نواب۔ ۱۹؍اپریل ۱۸۳۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد نواب یوسف علی خاں، والئ رام پور کے بعد ۱۸۶۵ء میں مسند نشین ہوئے۔ نواب کلبِ علی خاں نے درسیات معقول اور منقول مولانا فضل حق خیر آبادی سے پڑھی تھیں۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا دیوان ''تاجِ فرقی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اردو میں اپنا کلام امیر مینائی کو دکھاتے تھے۔ چار دیوان ان کی یادگار ہیں۔ ان کا عہد ادبی حیثیت سے رام پور کا زرّین عہد کہا جاسکتا ہے۔ ان کے عہد میں بڑے بڑے اہل کمال اور اربابِ فن جمع تھے۔ نواب صاحب بڑے سخی اور فیاض تھے۔ ۲۳؍مارچ ۱۸۸۷ء کو رام پور میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

مرے ہی سامنے اغیار کی ہنس ہنس کے باتیں ہوں
مجھی سے ہو پھر اُلٹا شکوہ میری بدگمانی کا

عجب حسرت سے دیکھا ہے سوئے جاناں دمِ آخر
رہے گی یاد اُس کو بھی نگاہِ واپسیں برسوں

کہتی ہے جس کو فتنۂ محشر تمام خلق
ڈرتا ہوں وہ بھی کوئی تمھاری ادا نہ ہو

ادا سے، ناز سے، غمزے سے، مسکرانے سے
وہ دل کو لیتے ہیں مل جائے جس بہانے سے

اختر، نواب اختر محل

نواب اختر محل، اختر تخلّص۔ آپ کا تعلّق خاندان تیموریہ سے ہے۔ ۱۸۷۶ء تک بقید حیات تھیں۔ نعت و منقبت سے زیادہ شغف تھا۔ کبھی کبھی غزل کہتی تھیں۔ قدسی کی ایک مشہور غزل پر تضمین کیا ہے۔ تذکرہ ''شمیم سخن'' میں ان کا یہ شعر درج ہے:

لکھ کر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تھا کھیل، خاک میں ہم کو ملا دیا

آسی غازی پوری

نام محمد عبد العلیم۔ تاریخی نام دو ہیں ظہور الحق اور خلیل اشرف، تخلّص آسیؔ، پہلا تخلّص عاصیؔ تھا۔ آپ ۲۱ر دسمبر ۱۸۳۴ء کو اپنے آبائی قصبے سکندر پور، ضلع بلیا (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیوان میں اپنے نانا سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے کم عمری میں جون پور کا سفر کیا۔ بعد ازاں مولانا، عبد الحلیم فرنگی محلی سے معقول کی تمام کتابیں پڑھیں۔ طب کسی سے نہیں پڑھی، مگر خداداد ذہانت کے سہارے مطالعے سے حاصل کیا۔ طالبِ علمی ہی کے زمانے میں شعر وسخن سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ حضرت افضل الہ آبادی جو ناسخ کے شاگرد تھے، ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ مجنوں گورکھپوری نے کلام آسی پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں خواجہ میر درد کے بعد تصوف کا دوسرا بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔ حضرت آسی نے ترک وطن کر کے غازی پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۲۴ر فروری ۱۹۱۷ء کو غازی پور میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ہر سال ۲ر جمادی الاوّل کو آپ کا عرس مبارک ہوتا ہے۔ آپ کا دیوان موسوم بہ ''عین المعارف'' چھپ گیا ہے۔

منتخب اشعار

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا
اور اس کے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

حُسنِ صورت کے لیے، خوبیِ سیرت ہے ضرور
گل وہی جس میں کہ خوشبو بھی ہو رنگت کے سوا

نہ گرے اُس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا مصیبت کیا

ملنے والوں سے راہ پیدا کر
اُس سے ملنے کی اَور صورت کیا

کوئی دشمن ہو یا آسیؔ مرا دوست
میں سب کا دوست کیا دشمن ہو کیا دوست

بجز تمھارے کسی کا وجود ہو یہ محال
مگر تمھیں نظر آتے ہو ماسوا ہو کر

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تُو نے او بادِ صبا!
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

نہ مرض کچھ ہے، نہ آسیب نہ سایا ہم کو
اک پری زاد نے دیوانہ بنایا ہم کو

ہوا کے رُخ تو ذرا آ کے بیٹھ جا او قیس!
نسیمِ صبح نے چھیڑا ہے زلف لیلیٰ کو

نہ سنتے تم جو دشمن کی زبانی
بڑی دلچسپ تھی میری کہانی

گھر چھٹا، شہر چھٹا کوچۂ دلدار چھٹا
کوہ وصحرا میں لیے پھرتی ہے وحشت دل کی

دل دیا جس نے کسی کو وہ ہوا صاحبِ دل
ہاتھ آ جاتی ہے کھو دینے سے دولت دل کی

آنکھیں پتھرا گئیں، صورت بھی دکھا دے ظالم
ارے او پردے سے آواز سنانے والے

جب اُس کوچے کی حاصل تھی گدائی
خداوندِ زمین و آسماں تھے

ان آنکھوں کو جب سے بصارت ملی ہے
سوا تیرے کچھ میں نے دیکھا نہیں ہے

پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم، نہ چھیڑ ہمیں
ہم اُور خاک میں مل جائیں گے اُٹھانے سے

اِنھی کانوں سے سنے ہیں اناالحق کے نعرے
آدمی عشق میں، کیا جانیے، کیا ہوتا ہے

میری آنکھیں اور دیدار آپ کا
یا قیامت آ گئی، یا خواب ہے

بے حجابی وہ کہ ہر صورت میں جلوہ آشکار
گھونگھٹ اُس پر یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

جلال لکھنوی

حکیم سیّد ضامن علی نام، جلال تخلّص۔ ۳۱-۱۸۳۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ فارسی وعربی کی علم حاصل کرنے کے بعد اپنے آبائی پیشہ طب کی تعلیم حاصل کی۔ شعروسخن کا کم عمری سے شوق تھا۔ امیر علی ہلاؔل، میر علی اوسط رشکؔ اور مرزا محمد رضا برقؔ سے مشورہ سخن کیا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد وہ رام پور چلے گئے جہاں وہ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے دربار سے وابستہ رہے۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد وہ نواب منگرول (کاٹھیاواڑ) کے دربار سے نسلک ہو گئے۔ وہاں کی ناموافق آب وہوا کی وجہ سے لکھنؤ واپس آ گئے۔ آخر عمر میں سوائے شعروشاعری اور اصلاح سخن کے کوئی مشغلہ نہ تھا۔ حکیم صاحب کو اپنے فن، زبان اور تحقیق پر بڑا ناز تھا۔ چار دیوان کے علاوہ فن عروض، قواعد اور تذکیر وتانیث پر کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ۲۰/اکتوبر ۱۹۰۹ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

اُس دور کے لکھنوی شعرا میں جلاؔل سے بہتر غزل گو شاعر اور کوئی نہ تھا۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

کب آئے گا کوئی مجھ تک، جواب دیتا جا
تسلّیاں بھی تو اے اضطراب! دیتا جا

گلہ ہے مجھ سے کہ تم ضبطِ گریہ کر نہ سکے
ہنسی جب آ گئی ان کو کب اختیار رہا

دوڑ کر ہم نے جو اُن کے پاؤں پر سر رکھ دیا
بولے ٹھکرا کر کہاں پھوٹا مقدر رکھ دیا

میں شوقِ دید میں کیا جانے کتنی دور آیا
کھلی بھی آنکھ وہیں جب قریب طور آیا

تسلّیاں جو وہ یوں ہی دیا کریں گے جلالؔ
تو صبر پھر دلِ بے تاب کو ضرور آیا

دلِ ناکام کو ہم کھو کے بہت پچھتائے
کام اس سے بھی نکل جاتے تھے، بے کار نہ تھا

اگرچہ ایک بھی تسکین کا جواب نہ تھا
مگر کچھ آتے ہی قاصد کے اضطراب نہ تھا

مری داستانِ فراق نے شبِ وصل طرفہ مزا دیا
کہیں میں نے رو کے ہنسا دیا، کہیں اُس نے ہنس کے رُلا دیا

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا
بڑا کلیجا ہے اِن دل دُکھانے والوں کا

اسیر کر کے ہمیں کیوں رہا کیا صیّاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے، وہ باغ بھی نہ ملا

گئی تھی کہہ کے، میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بُو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

خط کسی کا جب سے آیا ہے، میں ہوں اس شغل میں
گاہ پڑھنے کو اُٹھایا، گاہ پڑھ کر رکھ دیا

آہ کھینچا چاہتا تھا، ضبط نے روکا مجھے
سینۂ سوزاں میں اِک شعلہ بھڑک کر رہ گیا

کارواں سے ضعف نے مجھ کو چھڑایا اے جلالؔ
نقشِ پائے رفتگاں پر سر پٹک کر رہ گیا

ہائے قاتل نے ہمیں کو نہ کیا قتل جلالؔ
مجرم آخر وہی ٹھہرا جو گنہگار نہ تھا

باز آئے کہ نہ آئے وہ جفاؤں سے جلالؔ
تم تو کر گزرو جو کچھ اہلِ وفا کرتے ہیں

خبر کیا کس نے شیخ و برہمن میں جھگڑے ڈالے ہیں
مگر سب بزمِ رنداں میں تمھارا نام لیتے ہیں

رگِ گلو ہے جگہ یار جاودانی کی
صدا قریب سے آتی ہے لن ترانی کی

شب کو مے خوب سی پی، صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی

ہم پھر ان کے روٹھ جانے پر فدا ہونے لگے
پھر ہمیں پیار آ گیا، جب وہ خفا ہونے لگے

نہ ہو بر ہم جو بوسہ بے اجازت لے لیا میں نے
چلو جانے دو بے تابی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے

مے کہاں روز ہے، پی لیتے ہیں گاہے گاہے
وہ بھی کچھ یوں ہی مزہ مُنہ کا بدلنے کے لیے

دعوا کرتے تو ہو وفا کا جلالؔ
دیکھو وہ شوخ بے وفا نہ سنے

حالی، خواجہ الطاف حسین

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص۔ شمس العلما خطاب۔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ زمانے کے دستور کے مطابق قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۴ء میں تحصیل علم کی خاطر دہلی آ گئے۔ یہاں عربی، صرف ونحو، منطق میں دستگاہ حاصل کی۔ دہلی میں مرزا غالب سے شناسائی ہوئی اور ان کے تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ ۱۸۵۵ء میں اپنے اعزہ کے اصرار پر پانی پت واپس چلے گئے۔ کچھ عرصہ پانی پت میں رہنے کے بعد نواب شیفتہ کی مصاحبت میں جہانگیر آباد، بلند شہر میں رہنے کا موقع ملا۔ نواب صاحب کی صحبت سے ان کو بہت فائدہ پہنچا۔ تقریباً آٹھ برس ان کے بیٹوں کے معلّم رہنے کے بعد لاہور آ گئے اور گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ چار برس کے بعد دہلی آ گئے اور اینگلو عربک اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد حالی نے مستقل طور پر پانی پت میں سکونت اختیار کر لی۔ حالی اردو شاعری کے جدید رنگ کے بانی ہیں۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں انتقال کر گئے۔ حالی کی حسبِ ذیل تصانیف ہیں۔

نظم: کلّیاتِ حالی، مسدس حالی، متعدّد مثنویاں، مجموعہ نظم فارسی۔

نثر: مقدمہ شعر و شاعری، حیات سعدی، یادگار غالب، حیات جاوید، مضامین حالی۔

انیسویں صدی میں کسی شخص نے ہماری زبان و ادب پر ایسے گراں قدر احسانات نہیں کیے جتنے حالی نے۔ وہ ہماری جدید شاعری کے امام اور مجتہد ہیں۔ (ڈاکٹر عبدالحق)

مسدس حالی کا وہ شاہکار ہے جس نے شاعری کی دنیا میں اور قوم کی زندگی میں عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ حالی اگر کچھ نہ لکھتے، صرف مسدس لکھتے، تو بھی وہ بڑی شخصیت ہوتے۔ (رشید احمد صدیقی)

حالی کا نام ان کی قومی شاعری کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اگر حالی نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے۔ (احتشام حسین)

منتخب اشعار

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اُس نے اچھا ہی کیا، حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

جہاں میں حالیؔ کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ راز ہے اپنی زندگی کا، بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

اے عشق! تُو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اُٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چُرانے لگے

دیکھ اے اُمید! کیجو ہم سے نہ تُو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چُپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

تعزیرِ جُرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

جیتے جی تم موت کے مُنہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا، نہ لگانا ہرگز

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے، کچھ آسماں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تُو، مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں

اک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
فراغت سے دنیا میں ہر دم نہ بیٹھو اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اس کا بہت وسعت ہے میری داستاں میں
بہت جی خوش ہوا حالؔی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں
کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
دریا کو اپنی موج کی طغیانوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
سدا ایک ہی رُخ نہیں ناؤ چلتی چلو تم اُدھر کو ہوا جدھر کی

طنزیہ و مزاحیہ اشعار

مان لیجیے شیخ جو دعوا کرے اک بزرگِ دین کو جھٹلائیں کیا
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
تُو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ ہم کریں پینے میں پھر کیوں احتیاط

سخن، خواجہ فخر الدّین حسین

خواجہ فخر الدّین حسین نام، سخن تخلص۔ ولادت تقریباً ۱۰؍جولائی ۱۸۳۹ء، دہلی۔ مرزا غالب سے تلمذ حاصل تھا۔ مدّتوں آرہ، صوبہ بہار میں وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۹۲ء میں صدر اعلا (سب جج) مقرر ہوئے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ان کا مستقل قیام پٹنہ میں رہا۔ وفات ۱۹۰۰ء کلکتہ، پٹنہ میں دفن ہوئے۔ ان کا حسب ذیل شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے:

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

محسن کاکوروی

نام مولوی محمد محسن، تخلّص محسن۔ ۱۸۲۷ء میں قصبہ کاکوری، مضافات لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سات برس سے سولہ برس تک اپنے دادا کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی۔ ان کے انتقال کے بعد اپنے والد اور مولوی عبدالرحیم سے تحصیل علم حاصل کی۔ مولوی ہادی علی اشک ان کی والدہ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ انھیں شاعری پر عبور حاصل تھا۔ انھی سے محسن کاکوری نے مشق سخن کی۔

محسن کاکوروی نے چند روز عہدہ نظامت پر کام کیا اور وہیں سے وکالت ہائی کورٹ کا امتحان پاس کیا۔ اُس زمانے میں صدر دیوانی عدالت آگرہ میں تھی۔ لہٰذا انھوں نے آگرہ میں رہائش اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء تک آگرہ میں رہے۔ بعدازاں مین پوری میں وکالت کرتے رہے۔ شعروسخن کا شوق انھیں لڑکپن سے تھا۔ ابتدا میں کچھ غزلیں کہیں۔ اس کے بعد محض نعت میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ محسن کاکوروی کی کُلّیات ان کے بڑے صاحبزادے مولوی نورالحسن نے شائع کردی ہے۔ سب سے پہلے اس میں ایک نعتیہ قصیدہ ''گلدستہ کلام رحمت'' ہے۔ اس کے بعد سراپائے رسول اکرم ہے۔ ان کا وہ مشہور نعتیہ قصیدہ بھی کُلّیات میں ہے۔ جس نے تمام اہل علم ودانش سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ اس کا پہلا مصرع اس طرح ہے:

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

کُلّیات میں ان کی مشہور مثنوی ''چراغِ کعبہ'' شبِ معراج کے ذکر میں ہے۔ کچھ رباعیاں اور غزلیں بھی ہیں۔ محسن کاکوروی ۲۴/اپریل ۱۹۰۵ء کو مین پوری میں اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔

> محسن کے یہاں افسردگی کی جگہ شگفتگی، ناامیدی کی جگہ یقین، تزلزل کی جگہ استحکام نظر آتا ہے، اور اس حیثیت سے وہ یقیناً اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں۔ محسن کا کلام اختراعی فن کاری کا ایک نادر نمونہ ہے اور لکھنوی ہونے کے باوجود لکھنؤ کے عام رنگ سے جدا ہے۔ جس میں شاعر کی شخصیت نے کمالِ خلوص ومحبت کے خاکہ کو تصوف اور ہندیت کے رنگ سے آراستہ کرکے شاعرانہ صناعی سے مکمل کیا ہے، جس کی جدّت اور حسن کی مضمون آفرینی دلکش ہے جہاں حدیث وقرآن کی صحت کے لحاظ کے ساتھ مذاقِ شاعرانہ اور مذہبیت کا مکمل امتزاج نظر آتا ہے۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منتخب اشعار

ہے عیاں جلوہ بتوں میں بھی خدا کے نور کا
زاہد آنکھوں میں لگا لے سرمہ سنگِ طور کا

سنا ہے محتسب بھی تاک میں ہے دخترِ رز کی
الٰہی رکھ لے تُو حرمت شرابِ ارغوانی کی

نہ لگے تجھ کو نظر اے قدِ رعنا والے
بے طرح گھورتے ہیں عالمِ بالا والے

نہ دیں کے ہوئے محسن، ہم اور نہ دنیا کے
بتوں سے ہم نہ ملے اور ہمیں خدا نہ ملا

اک آفتِ جاں تری ادا ہے
عاشق کو خدا کا سامنا ہے

فرہاد! نہ پوچھو سختیٔ ہجر
دن آج پہاڑ سا کٹا ہے

دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو
رونے کا کچھ آج ہی مزا ہے

محسن کو واعظو نہ چھیڑو
اچھا ہے جو کچھ بُرا بھلا ہے

زکی، سیّد محمد زکریا خاں

سیّد محمد زکریا خاں نام، زکی تخلّص۔ دہلی کے ایک موقّر خاندان کے فرد تھے۔ ۱۸۳۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ غالب کے شاگرد تھے۔ فارسی، عربی، منطق اور ریاضی میں دستگاہ رکھتے تھے۔ روزگار کی تلاش میں میرٹھ، گورکھ پور، بریلی، الہ آباد اور بدایوں میں مقیم رہے۔ مختلف جگہوں پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ عہدہ ڈپٹی انسپکٹری مدارس سے پنشن لے کر بدایوں میں اقامت اختیار کی۔ پنشن کے بعد وہاں سب رجسٹرار ہو گئے تھے۔ وہیں ۱۹۰۳ء میں انتقال کر گئے۔ موسیقی اور خوش نویسی سے انھیں خاص شغف تھا۔

منتخب اشعار

او چشمِ بے نیاز ذرا دیکھ تو سہی
کیا حال ہو گیا ترے امیدوار کا

سو رنج سو الم ہیں یہاں ہر نفس کے ساتھ
دم کا نہیں شمار تو غم کا حساب کیا

یہ شرمگیں نگہ، یہ تبسّم نقاب میں
کیا بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں

سو حسرتوں سے پوچھنا میرا کہ 'جاؤ گے'
اُن کا وہ ایک ناز سے کہنا کہ 'ہاں، چلے'

طاہر، میر طاہر علی رضوی

نام میر طاہر علی رضوی، طاہر تخلص۔ ۱۸۴۰ء میں کان پور میں پیدا ہوئے۔ فرخ آباد کے رہنے والے تھے۔ منشی امداد حسین صفیر سے تلمذ حاصل تھا۔ ۲۰ رجولائی ۱۹۱۱ء کو انتقال کر گئے۔ ان کا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے:

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اُس کو چھٹی نہ ملے جس کو سبق یاد رہے (۱)

رشکی، نواب محمد علی خاں

نواب محمد علی خاں نام، رشکی تخلص۔ ولادت ۱۸۴۴ء۔ خلف اکبر شیفتہ۔ عربی و فارسی کی تعلیم دستور کے مطابق ہوئی۔ انگریزی بھی پڑھی اور اس میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ تلمیذ خواجہ الطاف حسین حالی جو برسوں ان کے اتالیق رہے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد جہانگیر آباد کی جائداد اور املاک کے وارث اور قابض ہوئے۔ اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بلند شہر میں مجسٹریٹی کے اختیارات انھیں حاصل تھے۔ ۱۸۹۰ء میں صوبہ متحدہ کی جانب سے آپ وائسرائے کی کونسل کے ممبر منجانب سرکار نامزد ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں ''خان بہادر'' کا خطاب ملا۔ اسی سال کونسل آف ریجنسی، رام پور کے ریونیو مقرر ہوئے اور دو برس تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۲۰ رمئی ۱۸۹۹ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

یہ منصبِ بلند ملا، جس کو مل گیا — ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

غصہ آتا ہے، پیار آتا ہے — غیر کے گھر سے یار آتا ہے

مَے پلانی اگر نہیں منظور — ابر کیوں بار بار آتا ہے

دردِ دل کیا بیاں کرو رشکی — اس کو کب اعتبار آتا ہے

رات کو بات نہ کی اس نے سحر تک ہم سے — اور جو کچھ کہ ہوا قابلِ اظہار نہیں

اسماعیل میرٹھی

مولوی محمد اسماعیل نام، اسماعیل تخلص۔ ۱۲ رنومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ زمانۂ قدیم کے دستور کے

(۱) ''خم خانۂ جاوید'' (جلد پنجم)، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۴۲۶

مطابق ان کی تعلیم گھر ہی پر والد کی نگرانی شروع ہوئی۔ گلستاں، بوستاں اور شاہ نامہ وغیرہ فارسی کتب درسیہ ختم کرنے کے بعد نارمل اسکول میں داخل ہوئے اور امتحان پاس کیا۔ ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۰ء کے عرصے میں سہارن پور کے ضلع اسکول میں مدرس فارسی رہے۔ تھوڑے عرصے بعد ترقی کر کے فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوئے۔ پہلے سہارن پور پھر میرٹھ میں ایک عرصے تک اس عہدہ پر فائز رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول، آگرہ تبدیل ہو گئے۔ آگرہ میں بارہ برس مدرس فارسی کے عہدے پر مامور رہے۔ ۱۸۹۹ء میں پنشن ہو گئی۔ پنشن کے بعد اپنے وطن میرٹھ آ گئے اور بقیہ عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ان کی اعلا قابلیت اور ادبی خدمات کے صلے میں 'خان صاحب' کا خطاب ملا۔ بچّوں کے متعدّد درسی کتابوں کے مصنف تھے۔ ایک کُلّیات ان کی یادگار ہے۔ غزلیات کے علاوہ انھوں نے اخلاقی نظمیں، قصے، کہانی کے طور پر لکھی ہیں جن سے عمدہ اخلاقی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو میرٹھ میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو کوئی تم سے کرتا، تمھیں ناگوار ہوتا

چھری کا، تیر کا، تلوار کا تو گھاو بھرا — لگا جو زخم زباں کا، رہا ہمیشہ ہرا

پہنچا دیا حدودِ دو عالم سے بھی پرے — مطرب نے راگ چھیڑ دیا کس مقام کا

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ — اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے — راحت طلبی موجبِ راحت نہیں ہوتی

تُو ہی نہیں ہے رمزِ محبت سے آشنا — ورنہ دیارِ حُسن میں رسمِ ستم نہیں

ابنائے روزگار میں ایسا بھی ہے کوئی — جس نے حقوقِ صحبتِ یاراں ادا کیے

دریا تو ہے وہی جو ہوا داخلِ محیط — وادی میں ورنہ سیکڑوں دریا بہا کیے

ہے آج رُخ ہوا کا موافق تو چل نکل — کل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہوا چلے

بد کی صحبت میں مت بیٹھو، اس کا ہے انجام بُرا — بد نہ بنے تو بد کہلائے، بد اچھا بدنام برا

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں — کوئی رہرو آج تک اِس راہ میں بھٹکا نہیں

مجروح، میر مہدی حسین

میر مہدی حسین نام، مجروح تخلّص۔ تقریباً ۱۸۴۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ مرزا غالب کے بہت عزیز شاگرد تھے۔ مرزا غالب کے ان کے نام بہت خطوط ہیں جن سے ان دونوں کے درمیان محبت

اور شفقت کا رشتہ ظاہر ہوتا ہے۔ غدر کے بعد پانی پت چلے گئے اور وہاں پانچ سال رہے۔ جب دہلی واپس آئے تو روزگار کا کوئی سہارا نہ تھا۔ تلاش معاش میں ریاست الور گئے جہاں مہاراجا شیودھان سنگھ، والئ ریاست نے ان کی قدردانی کی۔ کچھ عرصے بعد وہ جے پور چلے گئے۔ والئ جے پور کی قدردانی کے باعث وہاں بافراغت زندگی بسر ہوتی رہی۔ بعد میں نواب حامد علی خاں، والئ رام پور کی وساطت سے کسی قدر زندگی بہتر طور پر بسر ہوئی۔ آخری عمر میں ضعف بصارت بہت ہوگئی تھی۔ کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی زیارت بھی کی۔ ۱۵رمئی ۱۹۰۳ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ ان کا دیوان ''مظہر معانی'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ ان کی اور بھی کئی تصانیف ہیں۔

منتخب اشعار

محفل طرازیاں کہاں اب تو کام ہے — گھر میں پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

بھولے بھولے سے جو رہتے ہو کہو خیر تو ہے — یہ تو کچھ عشق کا انداز ہے پایا جانا

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا — سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

کچھ عرضِ تمنّا میں شکوہ نہ ستم کا تھا — میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

ایک دل اور خواستگار ہزار — کیا کروں یک انار صد بیمار

جنسِ نایاب کے ہوتے ہیں ہزاروں گاہک — تم پتا اپنا بتانا نہ کسی کو ہرگز

کیا ہماری نماز کیا روزہ — بخش دینے کے سَو بہانے ہیں

کج ادائی یہ سب ہمیں تک تھی — اب زمانے کو انقلاب کہاں

رہ کے مسجد میں کیا ہی گھبرایا — رات کاٹی خدا خدا کر کے

اچھا ہے جو مجروحؔ کو روکے کوئی اُٹھ کر — یہ جینے سے بیزار ہے، کیا جانے کدھر جائے

میں اس بے مائیگی سے خوش ہوں مجروحؔ — کہ فارغ ہو گیا سود و زیاں سے

عاشق نہ سمجھتے تو وہ مُنہ کو نہ چُھپاتے — کھویا دلِ بے تاب نے وہ لطفِ نظر بھی

شاد عظیم آبادی

نام علی محمد، شادؔ تخلص۔ ۷رجنوری ۱۸۴۶ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ شاد نے امارت اور ریاست کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم لائق اساتذہ سے حاصل کی۔ اہل علم کی صحبت میں رہ کر عربی اور فارسی

زبان کے رموز و نکات سیکھے۔ شاعری میں الفت حسین فریاد عظیم آبادی سے تلمذ حاصل تھا۔ شاد نے کچھ غزلوں پر صفیر بلگرامی سے بھی اصلاح لی تھی۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی صحبتوں سے بھی بہت فیض یاب ہوئے۔ شاد انگریزی اور ہندی زبان سے بھی واقف تھے۔ شاد کا ننھیال پانی پت تھا۔ ایک مرتبہ وہ وہاں گئے اور حالی سے ملاقات کی۔ علی گڑھ بھی گئے اور سر سیّد سے ملاقات ہوئی۔ کلکتہ اور مرشد آباد کا بھی سفر کیا۔ ان کے ہندو دیوان اور خزانچی نے ان کی ریاست و جاگیر کا بڑا حصّہ فروخت کر دیا اور روپیہ خرد برد کر دیا۔ جو شخص ہزاروں اور لاکھوں میں کھیلتا تھا اسے اپنی آخری زندگی صرف سو روپیہ ماہانہ کی امداد پر گزر بسر کرنی پڑی۔ شاد کئی سال تک پٹنہ میں آنریری مجسٹریٹ رہے۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں سرکار سے ''خان بہادر'' کا خطاب ملا۔ شاد کو اپنے زمانے کا میر کہا گیا ہے۔ ''مے خانۂ الہام'' کے نام سے ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔ مراثی رباعیات، مثنویات اور نثر کی کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ۸/جنوری ۱۹۲۷ء کو پٹنہ میں انتقال کر گئے۔

شاد نے تمام صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصیدہ، مرثیہ مثنوی، قطعہ، رباعی، غزل تمام اصناف پر آپ کا کلام موجود ہے۔ غزل آپ کی محبوب صنف سخن رہی ہے۔ شاد عظیم آبادی بہار اسکول کے سب سے زیادہ کامیاب شاعر ہیں۔ تمام ناقدین نے ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔

منتخب اشعار

یہ دُنیا ہے اے شاؔد! ناحق نہ اُلجھو
ہر اک کچھ تو اپنی سی آخر کہے گا

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

ہے ہے مری چشمِ حسرت کا سب دردِ دل اُن سے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنے کچھ سوچ کے ان کا رہ جانا

اُف اُف وہ ہتھیلی سے ان کا شرما کے چُھپانا آنکھوں کا
برچھی کا ادا کی چل جانا اور تیر نظر کا رہ جانا

مانا کہ فقط موہوم سہی، ملنے کی ہمیں اک آس تو ہے
دیدار تو ہولے دیدۂ تر، بہنا ہو اگر تو بہہ جانا

پکار کر وحشیوں سے کہہ دو خزاں کا بھی دَور ہے غنیمت
قبا کے دامن کو ٹانک تو لیں اگر نہ موقع ملے رفو کا

چلے ہم باغ سے اے شاؔد! کس وقت
بہار آنے کو تھی وقتِ نمو تھا

صانع کو دیکھنا ہو تو عالم پہ کر نظر
آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سُوے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا، دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

جب کسی نے حال پوچھا، رو دیا　　چشمِ تر! تُو نے تو مجھ کو کھو دیا

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا　　مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

دیر تک میں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا　　چہرۂ ساقی نمایاں، صاف پیمانے میں تھا

ہزار شکر میں تیرے سوا کسی کا نہیں　　ہزار حیف کہ اب تک ہوا نہ تُو میرا

میں بے بس ہوں، مرا آرام ہے غیروں کے ہاتھوں میں　　پھر اے پیری! زمانہ آ گیا اپنی لڑکپن کا

نہ پوچھو حال، جو دم ہے، وہ پیری میں غنیمت ہے　　بھروسا اے عزیزو کیا چراغِ صبح گاہی کا

دَیر و حرم میں گر نہیں، خیر نہ ہوں نہیں سہی　　میرے ہی پاس جب نہیں، آپ کہیں ہوئے تو کیا

نہ اپنا آپ میں مالک، نہ شادی اور نہ غم میرا　　مجھے اے زندگی! آزاد کر، گھُٹتا ہے دم میرا

لے کے خود پیرِ مغاں ہاتھ میں مینا آیا　　مَے کشو! شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

آ گیا تھا جو خرابات میں پی لینی تھی　　تجھ کو صحبت کا بھی زاہد نہ قرینا آیا

دل کیا بجھا کہ ہو گیا اندھیر ہر طرف　　گھر بھر میں اے نسیم! یہی اک چراغ تھا

جب اہلِ ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا　　سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا

بتوں سے قطع کر لینا فقط حوروں کے لالچ سے　　یہی گر حق پرستی ہے، تو زاہد تجھ سے ہم بہتر

آنکھیں لگی ہیں در سے تڑپتی ہے تن میں روح　　دلکش ہے وصلِ دوست سے بھی انتظارِ دوست

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم　　تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے　　آ جاؤ جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر　　دریائے محبت کہتا ہے، آ، کچھ بھی نہیں، پایاب ہیں ہم

اسیرِ جسم ہوں، معیادِ قید لامعلوم　　یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی　　نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اُٹھ گئے اس مقام سے اشک بھر آئے جس جگہ　　آج تلک بچائے ہیں عشق کی آبرو کو ہم

اُٹھتی جوانی، عضو مناسب، سانولی رنگت، ہائے ستم　　آنکھیں رسیلی، باتیں بھولی، چال قیامت، ہائے ستم

ہم اور سیرِ لالہ و گل ہجرِ یار میں　　کیسی بہار، آگ لگا دو بہار میں

کہاں گلوں کے وہ تختے، وہ لالہ زار کہاں　　بہار میں تو نظر لگ گئی، بہار کہاں

کہنے لگتے ہیں جوانی کی کہانی جو کبھی　　پہلے ہم دیر تک بیٹھ کے رو لیتے ہیں

تھی جزوِ ناتواں کسی ذرّے میں مل گئی
ہستی کا کیا وجود تری جلوہ گاہ میں

خدا شاہد برا کہتا نہیں جنت کو میں، لیکن
مزہ کچھ اور ہی ہے مَے کشی کا بادہ خانے میں

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

لحد میں مُنہ چُھپائے کیوں نہ جاؤں
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

اے شاد! جن کے ساتھ زمانہ بسر کیا
اللہ اب وہی مجھے پہچانتے نہیں

روئیں دل کھول کر، اظہارِ مصیبت کرلیں
اِدھر آ اگلے زمانے تجھے رخصت کرلیں

کوئی ماتم کرے میرے لیے کیوں
سزا جینے کی ہے، اتنا جیے کیوں

یہ سب درست کہ تم بت بھی ہو خدا بھی ہو
مگر نیاز کے قابل یہ دل رہا بھی ہو

اپنی ہستی کو غم و درد و مصیبت سمجھو
موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

غنچوں کے مسکرانے پہ کہتے ہیں ہنس کے پھول
اپنا کرو خیال، ہماری تو کٹ گئی

ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے ابھی سے وحشت برس رہی ہے
ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار اے آشیاں رہے گی

یوں ہی راتوں کو تڑپیں گے، یوں ہی جان اپنی کھوئیں گے
تری مرضی نہیں اے دردِ دل! اچھا، نہ سوئیں گے

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے
تڑپ اے دل! تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

بدلی وہ وضع، طور سے بے طور ہو گئے
تم تو شباب آتے ہی کچھ اَور ہو گئے

دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دَور ہو گئے

یہ بزمِ مَے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
اس پر کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

گھبرا کے یہی کہتے ہیں اب عمرِ رواں سے
پہنچا دے وہیں گھیر کے لائی تھی جہاں سے

ہمیں کیا ہوا جو بدل گئے، بڑی حیرتوں کا مقام ہے
کہ وہی فلک ہے، وہی زمیں، وہی صبح ہے، وہی شام ہے

وہ دریچے پر ہوں کشادہ رُو، نظر اپنی اُن سے لڑی رہے
نہ تو گفتگو سے مراد ہے، نہ کلام سے ہمیں کام ہے

عجب معیار ہے اے مَے پرستو! بزم، ساقی کا
جنھیں ہم رند سمجھے تھے، وہ اکثر پارسا نکلے

پس از معشوق مرنا، عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

جو دیکھے غور سے سارا بھرم کھل جائے دنیا کا
مصیبت آدمی کو صاحبِ ادراک کرتی ہے

جنگل کو باغ، باغ کو جو خلد کر گئے | کیوں اے صبا! وہ پھول چمن سے کدھر گئے

اکبر الٰہ آبادی

سیّد اکبر حسین رضوی نام، اکبر تخلص تھا۔ ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو قصبہ بارہ، ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدارس اور سرکاری اسکولوں میں پائی۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیل دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۰ء تک وکالت کی، پھر منصب کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ترقی کر کے سب آرڈینیٹ جج اور بعد میں جج مقرر ہوئے۔ ''خان بہادر'' کا خطاب گورنمنٹ سے ملا۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ وحید الٰہ آبادی کے شاگرد تھے۔ مزاحیہ اور سنجیدہ دونوں طرح کی شاعری کی۔ طنز و مزاح کے اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو الٰہ آباد میں انتقال کر گئے۔ اکبر الٰہ آبادی کو ''لسان العصر'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ''کلیاتِ اکبر'' چار حصّوں میں چھپ گئی ہے۔

> اکبر کی شاعری ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ حالی، اکبر اور اقبال ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ان تینوں کی شاعری کو اردو میں قومی اور ملّی شاعری کے ارتقا میں ایک نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

> اکبر کی خاص شہرت ان کی ظرافت بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر مبنی ہے جو ان کی زرّیں نظموں میں آب دار موتیوں کی طرح چمک رہی ہے۔ (رام بابو سکسینہ)

منتخب اشعار

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام | وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہوش اُڑا دیتا ہے ان خاک کے پتلوں کا جمال | خود وہ کیا ہوگا انھیں ہوش میں لانے والا

گو بہت کچھ رنج یارانِ وطن سے تھا ہمیں | آنکھ میں آنسو، مگر وقتِ سفر آ ہی گیا

محبت کا تم سے اثر کیا کہوں | نظر مل گئی، دل دھڑکنے لگا

اب تو ہے عشقِ بتاں میں زندگانی کا مزہ | جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائے گا

جب تمھارا خیال آتا ہے | ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں

سکونِ قلب کی دولت کہاں دنیائے فانی میں | بس اک غفلت سی ہو جاتی ہے اور وہ بھی جوانی میں

ہر چند بگولہ مضطر ہے، اک جوش تو اس کے اندر ہے — اک وجد تو ہے، اک رقص تو ہے، بے چین سہی، برباد سہی

نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ — شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

مسرّت ہوئی ہنس لیے دو گھڑی — مصیبت پڑی رو کے چپ ہو رہے

اب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز — مل گئے، صاحب سلامت ہو گئی

کیا شان ترے جمال میں ہے — ہر وقت زمانہ حال میں ہے

ایک صوتِ سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے — ورنہ ہر ذرّہ ازل سے تا ابد خاموش ہے

طنزیہ ومزاحیہ اشعار

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا — طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

مغرب نے خوردبیں سے کمر اُن کی دیکھ لی — مشرق کی شاعری کا مزہ کرکرا ہوا

سیّد اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

بتاؤں آپ کو، مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحا ہوگا

میں ہوا رخصت اُن سے اے اکبرؔ! — وصل کے بعد تھینک یو کہہ کر

"آ عندلیب! مل کے کریں آہ وزاریاں" — تُو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے قوم

ڈائری میں ہو گیا تھا اختلافِ اندراج — لڑ گئے خفیہ پولیس سے کل کراماً کاتبین

شیخ جی! آپ کو اللہ سلامت رکھے — آپ کا دم بھی غنیمت ہے مسلمانوں میں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبرؔ ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں — مگر اندھیرے اُجالے میں چوکتا بھی نہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے — کونسل میں بہت سیّد، مسجد میں فقط جمّن

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکّام کے ساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے، مگر آرام کے ساتھ

ہو خیر یارب اکبرِؔ آشفتہ حال کی — سر جن رقیب اور دوا اسپتال کی

تھے معزز شخص، لیکن ان کی لائف کیا لکھوں — گفتنی درجِ گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی — یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے، لقمے پہ شاد ہے — صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق یہ پایا
کہ وہ جامے سے باہر ہے یہ پاجامے سے باہر ہے

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے، بجز اکبر کے اور امرود کے

رحمان کے فرشتے گو ہیں بہت مقدس
شیطان ہی کی جانب، لیکن مجارٹی ہے

دعوا بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجیے

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

گل پھینکے ہیں یورپ کی طرف، بل کہ ثمر بھی
اے نیچر و سائنس! بھلا کچھ تو اِدھر بھی

ڈنر سے تم کو کم فرصت، یہاں فاقے سے کم خالی
"چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی نہ ہم خالی"

رشید، پیارے صاحب

نام سیّد محمد مصطفٰی مرزا، عرفیت پیارے صاحب، رشید تخلص۔ ۱۶ر فروری ۱۸۴۷ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پیارے صاحب رشید میر انیس کے نواسے تھے۔ میر عشق اور تعشق پیارے صاحب رشید کے چچا تھے۔ اِنھی دونوں سے رشید نے جملہ نکاتِ فنِ شاعری و مرثیہ گوئی حاصل کیے۔ ۲۰ر ستمبر ۱۹۱۸ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

ہاں ہاں، تمھارے حُسن کی کوئی خطا نہیں
میں حُسنِ اتفاق سے دیوانہ ہوگیا

غرور اب کیا بڑھے گا خم ہوئے اس درجہ پیری سے
ہم اپنے سر کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر لگاتے ہیں

زندگی کہتے ہیں کس کو، موت کس کا نام ہے
مہربانی آپ کی، نامہربانی آپ کی

آج در بند کیے جاتے ہیں زندانوں کے
اور بگڑیں گے مزاج آپ کے دیوانوں کے

بتوں کی برائی رشید اس قدر
بڑے آپ اللہ والے ہوئے

انور دہلوی

سیّد شجاع الدّین نام، عرفیت امراؤ مرزا، انور تخلّص۔ تقریباً ۴۸-۱۸۴۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خوش نویسی اپنے والد سے حاصل کی۔ ظہیر دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ پہلے ذوق اور پھر ان کے مرنے کے بعد غالب سے تلمذ حاصل رہا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اس قدر تنگ ہوئے کہ ترکِ وطن کر کے جے پور جا رہے اور وہیں

عین جوانی میں ۱۸۸۵ء میں انتقال ہوا۔ ان کے دو دیوان ضائع ہو گئے۔ لالا سری رام نے بڑی محنت سے متفرق مسودوں سے ایک دیوان چھپوا دیا۔

منتخب اشعار

میں نے کہا کہ غیر سے پردا نہیں ہوا — کہنے لگے کہ آپ کو پھر کیا؟ نہیں ہوا

بدمستیوں کا رنگ ہے جوشِ شباب میں — گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

وہ جو گردن جھکائے بیٹھے ہیں — حشر کیا کیا اُٹھائے بیٹھے ہیں

شرم بھی اک طرح کی چوری ہے — وہ بدن کو چُرائے بیٹھے ہیں

نہ میں سمجھا، نہ آپ آئے کہیں سے — پسینا پونچھیے، اپنی جبیں سے

اِدھر لاؤ ذرا دستِ حنائی — پکڑ دیں چور دل کا ہم یہیں سے

عبرت گورکھپوری

نام منشی گورکھ پرشاد، عبرت تخلّص۔ فراق گورکھ پوری کے والد تھے۔ گورکھ پور میں وکالت کرتے تھے۔ وفات ۱۸؍جون ۱۹۱۸ء۔ ان کا یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے:

زمانے کی گردش سے چارا نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمھارا نہیں ہے

اثر، سیّد امداد امام

نام سیّد امداد امام، اثر تخلّص۔ ۱۷؍اگست ۱۸۴۹ء کو موضع سالار پور، ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ آپ ایک حاذق طبیب تھے۔ آپ نے فن زراعت، حیوانات، باغبانی، ہومیو پیتھک پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی کتاب ''مرآۃ الحکما'' انگریزی اور سویڈن زبان میں ترجمہ ہوئی اور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل رہی۔ ان کی کتاب ''کاشف الحقائق'' تنقید، فن تبصرہ اور فن شاعری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی علمی خدمات کے صلے میں حکومت ہند نے آپ کو ''شمس العلما'' کا خطاب دیا تھا۔ صوبہ بہار کے سیّد علی امام اور جناب حسن امام آپ کو ہی کے فرزند تھے۔ ۱۷؍اکتوبر ۱۹۳۴ء کو آبگلہ، ضلع گیا (بہار) میں راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ ان کا اردو دیوان شائع ہو گیا ہے۔

منتخب اشعار

پھر گئے آپ مرے کوچے سے
دو قدم پر غریب خانہ تھا

نہ کر شکوہ ہماری بے سبب کی بدگمانی کا
محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

صحرا صحرا، جنگل جنگل، مارے مارے، پھرتے ہیں
آہو وحشی جان کے ہم کو، ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

آنکھ والا ترے جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر، کیا دیکھے

خدا کی خدائی ہمیشہ رہے گی
جو ہوتا رہا ہے، وہ ہوتا رہے گا

رات کیا کیا نہ بڑھا دردِ جگر، مت پوچھو
کس خرابی سے کٹے چار پہر، مت پوچھو

ہمدمو! کہہ تو چکے حالِ دلِ خوں گشتہ
اب ہمیں تاب نہیں، بارِ دگر مت پوچھو

کچھ خدا جانتا ہے، جیسے بسر ہوتی ہے
زندگی ہے کہ مصیبت ہے، آثر مت پوچھو

ارشد گورگانی

شہزادہ میرزا عبدالغنی نام، ارشد تخلّص۔ ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ قلعہ معلیٰ، دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ بہادر شاہ بادشاہِ دہلی کی بڑی صاحبزادی کاشفہ سلطان بیگم کے نواسے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ سررشتہ پنجاب میں ملازم ہو گئے تھے، جہاں آپ فارسی زبان وادب کے صدر معلم کے عہدے تک پہنچے۔ دہلی، فیروزپور اور ملتان میں تعینات رہے۔ شاعری اوائل عمر ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ میرزا قادر بخش صابر سے تلمذ حاصل تھا جو اِن کے حقیقی ماموں تھے۔ ارشد گورگانی اساتذہ فن کے علاوہ اچھے سخن شناس تھے۔ چناں چہ علاّمہ اقبال نے کم عمری میں لاہور کی ایک شعری نشست میں جب یہ شعر پڑھا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو شعر سن کر ارشد گورگانی نے بے حد داد دی اور پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر بڑا شاعر بنے گا جو درست ثابت ہوا۔ ارشد گورگانی ۲۱ رفروری ۱۹۰۶ء کو ملتان میں انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''شہنشاہ نامہ''، یعنی منظوم سوانح حیات ملکہ معظّمہ وکٹوریہ آنجہانی، ''عشرۂ کاملہ''، ''نالۂ یتیم'' پر تضمین اور ''مرقعِ حکمت''۔

منتخب اشعار

ان کی میری حشر کے میدان میں — ہوگئی صاحب سلامت دور سے

تعجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی — چڑھا ہے خون کس کس بے گنہ کا اس کی گردن پر

آج ارشد کو عجب حال میں دیکھا میں نے — رو رہا تھا وہ کسی شخص کی دیوار کے پاس

مائل دہلوی

نام مرزا محمد تقی بیگ، مائل تخلص۔ ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ وطن دہلی تھا۔ شاعری کم عمری میں شروع کی۔ ابتدا میں انور دہلوی سے تلمذ حاصل رہا۔ اردو کے علاوہ فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ جوانی میں مالی حالت سے مجبور ہوکر گوالیار اور پھر جے پور چلے گئے اور وہاں کے کاروانِ ریاست میں شامل ہوگئے۔ بقیہ عمر جے پور میں بسر کی اور وہیں تسلیم عثمانی کی شاگردی اختیار کی۔ ۲؍اکتوبر ۱۹۳۱ء کو جے پور میں انتقال کرگئے۔ کُلّیاتِ مائل چھپ گئی ہے۔

منتخب اشعار

قطرے قطرے کا ہے نصیب جدا — کوئی گوہر، کوئی شراب ہوا

آپ کو دیکھتا ہوں اے مائل! — اور امامت کو دیکھتا ہوں میں

نہ مانگ زاہدِ ناداں ذرا سمجھ تو سہی — شکایتیں ہیں یہ کس کی دعا کے پردے میں

اُس کے قامت کو دیکھتا ہوں میں — یا قیامت کو دیکھتا ہوں میں

وہ دن گئے کہ زندہ دلوں میں شمار تھا — اب زندگی کشاکشِ شام وسحر میں ہے

یہ کہہ کے چھیڑتے ہیں جوانانِ مے کدہ — مائل تمھیں سلام کہا ہے بہار نے

نہیں ہوتی تو دعا میں نہیں ہوتی تاثیر — اور جو ہوتا ہے تو نالوں پر اثر ہوتا ہے

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا — کام آپڑا ہے رحمتِ پروردگار سے

مائل ہمیں تو رات کہیں رہ کے کاٹنی — مسجد میں جا پڑیں گے جو مے خانہ بند ہے

نظم طباطبائی

سیّد حیدر علی نام، نظم تخلص۔ ۱۸؍نومبر ۱۸۵۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مینڈو لال زار سے تلمذ حاصل تھا۔

۸۳-۱۸۸۲ء میں آپ کا تقرر مٹیا برج، کلکتہ کے مدرسہ شاہ اودھ میں شہزادوں کی تعلیم پر ہوا۔ واجد علی شاہ کے انتقال کے بعد مدرسہ ختم ہوگیا اور نظم لکھنؤ واپس چلے آئے۔ ۴؍فروری ۱۸۹۱ء کو نظام کالج، حیدر آباد، دکن میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کچھ دنوں تک آپ کا تعلق دارالترجمہ سے بھی رہا اور اسی دوران ''نواب حیدر جنگ'' کا خطاب عطا ہوا۔ ۲۳؍مئی ۱۹۳۳ء کو حیدر آباد، دکن میں انتقال کر گئے۔ وہ اردو اور فارسی کے جید عالم تھے۔ ''شرح دیوانِ غالب'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ ''دیوان طباطبائی (صوتِ غزل) ان کا شعری مجموعہ ہے۔

طباطبائی کا اصلی جوہر ان کی نظموں میں کھلتا ہے جس کی وجہ سے وہ لکھنؤ کے دبستان شاعری سے نکل کر جدید اردو شعرا کی صفِ اوّل میں آجاتے ہیں۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منتخب اشعار

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برقِ خرمن کا
لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن کا

آئی تھی اب مزے پہ کہانی شباب کی
کس لطف کے مقام سے افسانہ چھٹ گیا

نہ آنا اے اجل تجھ کو قسم ہے وقت آخر تک
ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائگاں کر لیں

بعد میرے نہ رہا عشق کی منزل کا نشاں
مٹ گئے راہ رو و راہ گذر دونوں ساتھ

نگاہِ یاس مری کام کر گئی اپنا
رُلا کے اُٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

مجھ کو آوازِ شکستِ رنگ نے رسوا کیا
ورنہ دل کی بات تو لب تک کبھی آتی نہ تھی

مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اس قدر
کوئی جھونکا بادِ سحر کا تھا، مرے پاس سے جو گزر گیا

بیان/ یزدانی، سیّد غلام مرتضےٰ

نام سیّد غلام مرتضےٰ۔ ولادت ۱۸۵۰ء جھانسی۔ آبائی وطن قصبہ جارچہ، ضلع بلند شہر۔ ابتدائے عمر میں میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی۔ اردو میں تخلّص بیان اور فارسی میں یزدانی کرتے تھے۔ شاگرد رشید سیّد احمد حسن فرقانی، میرٹھ۔ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ عرصہ دراز ''طوطیِ ہند'' کے اڈیٹر رہے۔ مختلف اخباروں میں بھی کافی عرصہ مضامین لکھتے رہے۔ ایک عرصے سے دماغی عوارض میں مبتلا تھے۔ وہ عارضہ بظاہر وہم سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ روشنی میں بلاوجہ بہت زیادہ اذیت پہنچتی تھی۔ چناں چہ کئی سال تک اس وہم میں گھر سے باہر نہ نکلے۔ بغیر میانہ کے پاپیادہ گھر سے کبھی باہر نہ نکلتے تھے۔ ۱۲؍مارچ ۱۹۰۰ء کو میرٹھ میں انتقال کر گئے۔ یہ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ حضرت بیان کی بیشتر

تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد علی جواد زیدی نے چودہ بتائی ہے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ (۱) پاسخ ہند، (۲) جرمانۂ آفتاب، (۳) مجموعۂ عطرِ نعت، (۴) رخصتِ عروس، (۵) پنجۂ فولاد، (۶) حواسِ خمسہ، (۷) یادگارِ یزدانی، (۸) حل المطالب، (۹) گلِ عباس، (۱۰) شرحِ قانونِ بوعلی سینا، (۱۱) تیغ ہند، (۱۲) جرعۂ جام، (۱۳) رنگِ شہادت، (۱۴) جواہرِ لاثانی۔ حضرت بیان کے متعدد شاگرد تھے۔ یہ جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے۔

منتخب اشعار

ان کا منجملۂ اربابِ وفا ہو جانا — میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا

نہ کھولی آنکھ وقتِ نزع بیمارِ محبت نے — کسی کا پردہ رکھنا تھا، کوئی آنکھوں میں پنہاں تھا

ادائیں تا ابد بکھری رہیں گی — ازل میں پھٹ پڑا جوبن کسی کا

اے بیاں! سہل ہے ہم رنگ ملائک ہونا — آدمی بنتا ہے انسان بڑی مشکل سے

شوق قدوائی

شیخ احمد علی قدوائی نام، شوق تخلص۔ قصبہ جگور، ضلع لکھنؤ میں ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کے علاوہ انٹرنس تک انگریزی بھی پڑھی۔ مظفر علی اسیر کی شاگردی اختیار کی جو رشتے میں ان کے دادا ہوتے تھے۔ کچھ مدّت فیض آباد میں تحصیل دار کے فرائض انجام دیے۔ بعد میں ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ میں اخبار ''آزاد'' نکالا۔ کچھ عرصے بعد بھوپال میں مختلف عہدوں پر فائز رہے جہاں نظامت کے عہدے سے پنشن پائی۔ آخر عمر میں رام پور آ کر کتب خانہ سرکاری سے وابستہ ہو گئے۔ شوق حسبِ ذیل مثنویوں کے مصنف ہیں۔ (۱) عالمِ خیال، (۲) گنجینۂ، (۳) ترانۂ شوق۔ آپ کا دیوان ''فیضانِ شوق'' کے نام سے شائع ہو گیا ہے ۲۷ر اپریل ۱۹۲۵ء کو گونڈہ میں انتقال کر گئے۔

اگرچہ شوق کی شہرت کا دارومدار ان کی مثنوی گوئی پر ہے تاہم انھوں نے عرصے تک غزل گوئی کی اور پورا دیوان بہم پہنچایا۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منتخب اشعار

آنکھ اس ادا سے اُس نے دکھائی کہ میں نے شوق — چپکے سے اپنا لے کے بھرا جام رکھ دیا

تمھاری غیر کی، ناصح کی، اب تو سب کی سنتے ہیں — کسی کی ہم نہیں سنتے تھے، وہ بھی اک زمانہ تھا

کیا رنگ کہوں شگفتگی کا — اک پھول کھلا تھا چاندنی کا

موت آ گئی، اب آئے تو کیا دو گے تم آ کر — کچھ نیند نہیں ہے کہ جگا دو گے تم آ کر

دامن کو ذرا بچائے رکھنا — دنیا نہیں گرد ہے سفر کی

خدا ہی ہے مری توبہ کا جب ساقی کہے مجھ سے — ارے پی بھی کہاں کی پارسائی لے کے بیٹھا ہے

دلھن کی شکل ہر گل نے لباسِ سرخ پہنا ہے — شجر کے جسم پر کیا خوشنما پھولوں کا گہنا ہے

بتاؤں کیا شبِ فرقت میں سانس کی حالت — تمام رات چھری سی جگر پہ چلتی ہے

جس طرف کی تان سنیے اک نرالا راگ ہے — شوق اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ ہے

اشک دہلوی

میر قطب الدّین احمد نام، عرفیت میاں مسیتا، تخلّص اشک۔ ولادت تقریباً ۱۸۴۸ء۔ اِن کے بزرگ قصبہ جلیسر، ضلع ایٹہ میں سکونت پذیر تھے، مگر اشک کے والد نے دہلی کی بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اشک یہیں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ابتدائے عمر میں لکھنؤ جا کر اپنے ماموں میر عباس سے شعر و سخن میں اصلاح لی، پھر ذوق اور انور سے فیضِ سخن حاصل کیا۔ انور کی وفات کے بعد داغ کے شاگرد ہو گئے تھے۔ داغ کے پُر تکلّف دوست تھے۔ اُن کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے:

اُنھیں اَور ہیں کون بہکانے والے
یہی آنے والے، یہی جانے والے

ریاض خیر آبادی

نام ریاض احمد، تخلّص ریاض۔ ''لسان الملک'' خطاب۔ ۱۸۵۳ء میں خیر آباد، ضلع سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ ریاض نے فارسی اپنے والد سے پڑھی۔ ابتدائے عمر سے ہی انھیں شاعری کا شوق تھا۔ ریاض نے پہلے مظفر علی اسیر کی شاگردی اختیار کی، بعد میں امیر مینائی سے اصلاح لی۔ ۱۸۷۲ء میں خیر آباد سے ''ریاض الاخبار'' جاری کیا۔ ۱۸۷۹ء میں خیر آباد ہی سے ایک شعر و سخن کا ماہ نامہ ''گلدستۂ ریاض'' جاری کیا جس کا مقصد شعرا کے بہترین اشعار کی اشاعت تھی۔ ۱۸۸۳ء میں گورکھ پور سے ''فتنہ'' اور ''عطر فتنہ'' جاری کیا جس میں ادبی لطائف اور ذوقِ سخن کے لیے کافی مواد ہوتا تھا۔ راجا صاحب محمود آباد کے اصرار سے مجبور ہو کر مع ''ریاض الاخبار'' کے لکھنؤ چلے آئے۔ قیامِ لکھنؤ کے زمانے

میں نواب حامد علی خاں، فرماں روائے رام پور نے دو مرتبہ کوشش کی کہ ریاض رام پور آ جائیں، مگر انھیں لکھنؤ چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ ایک نا کردہ گناہ کے جرم میں ایک شخص کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ ریاض اس کیس سے واقف تھے، وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اپنے اخبار وغیرہ سے قطع تعلق کر کے محمود آباد کی پنشن پر قناعت کر کے خیر آباد میں خانہ نشین ہو گئے۔ ریاض نماز پانچوں وقت پڑھتے تھے اور روزے تیسوں رکھتے تھے۔ رینالڈس کے دو ناول ایک انگریزی داں دوست کی مدد سے اپنی زبان اور اپنے انداز سے ''تصویر'' ''حرم سرا'' اور ''نظارہ'' کے نام سے شائع کیا۔ ''ریاض رضوان'' کے نام سے ریاض کی کُلّیات شائع ہوگئی ہے۔ ریاض خمریات کے امام کہے جاتے ہیں۔ ۳۰/جولائی ۱۹۳۴ء کو خیر آباد میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

ریاض مشکل ہی سے نالہ و ماتم کا وہ نیم مردہ انداز اختیار کرتے ہیں جو اکثر اردو کی عشقیہ شاعری کی خصوصیت کے طور پر پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات ضرور مانی جائے گی کہ شراب کے موضوع کو جس امتیازی شان سے ریاض نے پیش کیا ہے اس میں کوئی ان کا شریک نہیں۔ (پروفیسر امرناتھ جھا)

منتخب اشعار

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاضؔ
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

عالمِ ہُو میں کچھ آواز سی آ جاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

باغباں! کام ہمیں کیا ہے، وہ اُجڑے کہ رہے
جب ہمیں باغ سے نکلے تو نشیمن کیسا

توبہ کر کے آج پھر پی لی ریاضؔ
کیا کیا کم بخت تُو نے کیا کیا

جنّت سے کم سہی، مگر اچھا تھا مئے کدہ
جب تک وہاں تھے ہم، غمِ فردا تو کچھ نہ تھا

وہ کون ہے دنیا میں جسے غم نہیں ہوتا
کس گھر میں خوشی ہوتی ہے، ماتم نہیں ہوتا

کچھ بھی ہو ریاضؔ آنکھ میں آتے نہیں آنسو
مجھ کو تو کسی بات کا اب غم نہیں ہوتا

وصل میں پوچھنے بیٹھے ہو تم افسانۂ ہجر
میں ذرا تم کو گلے اپنے لگا لوں تو کہوں

آتشِ شوق بھڑک اُٹھی ہے موقع پا کر
ہجر کی بات لگی دل کی بجھا لوں تو کہوں

ذرا جو ہم نے انھیں مہرباں دیکھا
نہ ہم سے پوچھیے کیا رنگِ آسماں دیکھا

بہت ہی روئے گلے مل کے ایک ایک سے ہم
لُٹا ہوا جو کوئی ہم نے کارواں دیکھا

وہ دل مرا ہو کہ دل کی ہو آہ، کوئی ہو
بجھی سی آگ کا اُٹھتے ہوا دھواں دیکھا

کوئی مُنہ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائے گی یوں ہی جبیں پر

بہت ہے جم کو اپنے جام پر ناز
ذرا لانا مرا ٹوٹا ہوا دل

کس غضب کی ہوا میں مستی ہے
کہیں برسی ہے آسماں سے آج

ہمیں خدا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا
نکل گئے ہیں بہت دور جستجو سے ہم

فسردہ دل ہوں، مجھے کیا ہے، کوئی موسم ہو
بھری بہار میں کیا تھا، جواب خزاں میں نہیں

بھر بھر کے جام بزم میں چھلکائے جاتے ہیں
ہم اُن میں ہیں جو دور سے ترسائے جاتے ہیں

وہی ہم ہیں نہ چھوڑا تار تک ہم نے گریباں کا
وہی ہم ہیں کہ اب ٹکڑے لیے دامن کے بیٹھے ہیں

اُٹھے کبھی گھبرا کے تو مے خانے میں ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

کوئی ناخوش ریاضؔ سے کیوں ہو
اِس روش کا وہ آدمی ہی نہیں

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

کل تو روتے تھے اپنے دامن کو
اے جنوں آج آستیں بھی نہیں

ایک جھونکے نے اُلٹ دی طرب انگیز بساط
اے ریاضؔ! آج سے دنیا کی ہوا اَور ہوئی

اچھی پی لی، خراب پی لی
جیسی پائی، شراب پی لی

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اُٹھی نگہِ انتخاب کی

روشن کیے چراغِ لحد لالہ زار نے
اس مرتبہ تو آگ لگا دی بہار نے

جامِ مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

شغلِ مے اور معاصی سے ہے اچھا زاہد!
غمِ دُنیا سے فراغت تو ذرا ہوتی ہے

کیسا پینا، کہاں کی توبہ!
اب میں ہوں، خدا ہے، بے خودی ہے

غم مجھے دیتے ہو دشمن کی خوشی کے واسطے
کیوں برے بنتے ہو تم ناحق کسی کے واسطے

پایا جو تجھے تو کھو گئے ہم
بیدار ہوئے تو سو گئے ہم

اُترنے والے ابھی تک نہ بام سے اُترے
تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خُم رکھ دیں
جہاں ساغر پٹک دیں، چشمۂ زم زم نکلتا ہے

کتنے کعبے ملے، رستے میں کئی طور ملے
ان مقامات سے ہم کو وہ بہت دور ملے

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے
خداوندا! مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے

کلیم آئے تو کُھل کے جلوہ دکھایا
ہم آئے تو پردے سے باہر نہ نکلے

ڈراتا ہے ہمیں محشر سے تُو واعظ، ارے جا بھی
یہ ہنگامے تو ہم نے روز کوئے یار میں دیکھے

اُٹھواؤ میز سے مَے و ساغر ریاضؔ جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

کبھی حرفِ محبت تا بہ لب آیا تھا چپکے سے
اسی نے رفتہ رفتہ طول کھینچا داستاں ہو کر

طنزیہ و مزاحیہ اشعار

سُنا ہے ریاضؔ اپنی داڑھی بڑھا کر
بڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں

جنابِ شیخ نے جب پی تو مُنہ بنا کے کہا
مزہ بھی تلخ ہے، کچھ بُو بھی خوشگوار نہیں

بڑے پاک طینت، بڑے صاف باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

کہتی ہے اے ریاض! درازی یہ ریش کی
ٹٹی کی آڑ میں ہے مزہ کچھ شکار کا

جا لگا کے پہنچتے ہیں گلرخوں میں ریاضؔ
کچھ ان کی ریشِ مبارک کا اعتبار نہیں

کس شوق سے شریکِ جماعت ہوئے تھے ہم
دیکھا سلام پھیر کے تو شیخ جی نہیں

شیخ صاحب! کیا چُھپا کر لے چلے رومال میں
کچھ نہ کچھ حصہ رہے یاروں کا بھی اس مال میں

جب دیکھیے تو ہے مَے و معشوق پر نگاہ
با ایں ہمہ ریاضؔ بڑے پارسا بھی ہیں

دیکھ کر ہنستے ہو کیا تم صورتِ پاکِ ریاضؔ
یہ بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

جی نہ مانا حضرتِ ناصح کو آتے دیکھ کر
کچھ یوں ہی تھوڑی سی پی لی دل لگی کے واسطے

کمر سیدھی کرنے ذرا مے کدے میں
عصا ٹیکتے کیا ریاضؔ آ رہے ہیں؟

شرماؤ ریاضؔ مَے کشی سے
لمبی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی

بوتل جب اُس کے حجرے میں بُھولے، بھری ملی
واعظ بھی آدمی ہے بڑے اعتبار کا

بیخود بدایونی

مولوی عبدالحئی نام، بیخود تخلّص۔ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۷۵۔۱۸۷۴ء میں وکالت کی سند

حاصل کی۔ پہلے حالی کے شاگرد ہوئے بعد میں داغ سے اصلاح لینا شروع کی۔ والد کے انتقال کے بعد سنبھل اور اس کے بعد شاہ جہاں پور میں وکالت کرتے رہے۔ ریاست جودھپور میں سپیشل مجسٹریٹ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں بدایوں میں انتقال ہوا۔ آپ کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''فسانۂ بیخود،'' ''مرآۃ الخیال'' وغیرہ۔

منتخب اشعار

وصالِ یار تمہیدِ فراقِ ہر دو عالم ہے — کہ اس کا ہو کے پھر کوئی کسی کا ہو نہیں سکتا

اک دھوم ہے جہاں میں ترے فیضِ عام کی — ساقی بھلا ہو ہم کو بھی مولا کے نام کی

بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں — کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں — عاشقی بندگی نہ ہو جائے

مرزا/ رسوا، محمد ہادی

اصل نام محمد ہادی اور مرزا تخلّص تھا۔ ناول نگاری کے لیے انھوں نے ایک نیا نام مرزا رسوا اختیار کیا۔ مرزا کا سنہِ پیدائش ۱۸۵۸ء ہے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ علم حاصل کرنے کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔ مرزا نے اپنے بل بوتے پر میٹرک پاس کیا۔ بعد میں مرزا نے رڑکی انجینئرنگ کالج سے اورسیری کا امتحان پاس کیا اور کوئٹہ میں ۷۰ روپیہ ماہوا پر ملازم ہو گئے۔ اسی دوران انھیں علم کیمیا کا شوق پیدا ہوا۔ بمبئی اور ولایت سے آلات منگوائے اور لکھنؤ آ کر تجربات کرنے لگے۔ کیمیا کے شوق میں نوکری بھی چھوڑنی پڑی۔ جب روپیہ ختم ہو گیا تو لکھنؤ کرسچین کالجیٹ اسکول میں فارسی کے ٹیچر ہو گئے۔ معلّمی کے دوران پنجاب یونیورسٹی سے ایف اے اور بی اے پاس کیے۔ شاعری میں پہلے انھوں نے مرزا دبیر سے رجوع کیا، مگر جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا جعفر اوج سے اصلاح لینا شروع کی۔ مرزا نے آمدنی بڑھانے کے لیے ترجموں اور ناول نگاری کی طرف بھی توجہ کی۔ یہ حیدر آباد (دکن) بھی گئے اور ۴۰۰ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ حیدر آباد، دکن میں جس جگہ ان کا تقرر تھا وہاں کی آب و ہوا ان کو راس نہ آئی، چناں چہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ ۱۹۰۲ء میں مرزا کو ہیئت اور نجوم سے دلچسپی ہو گئی۔ تصنیف و تالیف اور شاعری و علم و ادب کا سلسلہ لکھنؤ میں ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۲۰ء کے آخر یا ۱۹۲۱ء کے آغاز میں مرزا دوبارہ حیدر آباد، دکن گئے اور دارالترجمہ میں ملازم ہو گئے۔ مرزا ٹائیفائڈ کے مرض میں ۲۱/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو حیدر آباد، دکن میں انتقال کر گئے۔

مرزا نے کتبِ فلسفہ کے ترجمے کیے۔ موسیقی سے انھیں بہت شوق تھا۔ ان کی مذہبی معلومات بہت وسیع تھیں۔ سائنس سے اُنھیں خاص دلچسپی تھی۔ وہ کیمسٹری کے بڑے ماہر تھے۔ مرزا نے شارٹ ہینڈ مینول پر بھی کام کیا۔ ۰۹-۱۹۰۸ء میں شارٹ ہینڈ مینول چھپ گئی اور اُس پر مرزا کا نام آ گیا۔ اُنھوں نے متعدد مثنویاں لکھیں۔ ''امراو جان ادا'' ناول کے علاوہ کئی اور ناول تحریر کیے۔ مرزا ہمہ جہت شخص تھے۔

منتخب اشعار

یہ فقط آپ کی عنایت ہے ۔۔۔ ورنہ میں کیا، مری حقیقت کیا

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دلاویزی ۔۔۔ تمام عمر کا قِصہ لکھا ہوا پایا

لطف ہے کون سی کہانی میں ۔۔۔ آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے اداؔ! ۔۔۔ آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

ہجر میں نالہ و فریاد سے باز آ رُسواؔ ۔۔۔ ایسی باتوں سے وہ بے درد خفا ہوتا ہے

ہے یقیں، وہ نہ آئیں گے پھر بھی ۔۔۔ کب نگہ سُوے در نہیں ہوتی

احسان شاہ جہاں پوری

نام ابوالاعجاز منشی احسان علی خاں، تخلّص احسان۔ ۱۸۵۷ء میں اوٹا، ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین شاہ جہاں پور چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ احسان صاحب کی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی۔ سولہ برس کی عمر میں طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی اور حافظ انصار احمد تائبؔ سے اصلاح لینا شروع کی۔ بعد میں جلال لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۸۴ء میں روزگار کی تلاش میں گورکھ پور پہنچے اور محکمہ بندوبست میں ملازم ہو گئے۔ ۱۸۹۰ء میں سند مختاری حاصل کی اور وطن آ کر عدالت فوجداری اور کلکٹری میں مختاری شروع کی۔ بعد ازاں دکن جا کر داغ کے شاگرد ہوئے۔ ''خم کدۂ خیال'' ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔ ۲۸ رجون ۱۹۱۴ء کو انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

اب ساتھ نہیں چھوڑتے، ہشیار بڑے ہیں ۔۔۔ وہ میرے برابر صفِ محشر میں کھڑے ہیں

اِس کو نہ سوچیے کہ ستم یا کرم ہوا ۔۔۔ خنجر اُٹھائیے، سرِ تسلیم خم ہوا

حسن بریلوی

مولانا حسن رضا خاں نام، حسن تخلّص۔ یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء کو بریلی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آپ احمد رضا خاں صاحب کے برادرِ خورد تھے۔ شعر و سخن کا شوق ابتدائے عمر سے تھا۔ کچھ دنوں تک خود مشقِ سخن کرتے رہے۔ بعد ازاں داغ کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ ایک مدّت تک رام پور میں رہ کر داغ سے فیض حاصل کرتے رہے۔ آپ کے دیوان غزلیات کے علاوہ بقیہ کُل کتابوں اور رسالوں پر مذہبی رنگ غالب ہے۔ آپ نے سفرِ حج سے واپس آ کر ۱۸/ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو بریلی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

منتخب اشعار

باغ جنّت میں نرالی چمن آرائی ہے — کیا مدینے پہ فدا ہو کے بہار آئی ہے؟

روٹھ کر ان سے ہم کیا جیتیں — وہ منا لیتے ہیں خفا ہو کر

مریضِ غم کی نہ پوچھو حالت، جو تم کو ملنا ہے جلد مل لو — پھری ہیں آنکھیں، چھٹی ہیں نبضیں، بتاؤ کیا تم کو حال کیا ہے

مَے سے میں نے کب کی توبہ — توبہ توبہ کیسی توبہ

شیشہ اُٹھا کر طاق سے ہم نے — طاق پہ رکھ دی، ساقی توبہ

پوچھتے کیا ہو کہ دل میں کون ہے — لو یہ آئینہ اُٹھا کر دیکھ لو

ڈھونڈتی تھی ہر طرف تجھ کو نگاہِ منتظر — کچھ ترے بیمار وقتِ واپسیں کہنے کو تھے

پوچھتے جاتے ہیں یہ ہم سب سے — مجلسِ وعظ میں شراب بھی ہے؟

دیکھ آؤ مریضِ فرقت کو — رسمِ دُنیا بھی ہے، ثواب بھی ہے

ساقیا اور بھی اک ساغرِ پُر جوش مجھے — دیکھ ایسا نہ ہو آ جائے کہیں ہوش مجھے

بل کھا رہے ہیں چہرے پہ گیسوئے پُرشکن — مارِ سیہ کھیل رہے ہیں چراغ سے

سالک، منشی سالک رام

نام منشی سالک رام، سالک تخلّص۔ ۱۸۶۱ء میں قصبہ گروار، ضلع بلیا (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ذات کے کائستھ تھے۔ مدرسہ چشمہ رحمت، غازی پور میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۰ء میں کچھ انگریزی بھی پڑھی۔ غازی پور میں سپروائز قانون گو کے عہدے پر فائز رہے۔ شمشاد لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ دیوان ریختہ کے علاوہ ''نجاتِ سالک'' کے نام

سے نعتیہ کلام شائع ہو چکا ہے۔ تاریخ کہنے کا اچھا ملکہ تھا۔ ۳۵-۱۸۳۴ء میں قصبہ گروار میں وفات پا گئے۔

منتخب اشعار

جنت کی ہوس، خلد کی خواہش نہ رہے گی
اک بار جو قسمت مجھے دکھلائے مدینہ

سُرمے کی طرح آنکھوں میں سالکؔ میں لگا لوں
ہاتھ آئے جو خاکِ درِ مولائے مدینہ

غلط شہرہ ہے میری اور ان کی آشنائی کا
مجھے فخرِ غلامی اُن کو دعوا کبریائی کا

عشق صادق ہو تو معشوق نہ کیوں ہو بے کل
شمع کو پہلے ہی پروانے سے جلتے دیکھا

شرمِ گنہ سے مُنہ کو نہ ڈھانکوں کفن سے کیوں
کچھ سوجھتا نہیں مجھے اے کبریا جواب

بہت مشکل سے ہاتھ آتا ہے سالکؔ
نہیں آسان لینا غیر کا دل

اگر یہ جانتے پہلے کہ تُو دل ہی میں رہتا ہے
تو کیوں دَیر و حرم کی ٹھوکریں بے کار کھاتے ہم

اگرچہ ہے بُرا انجامِ اُلفت
مزہ آتا ہے، لیکن ابتدا میں

نہ کر وہ کام ہرگز جو تری طاقت سے باہر ہو
وہیں تک پاؤں پھیلانا ہے لازم جتنی چادر ہو

ضعیفی آ گئی، اب کیا ٹھکانا زندگانی کا
چھلک جانے کی دہشت ہے، اگر لب ریز ساغر ہو

ہُنر سے تو خالی ہیں دنیا میں لاکھوں
مگر عیب سے کوئی خالی نہیں ہے

تمھیں بھی بات کرنے کا سلیقہ آ گیا سالکؔ
یہ سچ ہے کام استادوں کی صحبت آ ہی جاتی ہے

کِیا بس میں سالکؔ نے خدمت سے سب کو
نہ منتر، نہ کوئی دعا جانتا ہے

نسیم بھرت پوری

سیّد شبیر حسن نام، نسیم تخلص۔ تاریخی نام مظہر حسین۔ ۱۸۶۱ء میں قصبہ پرسر، ریاست بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم سیّد محمد سونی پتی سے حاصل کی جو مومن اور امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۷۶ء میں داغ کو اپنی غزل اصلاح کے لیے بھیجی اور تمام عمر انھی کے شاگرد رہے۔ فن مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں میر خورشید علی نفیس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۹۰۳ء تک داغ پر جتنے اعتراضات ہوئے نسیم بھرت پوری ہی نے سب کے جواب دیے۔ نسیم ریاست بھرت پور میں سب انسپکٹر پولیس کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کا ۱۹۰۹ء میں بھرت پور میں انتقال ہوا۔ تدفین پرسر میں ہوئی۔

منتخب اشعار

ہر وقت کی ضد بُری ہے، دیکھو
کہنا بھی کیا کرو کسی کا

اب حشر میں ہو فیصلۂ جَور و ستم بھی
اللّٰہ بھی ہے، غیر بھی ہیں، تم بھی ہو، ہم بھی

تمھاری زلف خود دل مانگ لے گی
یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

جان سے تنگ ہیں، دُنیا میں گزرنے والے
اے اجل! آ کہ مرے جاتے ہیں مرنے والے

شوق نیموی

محمد ظہیر احسن نام، شوق تخلّص، ابوالخیر کنیت۔ ۷ر نومبر ۱۸۶۱ء کو نیمہ، ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مزید تعلیم کے لیے پٹنہ گئے اور پھر غازی پور میں مدرسہ چشمۂ رحمت میں داخل ہوئے۔ اس وقت شمشاد لکھنوی اس مدرسہ میں فارسی کے مدرس اوّل تھے۔ جناب شوق نے شمشاد لکھنوی سے فارسی پڑھی۔ فنِ شاعری میں اکثر حضرات ان کے شاگرد تھے۔ شوق نیموی نے بھی شعر وسخن میں انھی سے اصلاح لینا شروع کی۔ بعدازاں مزید تحصیل علم کے لیے لکھنؤ چلے گئے۔ ۲۵ر نومبر ۱۹۰۴ء کو انتقال کر گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد شاعری میں انھی کے شاگرد تھے۔

منتخب اشعار

چمن میں جو گل چیں نے کچھ پھول توڑے
تو یاد آ گیا دل دُکھانا کسی کا

ستم وجَور کی فریاد سے ہم در گزرے
ایسے گھبرائے ہوئے تم سرِ محشر کیوں ہو؟

دامنِ یار سے جا لپٹے ہمارے آنسو
گر کے اس طرح سنبھلتے ہیں سنبھلنے والے

صفی لکھنوی

نام سیّد علی نقی زیدی، تخلّص صفی۔ ''لسان القوم'' خطاب۔ ۳ر جنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم روایتی انداز میں ہوئی۔ انگریزی تعلیم انٹرنس تک حاصل کی۔ ۱۸۷۹ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ علی یہاں کامل سے تلمذ حاصل تھا۔ صفی لکھنوی کو نظم سے زیادہ لگاو تھا۔ قومی نظمیں خوب لکھتے تھے۔ صفی ایک مسلّم

الثبوت استاد تھے۔ ۲۵؍جون ۱۹۵۰ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے تین سال بعد ان کا دیوان ''صحیفۃ الغزل'' شائع ہوا۔

منتخب اشعار

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ۔۔۔ ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

یہ صلہ ہے عمر بھر کی محنتِ برباد کا ۔۔۔ سننے بیٹھے ہیں وہ افسانہ دلِ ناشاد کا

اسی کو بڑھ کر گلے سے لگا لیا میں نے ۔۔۔ جسے بھی دردِ محبت کا راز داں دیکھا

کہیں بہتے ہوئے دریا کا رخ پیچھے پلٹتا ہے ۔۔۔ دلِ شوریدہ کیوں مشتاق ہے عمرِ گریزاں کا

خدا نے دی ہیں جن روشن دلوں کو دوربیں نظریں ۔۔۔ سوادِ کفر میں وہ نورِ ایماں دیکھ لیتے ہیں

اے راہ رو مجھ کو نہ لِلّٰہ مٹاؤ ۔۔۔ اک نقشِ کفِ پا ہوں کسی راہ گذر میں

سنے گا کون، سنا جائے گا صفی کس سے ۔۔۔ تمھاری رام کہانی یہ زندگی بھر کی

ممنون ہوں جہاں کے نشیب و فراز کا ۔۔۔ اکثر بگڑ کے خود مری حالت سنبھل گئی

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کیے ۔۔۔ کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کیے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے ۔۔۔ آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

~~اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے ۔۔۔ اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے~~ (۱)

دَیر اُسی کو جانیے، کعبہ اُسی کو مانیے ۔۔۔ پوجیے وہ دل جسے ہم دردِ انساں دیکھیے

راسخ دہلوی (1863-1907)

نام عبدالرحمٰن، راسخ تخلّص۔ نواحِ پانی پت کے رہنے والے تھے، مگر عمر کا زیادہ حصّہ دہلی میں گزرا۔ کم سنی سے مطالعے اور کتب بینی کا شوق تھا۔ فقہ، معقول، منقول اور کتبِ حدیث پر کامل عبور تھا۔ اوائل مشقِ سخن میں مرزا ارشد، سیف الحق ادیب، پنڈت جواہر ناتھ ساقی کے ہم مشق اور ہم صحبت رہے۔ داغ کے ہم عصر تھے۔ مثنوی مولانا روم کی جو شرح انھوں نے لکھی ہے وہ صوفیۂ کرام میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ دیوانِ اوّل ''مرآۃ الخیال''

---

(۱) جس نظم کا یہ شعر ہے، اُس میں صفی لکھنوی نے ''اِس دین'' لکھا ہے، لیکن ''اِس دین'' کے بجائے ''اسلام'' مشہور ہو گیا ہے۔

۹۶-۱۸۹۵ء میں چھپا۔ دوسرا دیوان ان کی بیگم کے پاس غیر مطبوعہ تھا۔ بعارضۂ بواسیر ۲۹ر ستمبر ۱۹۰۷ء کو بہ عمر ۴۴ر سال دہلی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

پی بھی لے ناصحِ نادان مری خاطر سے
یوں سمجھ جس نے پلائی، وہ گنہگار رہا

راسخؔ کی فاقہ مستی سے اللہ کی پناہ
کھاتا ہے سوکھی روٹی بھگو کر شراب میں

مزہ برسات کا دُونا ہو، گر ساون کی راتوں میں
اُدھر چھم چھم چھم برستا ہو، اِدھر آ جائیں وہ چھم سے

بشر کو چاہیے پاسِ دلِ بشر رکھے
کسی کا ہو کے رہے یا کسی کو کر رکھے

بیخود دہلوی

نام سیّد وحید الدّین، تخلّص بیخودؔ۔ پہلا تخلّص نادرؔ تھا۔ ۲۱ر مارچ ۱۸۶۳ء کو بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ دہلی ان کا مولد و مسکن تھا۔ بیخودؔ نے دہلی میں اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا حالیؔ سے ''مہرِ نیم روز'' اور اساتذہ کے دواوین پڑھے۔ حالیؔ ہی کے ایما سے داغؔ کے شاگرد ہوئے۔ صدر الدّین آزردہ بیخودؔ کی والدہ کے پھوپھا تھے۔ ان کے والد اور دادا بھی شاعر تھے۔ اس طرح شاعری بیخودؔ کو ورثے میں ملی تھی۔ شاعری میں دلی کی ٹکسالی زبان، محاورات اور روزمرّہ کا استعمال جس خوبی سے بیخود کرتے تھے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی وجہ سے تمام اساتذۂ فن نے انھیں داغؔ کا صحیح جانشین تسلیم کیا ہے۔ بیخودؔ خوش پوشاک اور خوش خوراک ہونے کے علاوہ شاہ خرچ بھی تھے۔ ۱۹۴۸ء میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ۱۵۰ر روپیہ ماہوار وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند سے ملتا تھا جس کے سربراہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ ان کے دو دیوان ''گفتارِ بیخود'' اور ''شہوارِ بیخود'' طبع ہو چکے ہیں۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

منتخب اشعار

دل میں بس جائے اگر گیسوئے احمد کا خیال
سانس بھی آئے تو خوشبو سے معطّر آئے

ہو لیے جس کے ہو لیے بیخودؔ
یار اپنا تو یہ حساب رہا

شمعِ مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا
تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا؟

جادو ہے یا طلسم تمھاری زبان میں
تم جھوٹ کہہ رہے تھے، مجھے اعتبار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دلِ مرحوم کے لیے کم بخت نامراد لڑکپن کا یار تھا

باغِ عالم کے تماشائی مجھے بھی دیکھ لیں میں بھی اِس گلشن کا ہوں اک پھول کملایا ہوا

دامن کسی کا کھینچ رہا تھا خیال میں اب دیکھتا ہوں میرا گریبان پھٹ گیا

چوٹ کھا کر ہی تو انسان بنا کرتا ہے دل تھا بیکار اگر درد نہ ہوتا پیدا

زمانے کے سب غم غلط ہو گئے مرے ہاتھ جامِ شراب آ گیا

حور کے شوق میں تڑپا کیے ہم تو واعظ کہیے، کس طرح کٹی قبلۂ حاجات کی رات؟

پھر آ گیا قرار دلِ بے قرار کو پھر ایک بار دیکھ لو مجھ کو اُسی طرح

ہم اسے دیکھا کیے جب تک ہمیں غفلت رہی پڑ گیا آنکھوں پہ پردہ ہوش آ جانے کے بعد

راہ میں بیٹھا ہوں میں تم سنگِ رہ سمجھو مجھے آدمی بن جاؤں گا کچھ ٹھوکریں کھانے کے بعد

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہاراں کی بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجّی گریباں کی

تصویر کیوں دکھائیں تمھیں نام کیوں بتائیں لائے ہیں ہم کہیں سے، کسی بے وفا کی ہے

ساحر، پنڈت امرناتھ

نام پنڈت امرناتھ مدن، تخلّص ساحر۔ ۲۹؍مارچ ۱۸۶۳ء کو بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ وطن دہلی تھا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ اور ان کے جانشینوں کے مشہور دیوان راجا دینا ناتھ آپ ہی کے خاندان کے ایک معزز رکن تھے۔ ساحر نے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور سب سے پہلے فارسی میں شعر کہا۔ مولانا عبدالحلیم عاصم کاشانی جو فارسی کے ادیب اور شاعر تھے، ان سے فارسی میں تلمذ اختیار کیا۔ ۲۲ سال کی عمر میں اجمیر گئے اور وہاں احباب کی ترغیب سے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ ایک عرصے تک عہدہ تحصیل داری پر فائز رہے۔ دہلی میں ہر مہینے کے آخری ہفتے کو مشاعرہ آپ کے دولت خانے پر ہوتا تھا۔ آپ متعدد کتابوں کے مترجم مؤلف و مصنف ہیں۔ آپ کا اردو دیوان ''کفرِ عشق'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ ۱۱؍ستمبر ۱۹۴۲ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

دل ہے بت خانۂ اصنامِ خیالی ساحرؔ تُو وہ کافر ہے کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

اے پری رُو! ترے دیوانے کا ایماں کیا ہے
اک نگاہِ غلط انداز پہ قرباں ہونا

وقفِ تسلیم و رضا چاہیے دل عاشق کا
ساحرؔ آسان نہیں بندۂ جاناں ہونا

پردہ پڑا ہوا تھا غفلت کا چشمِ دل پر
آنکھیں کھلیں تو دیکھا عالم میں تُو ہی تُو ہے

جلوۂ حق نظر آتا ہے صنم میں ساحرؔ
ہے مرے کعبے کی تعمیر صنم خانوں سے

کوئی حرم سے، دَیر سے منسوب ہے کوئی
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمھارا کہیں جسے

ہم ہیں اور بے خودی و بے خبری
اب نہ رندی نہ پارسائی ہے

درِ صنم کدہ کو ہم نے جا کے کھڑکایا
حرم میں جب نہ ہوئے بار یاب کیا کرتے

میں اپنی ہستیِ موہوم کو مٹاتا ہوں
کہ دہر میں تری ہستی کا اعتبار رہے

بینظیر شاہ وارثی

سیّد محمد بینظیر شاہ وارثی۔ اصل نام سیّد صدیق احمد، بینظیر تخلّص۔ ۱۸۶۳ء میں کڑا، مانک پور، ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ عربی زبان پر اتنا عبور تھا کہ عربی میں شعر کہتے تھے۔ مناظرِ قدرت کے بیان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ درویش اور قلندر صفت تھے۔ غزل میں وجیہ اللّٰہ الہ آبادی اور مثنوی میں امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے۔ جوانی میں ترک وطن کر کے حیدر آباد، دکن چلے گئے۔ ان کا بہت سا کلام ایک سفر میں گم ہو گیا۔ ان کی مثنوی ''الکلام'' بہت مشہور ہوئی۔ ۲ر ستمبر ۱۹۳۲ء کو حیدر آباد، دکن میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

وہ ملیں گے تو سنائیں گے ہم افسانۂ قیس
اور در پردہ وہ اپنی ہی حقیقت ہوگی

زلف کچھ رخسار سے سرکی، سرک کر رہ گئی
اس گھٹا میں برق سی چمکی، چمک کر رہ گئی

بے کسی میں یاد آیا شعلۂ رخسارِ یار
قلب میں اک آگ سی بھڑکی، بھڑک کر رہ گئی

بڑی احتیاط طلب ہے وہ جو شراب ساغرِ دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی، جو بھری رہی تو بھری رہی

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل گئے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی، دھری رہی

گرا چھن کے پتوں سے نورِ قمر
کہ ہیرے کے ٹکڑے پڑے ہیں اِدھر

وہ بوٹوں میں کلیاں چٹکنے لگیں
وہ شاخوں پہ چڑیاں چہکنے لگیں

وہ شبنم نے جھڑکا چمن پر گلاب ۔۔۔ نہ رہ جائے تا کوئی سرگرم خواب

شاد، مہاراجا کشن پرشاد

مہاراجا کشن پرشاد نام، شاد تخلص۔ ۲۸؍جنوری ۱۸۶۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے دادا نے ان کو عربی اور فارسی میں بڑے قابل استادوں سے اعلا درجہ کی تعلیم دلائی تھی۔ شاد انگریزی، تلنگی اور مرہٹی زبانوں پر بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ داغ کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ایک دیوان ''خمکدۂ رحمت'' میں صرف نعتیہ اشعار ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں آپ ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم مقرر ہوئے اور ''یمین السّلطنت'' کا خطاب عطا ہوا۔ آپ کے دربار میں شعرا اور مصنفین کا ہمیشہ جمگھطا رہتا تھا۔ ۹؍مئی ۱۹۴۰ء کو حیدرآباد دکن میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

کفن سے مُنہ چھپاتے ہیں گناہوں کی ندامت سے ۔۔۔ خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرمائے جاتے ہیں

یہ غم کدہ بھی الٰہی عجیب بستی ہے ۔۔۔ کسی کا اوج یہاں ہے، کسی کی پستی ہے

خموشی کس لیے ہے، بات کیوں مجھ سے نہیں کرتے ۔۔۔ قسم ہے میرے سر کی، سچ کہو، روٹھے ہو کیا مجھ سے

میں اپنا آپ عاشق ہوں، میں اپنا آپ ہوں معشوق ۔۔۔ حقیقت میری کیا جانے کوئی میرے سوا مجھ سے

آصف، نواب میر محبوب علی خاں

نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک آصف جاہ ششم، تخلص آصف۔ ۱۸؍اگست ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے۔ حیدرآباد، دکن کے تاجدار تھے۔ آپ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی سے کماحقہ واقف تھے۔ علوم مروجہ کے علاوہ فنون سپہ گری و شہسواری کے ماہر تھے۔ آپ کے علم و فن اور شعر و سخن کی قدردانی کی وجہ سے علما و فضلا اور مشہور شعراء کا مجمع دارالسلطنت حیدرآباد میں ہو گیا تھا۔ ان کی علم پرستی اور قدردانی کی بین مثال مولوی سیّد احمد دہلوی کی مشہور اردو لغت ''فرہنگ آصفیہ'' کی طباعت و اشاعت ہے جس کے واسطے اعلاحضرت نے نہ صرف زرکثیر مصنف کو عنایت کیا بلکہ اس کے صلے میں پچاس روپیہ ماہوار پنشن عمر بھر کے واسطے مقرر کر دیا تھا۔ محبوب علی آصف کو داغ سے تلمذ حاصل تھا۔ داغ کے انتقال کے بعد جلیل مانک پوری سے اصلاح لیتے رہے۔ ۲۰؍اگست ۱۹۱۱ء کو حیدرآباد، دکن میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

پوچھتی ہے وہ نرگسِ مخمور — کس کو دعوا ہے پارسائی کا

انجام دیکھنا دلِ خانہ خراب کا — اس پر پڑے گا صبر مرے اضطراب کا

جھگڑے تو ہزاروں ہیں، مگر بات ہے اتنی — ہم تم سے وفا کر کے پشیمان بہت ہیں

سائل دہلوی

نواب سراج الدّین احمد خاں نام، کنیت ابوالمعظم اور تخلّص سائل تھا۔ ۲۹ر مارچ ۱۸۶۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اِن کا نام غالب نے رکھا تھا اور کنیت حسن نظامی نے۔ عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ سائل نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ ابتدا میں سراج تخلّص کرتے تھے۔ سائل نوابانِ لوہارو کے چشم و چراغ تھے۔ شاعری کا شوق ہوا تو شہزادہ مرزا عبدالغنی ارشد کے شاگرد ہوئے، پھر داغ سے استفادہ کیا۔ شاگرد کے علاوہ سائل داغ کے داماد بھی تھے۔ داغ کی مُنہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم سائل کی زوجہ ثانیہ تھیں۔ سائل ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو دہلی میں وفات پا گئے۔ ان کا کوئی دیوان نہیں چھپا۔

منتخب اشعار

ہمیشہ خونِ دل رویا ہوں میں، لیکن سلیقے سے — نہ قطرہ آستیں پر ہے نہ دھبّا جیب و داماں پر

درِ مے خانہ چوپٹ ہے تہجد کو ہوئی چوری — نرے ٹوٹے ہوئے شیشے فقط جھوٹے پیالے ہیں

گماں کس پر کریں مے کش، اِدھر واعظ، اُدھر صوفی — خدا رکھے، محلّے میں سبھی اللہ والے ہیں

قفس کے پاس دل تھامے ہوئے صیّاد بیٹھا ہے — اسیرِ غم! خدا جانے تری آواز میں کیا ہے

محمود رام پوری

محمود علی خاں نام، محمود تخلّص۔ ۱۸۶۵ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ کتب فارسی اور عربی مختلف اساتذہ سے رام پور میں پڑھیں۔ داغ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۸۷ء میں جب داغ رام پور سے رخصت ہوئے تو بھی اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء میں یہ حیدر آباد، دکن بھی گئے۔ آپ کے بہت شاگرد تھے۔ اشک رام پوری بھی آپ ہی کے شاگرد تھے۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۴۳ء کو انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

جب کہا اُس نے آج کیوں چُپ ہو — پھر شکایت کا حوصلہ نہ رہا

تم شکل سے ہو ہماری بیزار — اللّٰہ ! اب ایسے ہو گئے ہم

جان دینے پہ دیا اس نے یہ طعنہ شبِ غم — جس سے کچھ ہو نہیں سکتا ہے وہ مرجاتے ہیں

مضطر خیر آبادی

نام سیّد محمد افتخار حسین، مضطر تخلّص۔ 'اعتبار الملک'، 'اقتدار جنگ بہادر' خطاب۔ ۱۸۶۵ء میں خیر آباد (یو پی)، بھارت میں پیدا ہوئے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے نواسے اور شمس العلماء عبدالحق خیر آبادی کے بھانجے تھے۔ محمد حسین، بسمل (بڑے بھائی) اور امیر مینائی سے تلمذ حاصل تھا۔ مضطر ریاست ٹونک کے درباری شاعر تھے۔ ان کا دیوان چھپا نہیں۔ جاں نثار اختر ان کے فرزند رشید تھے۔ ۲۰/مارچ ۱۹۲۷ء کو گوالیار میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

علاجِ دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا — تم اچھا کر نہیں سکتے، میں اچھا ہو نہیں سکتا

تمھیں چاہوں، تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں — مرا دل پھیر دو، مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

میں تو تقدیر پہ روتا ہوں تُو اے شمع بتا — تجھ کو کس بات پہ رونا سرِ محفل آیا

خاکِ تربت سے مری دامن کشاں جاتے ہو تم — مجھ کو مٹّی میں ملا کر اب کہاں جاتے ہو تم؟

ذرا اِدھر بھی تو برقِ نظر چمک جائے — نگاہِ ناز کے امیدوار ہم بھی ہیں

کون نکلا یہ میرے پاس سے کہہ کر مضطر — ان سے اللّٰہ بچائے جو وفا کرتے ہیں

مدہوش ہی رہا میں جہانِ خراب میں — گوندھی گئی تھی کیا مری مٹّی شراب میں؟

خیر گئی نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتا نہیں — اور بھی دور ہو گئے آ کے ترے حضور میں

نہ کسی کے آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں — کسی کام میں جو نہ آ سکے، میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا، کوئی مجھ کو سُن کے کرے گا کیا — میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

مرا بخت مجھ سے بچھڑ گیا، مرا رنگ روپ بگڑ گیا — جو خزاں سے باغ اُجڑ گیا، میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں

پئے فاتحہ کیوں آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں — کوئی شمع لا کے جلائے کیوں کہ میں بے کسی کا مزار ہوں

نہ میں مضطراُن کا حبیب ہوں، نہ میں مضطراُن کا رقیب ہوں — جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں
فصلِ گل میں بخت بھی چمکا تو چمکا اس طرح — برق آئی اور نثارِ آشیاں ہونے لگی
یہ چاہت دشمنی کا گھر ہے، اس میں دوستی کیسی — محبت نام ہے رونے کا رونے میں ہنسی کیسی
یہ چشمِ حقیقت بیں کیا دیکھے سوا تیرے — سجدے سے ہمیں مطلب، کعبہ ہو کہ بت خانہ
اپنے قولِ وفا کو بھول گئے — تم تو بالکل خدا کو بھول گئے
اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کر کے مجھے — کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے
دَیر و حرم میں سب جگہ ڈھونڈ لیا، ملا نہیں — یہ بھی کسی کی چھیڑ تھی، اپنا پتا غلط دیا

حفیظ جون پوری

نام حافظ محمد علی، حفیظ تخلص۔ ۱۸۶۵ء میں جون پور میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے شعر و سخن کا شوق تھا۔ ۱۸۸۹ء میں جناب وسیم کے شاگرد ہوئے اور انھی کے ایما سے امیر مینائی کے زمرہ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ اگر چہ علمی استعداد زیادہ نہیں تھی، مگر کثرتِ مشق اور خداداد ذہانت سے اس فن میں اچھی قابلیت حاصل کر لی۔ پہلے سیّد ظفر حسن خاں، رئیس سولپور کے یہاں کچھ مدّت مصاحب رہے۔ اس کے بعد راجا سعادت علی خاں، رئیسِ پیغمبر پور کی سرکار میں ملازم رہے۔ ۲۴ر مئی ۱۹۱۸ء کو انتقال کر گئے۔ ان کے دو دیوان شائع ہو گئے ہیں۔

منتخب اشعار

جاؤ بھی اب نہ دو مجھے جھوٹی تسلیاں — مر جائیں گے تڑپ کے تمھاری بلا سے ہم
زاہد! وہ ڈھب بتا کہ یہیں مل رہے خدا — اب بت کدے کو چھوڑ کے کعبے کو جائے کون
حسینوں سے فقط صاحب سلامت دور کی اچھی — نہ ان کی دوستی اچھی، نہ اس کی دشمنی اچھی
بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
دن کو اک نور برستا ہے مری تربت پر — رات کو چادرِ مہتاب تنی ہوتی ہے
پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ — صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے
کروں یاد کس کس کو، کس کس کو روؤں — حفیظ اٹھ گئے مہرباں کیسے کیسے
حق بول کے منصور حفیظ آپ نہ بنیے — اِس وقت زمانے کی ہوا اور ہی کچھ ہے

تسلیم، منشی رام سہائے

نام منشی رام سہائے، تسلیم تخلّص۔ حاتم علی مہر کے شاگرد تھے۔ علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ وفات ۱۹۳۰ء۔ ان کا یہ شعر پیش خدمت ہے:

کیا کریں تم سے شکوۂ بیداد
اپنا یہ شیوہ، یہ شعار نہیں

ندیم، مصطفٰے

نام مصطفٰے ندیم، تخلّص ندیم۔ استنبول سے ۱۹۰۳ء میں ہندوستان آئے۔ واپس ترکی ۱۹۱۳ء میں چلے گئے۔ ترکی، فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ ۱۹۳۱ء میں انقرہ میں انتقال کر گئے۔ ان کا یہ شعر پڑھیے اور لطف اندوز ہوئیے:

راہ میں اُن سے ملاقات ہوئی
جس سے ڈرتے تھے، وہی بات ہوئی (۱)

محشر لکھنوی

نام سیّد کاظم حسین، محشر تخلّص۔ ۱۶؍اکتوبر ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے۔ وطن لکھنؤ تھا۔ میر علی محمد عارف سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کے انتقال کے بعد پیارے صاحب رشید کو کلام دکھانا شروع کیا۔ عربی، فارسی میں اچھی خاصی مہارت تھی۔ انگریزی اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا۔ محشر ابتدائے سنِ شباب سے ہی شیخ علی عباس کے یہاں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کو داروغہ کا عہدہ سونپا گیا تھا۔ کاغذ پر محشر صاحب کی تنخواہ چار روپیہ تھی، مگر شیخ صاحب جو کپڑے پہنتے تھے وہی ان کو پہناتے اور جو کھانا خود کھاتے وہی ان کو کھلاتے تھے۔ انھوں نے کبھی محشر صاحب کو اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھا۔ ملازمت کے فوراً بعد ہی ان کو اپنے محل کے قریب ایک چھوٹا مکان سکونت کے لیے دے دیا تھا۔ شیخ صاحب کے انتقال کے بعد دو تین برس تک محشر صاحب اپنی ملازمت پر برقرار رہے، مگر بعد میں ان کو ملازمت سے علاحدہ ہونا پڑا۔ تفریحی مشاغل میں شعر و سخن کے علاوہ کبوتر پالنا تھا۔ مہاراجا سر محمد علی محمد خاں، والئ محمود

(۱) ''مختصر تاریخ ادب اردو'' پروفیسر محمود بریلوی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۳۱۹

یہ شعر چراغ حسن حسرت کے نام بھی منسوب ہے۔ بحوالہ: ''جدید شعرائے اردو'' (جلد ۳: متأخرین)، ڈاکٹر عبدالوحید، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۶۳۱

آباد کو خبر ہوئی تو انھوں نے محشر لکھنوی کو بلا کر اپنے دامنِ دولت سے منسلک کر لیا۔ ان کی ملازمت کے ڈیڑھ یا دو سال بعد مہاراجا کا انتقال ہو گیا۔ محشر صاحب نوکری سے سبک دوش ہو کر گھر میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔

منتخب اشعار

ابر و پہ بل ہے اور نگہِ پُر جفا خفا — اُٹھا ہے کچی نیند سے کوئی خفا خفا

دے کے ساغر مجھے کس لطف سے ساقی نے کہا — دیکھتے جاؤ ابھی ہم تمھیں کیا دیتے ہیں

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری — کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

تم کو قسم ہے چھوڑ نہ دنیا جفا کوئی — مر جائیں گے تو یاد کرو گے کہ تھا کوئی

شکوۂ ہجرِ یار کون کرے — حُسن کو شرمسار کون کرے

آج کیوں دن ہی سے سوزِ شبِ تنہائی ہے — دل نے شاید ترے آنے کی قسم کھائی ہے

جلیل مانک پوری

جلیل حسن نام، جلیل تخلص۔ ۶۷-۱۸۶۶ء میں مانک پور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ طالبِ علمی کا زمانہ لکھنؤ میں گزرا جہاں فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ابتدا ہی سے سخن گوئی کا شوق تھا۔ بیس سال کی عمر میں امیر مینائی کے شاگرد ہو گئے۔ ۵ر ستمبر ۱۹۰۰ء کو حضرت امیر مینائی کے ہمراہ حیدر آباد، دکن پہنچے۔ حضرت داغ کی وفات کے بعد میر محبوب علی آصف نے اپنی استادی کا شرف بخشا اور ''جلیل القدر'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جب نواب میر عثمان علی تخت پر بیٹھے تو انھوں نے بھی اپنی استادی کے شرف سے سرفراز کیا۔ آپ نے ''فصاحت جنگ بہادر'' اور پھر ''امام الفن'' کے لقب سے عزّت افزائی کی۔ ۶ر جنوری ۱۹۴۶ء کو حیدر آباد، دکن میں انتقال کر گئے۔ ''تاجِ سخن''، ''جانِ سخن'' اور ''روحِ سخن''، تین دیوان ان کی یادگار ہیں۔ ''معراجِ سخن'' نعتیہ کلام اور سلام وغیرہ کا مجموعہ، ''معیارِ اردو'' محاورات کا مجموعہ بھی ان کی تصانیف ہیں۔ ''تذکیر و تانیث'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔

جلیل کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ، نہ کوئی مضمون آفرینی ہے نہ فکر و خیال کی بلندی، لیکن ان کے کلام کی سادگی، روانی، بے تکلف اور خیالات کا سلجھا ہونا اس گلاب کا سا حُسن ہے جس کے قبا کو گل بوٹے کی ضرورت نہیں۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

کچھ اِس ادا سے یار نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

بلبل کی بہار میں نہ پوچھو
مُنہ چومتی ہے کلی کلی کا

مُنہ پھیر کے یوں چلی جوانی
یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

خاکِ چمن میں شبنم وگل کا عجب ہے رنگ
ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہے شراب کا

جاتے ہو، خدا حافظ، ہاں، اتنی گزارش ہے
جب یاد ہم آ جائیں، ملنے کی دعا کرنا

کون بے کس غریقِ بحر ہوا
سر پٹکتی ہیں موجیں ساحل پر

قاصد پیامِ شوق کو دینا بہت نہ طول
کہنا فقط یہ اُن سے کہ آنکھیں ترس گئیں

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے، مگر دیکھنے کی تاب نہیں

جلیلؔ آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

سب باندھ چکے کب کے سرِ شاخِ نشیمن
ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا دیکھ رہے ہیں

نہ اشارہ، نہ کنایہ، نہ تبسم، نہ کلام
پاس بیٹھے ہیں، مگر دور نظر آتے ہیں

تم یاں سے گئے کیا مری دنیا ہی بدل دی
وہ لطف نہیں وہ سحر و شام نہیں

یا خدا دردِ محبت میں اثر ہے کہ نہیں
جس پہ مرتا ہوں اُسے میری خبر ہے کہ نہیں؟

نہ خوشی اچھی ہے اے دل! نہ ملال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھّے، وہی حال اچھا ہے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو، زمین چلے، آسماں چلے

تم جو یاد آئے تو ساری کائنات
ایک بھولی سی کہانی ہو گئی

کیوں تڑپنے لگے آوازِ اذاں سن کے جلیلؔ
کون سی بات تمھیں مردِ خدا یاد آئی

مجھے زمانہ بُرا کہہ رہا ہے، کہنے دو
غرض ہے تم سے، زمانے کی تم نے خوب کہی

آج آنسو تم نے پونچھے بھی تو کیا
یہ تو اپنا عمر بھر کا کام ہے

ہوئی مدّت کہ چمن چھوٹ گیا
اب ہمیں کیا جو بہار آئی ہے

میں کسی سرزمیں کا قصد کروں
آسماں ساتھ ساتھ چلتا ہے

زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے
یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے

زمانے پر ہنسے کوئی کہ روئے — جو ہونا ہے وہ ہوتا جا رہا ہے

شمع کو تم اُٹھا دو خلوت سے — یہ ہمیشہ کی جلنے والی ہے

یہ کون زیرِ زمیں اس کو گدگداتا ہے — کہ مسکراتی ہوئی ہر کلی نکلتی ہے

مزہ دیتا ہے جب بادل سُوئے مے خانہ آتا ہے — صراحی جھومتی ہے، وجد میں پیمانہ آتا ہے

کیفی، پنڈت برج موہن

پنڈت برجموہن دتاتریہ نام، کیفی تخلص ۔۱۳؍دسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگ کشمیر سے فرخ سیر کے عہد میں دہلی آئے اور سلطنت کے مرکزی دفاتر میں اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ حکیم بوریے والے کے مکتب میں کیفی کی بسم اللہ ہوئی اور پرانے طریق کے مطابق میاں جی سے فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ فارسی کی تکمیل ان کے نانا سے ہوئی جو اس زبان کے جید عالم تھے۔ انگریزی کی تعلیم سینٹ سٹفن کالج، دہلی میں ہوئی۔ کیفی اردو، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ مولانا حالی سے تلمذ حاصل تھا۔ ریاست کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ نوکری سے سبک دوش ہونے کے بعد انجمن ترقیٔ اردو ہند کے کاموں میں مولوی عبدالحق کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ لالا سری رام کے انتقال کے بعد ''خم خانۂ جاوید'' کی پانچویں جلد ترتیب دی۔ یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو سفر کرتے ہوئے غازی آباد نزد دہلی انتقال کر گئے۔ آپ کی بعض تصنیفات گورنمنٹ سے انعام اور پبلک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

منتخب اشعار

غم رہا اُن کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں — میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی سامان نہ ہوا

تُو دیکھ رہا ہے جو مرا حال ہے قاصد! — مجھ کو یہی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

صحبتیں اگلی جو یاد آتی ہیں جی کُڑھتا ہے — کوئی پوچھے بھی تو کہہ دیتے ہیں ہم یاد نہیں

ہاں ہاں، مگر اے دوست تُو تدبیر کیے جا — یہ بھی تری تقدیر کے دفتر میں لکھا ہے

اک خواب کا خیال ہے، دُنیا کہیں جسے — ہے اس میں اک طلسم، تمنّا کہیں جسے

نہیں معلوم اذاں تھی کہ وہ بانگِ ناقوس — کہیں کھینچے لیے جاتی ہے اک آواز مجھے

جس کو خبر نہیں اسے جوش وخروش ہے — جو پا گیا ہے راز وہ گم ہے خموش ہے

گستاخ رام پوری

کرامت اللہ خاں نام، گستاخ تخلص۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ رام پور کے ایک مشہور اور با اثر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی کی رسمی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا۔ ابتدا رام پور سے ہوئی، مگر بعد میں حکومت ہند کے محکمہ جیل میں جگہ مِل گئی۔ علی گڑھ، ایٹہ، اناو، سلطان پور وغیرہ مختلف اضلاع میں بڑی کامیابی سے جیلر کے فرائض انجام دیے۔ گستاخ کو مشغلہ شعر وسخن سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ امیر مینائی سے تلمذ حاصل تھا۔ یہ بہت خوش مزاج، فیاض اور عیش پسند واقع ہوئے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا۔

منتخب اشعار

صد سالہ دَورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور — نکلے جو مے کدے سے تو دنیا بدل گئی

ساقی اُدھر اٹھا تھا، اِدھر ہاتھ اُٹھ گئے — بوتل سے کاگ اُڑا تھا کہ رندوں میں چل گئی

چاہو، اب دیکھ لو خفا ہو کر — ہم بھی ہرگز نہیں منانے کے

میں نے کیا کیا نہ تری بات بنائی ظالم — کام کیا کیا نہ بگاڑے دلِ ناداں! تُو نے

ہائے اس بت کا شبِ وصل پہ ہنس کر کہنا — کرلیا آج تو گستاخ مسلماں تُو نے

نظر، منشی نوبت رائے

نام منشی نوبت رائے، نظر تخلص۔ ۱۸۶۴ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ایک معزز سکسینہ کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کر کے ہمہ تن شعر و شاعری میں منہمک ہو گئے۔ شاعری میں آغا مظہر لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۸۹۷ء میں اپنا ادبی رسالہ ''خدنگِ نظر'' لکھنؤ سے جاری کیا۔ ۱۹۰۴ء میں نظر رسالہ ''زمانہ'' کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں الہ آباد میں رسالہ ''ادیب'' کے ایڈیٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔ رسالہ ''ادیب'' کے ساتھ ان کا تعلق دو سال تک رہا۔ کان پور میں دوبارہ رسالہ ''زمانہ'' اسٹاف میں داخل ہو گئے۔ آخر میں لکھنؤ کے مشہور ''اودھ اخبار'' کے اڈیٹر کے فرائض انجام دیے۔ ان کی نواسی اور بیٹی کے انتقال کے بعد وہ بہت دل برداشتہ ہو گئے اور انھوں نے ''اودھ اخبار'' سے قطع تعلق کرلیا۔ ۱۰/اپریل ۱۹۲۳ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

منتخب اشعار

نہ ہوئی جلوہ گہِ ناز کی وسعت معلوم
گو میں ہر ذرّہ کو اک دیدۂ حیراں سمجھا

اِتنی ہی رہ گئی ہے اب کائنات دل کی
دیکھو گے جب تم آ کر، کچھ اضطراب ہوگا

بس ایک نظر اور کہ اب ختم ہے قِصّہ
پھر ہو گی نہ تم کو مرے مرنے کی خبر بھی

قفس سے چھٹ کے ہوا باغ باغ دل کیسا
بہار دے گیا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

یوں تو دل کو کبھی قرار نہ تھا
اب بہت بے قرار رہتا ہے

ہجر میں آنکھوں سے جاری ہے برابر سیلِ اشک
بند دو کوزوں میں دریا کی روانی ہو گئی

مَے کو دنیا آتشِ سیّال کہتی ہے نظرؔ
لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہو گئی

دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی
زندہ ہوں اب کہ مردہ، مجھ کو خبر نہیں ہے

پردہ اُٹھا دے اک دن تُو اے حجابِ ہستی!
پاتا ہوں اُس کو دل میں، دیکھا، مگر نہیں ہے

بیتاب عظیم آبادی

نام سیّد علی خاں، عرفیت لاڈلے صاحب، بیتاب تخلّص۔ وطن عظیم آباد۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ شاعری کا ذوقِ سلیم رکھتے تھے اور اچھے انشا پرداز تھے۔ مختار کے عہدے پر فائز رہے۔ ۳ر ستمبر ۱۹۲۸ء کو پٹنہ میں چائے پی رہے تھے کہ ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

منتخب اشعار

شکایت کیا تری اے باغباں! قسمت کی خوبی ہے
اُسی ڈالی کو کاٹا جس پہ میرا آشیانہ تھا

سحر ہے دُور ابھی شمع ساتھ دے کچھ اَور
کہ قصّۂ رُخ و گیسوئے یار باقی ہے

بیان کیفِ مئے عشق ہو نہیں سکتا
کہ دائرے ابھی محدود زبانوں کے

تڑپ کے رہ گئی بلبل قفس میں اے صیّاد!
یہ کیوں کہا کہ ابھی تک بہار باقی ہے

شمسؔ کلکتوی

نام ابوالقاسم محمد مظہر الحق، تخلص شمسؔ۔ ۱۸۶۷ء میں بانکا، ضلع بھاگلپور (بہار) میں پیدا ہوئے۔ نساخ کے فرزند تھے۔ بچپن کلکتے میں گزرا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے شباب کے زمانے میں دہلی گئے اور داغ، مجروح اور اشک کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ داغ کے شاگرد اور وحشت کلکتوی کے استاد تھے۔ ۳۸ سال کی عمر میں کلکتے میں ۱۹۰۵ء میں انتقال کر گئے۔ پُر گو اور زود گو بھی تھے۔ ان کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ جتنا فراہم ہو سکا، وحشت نے اس کی تدوین کی اور ۱۹۲۰ء میں چھپوا دیا۔

منتخب اشعار

ہائے دل اور بھی بے تاب ہوا جاتا ہے — ہاتھ یہ کس نے مرے سینے کے اوپر رکھا

اگر اللہ نے چاہا تو اُس کافر کو شمسؔ اک دن — مسلماں کر کے اُٹھیں گے، برہمن بن کے بیٹھے ہیں

میں جس کو پی رہا ہوں، وہ حاضر ہے دوستو! — تم جس کو کہہ رہے ہو، وہ کیسی شراب ہے؟

صبرؔ رام پوری

نام محمد اسماعیل خاں، حاجی، تخلص صبرؔ۔ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ امیر اللہ تسلیم سے تلمذ حاصل تھا۔ ۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

نظارہ کر رہا ہوں رُخِ بے نقاب کا — منظر نظر کے سامنے ہے آفتاب کا

اک پُرانا گھر بتوں کا ہے، مگر — کہتے ہیں کعبہ خدا کے ڈر سے ہم

شیداؔ، حکیم محمد اجمل خاں

حافظ حکیم محمد اجمل خاں نام، شیداؔ تخلص۔ مسیح الملک خطاب۔ ۱۲ فروری ۱۸۶۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ حدیث، منطق، فلسفہ، ادب اور طبیعات کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے خاندان میں عالمگیر کے وقت سے طبابت چلی آتی ہے۔ اجمل خاں ایک نامور طبیب اور بڑے سیاسی لیڈر تھے۔ طبیہ کالج، دہلی کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ جدوجہد آزادی کے سرگرم کارکن تھے۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو رام پور میں انتقال کر گئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق نواب رام پور نے انھیں زہر دے دیا تھا۔ یہ نواب رام پور کے شاہی معالج تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام ''دیوانِ شیدا'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔

منتخب اشعار

کیے ہیں عیب گو چھپ کر، مگر تم پر عیاں سب ہیں
الٰہی! کھل نہ جائے حشر میں سارا بھرم میرا

اب کہاں ہیں مے کدے میں شب کی بزم آرائیاں
اک سبو باقی رہا ہے، وہ بھی کچھ ٹوٹا ہوا

کھِلا جاتا ہے کیوں یہ غنچۂ دل
نسیمِ صبح آتی ہے کہاں سے

دُنیا بس اس سے اَور زیادہ نہیں ہے کچھ
کچھ روز ہیں گزارنے اور کچھ گزر گئے

رُخسار پر ہے رنگِ حیا کا فروغ آج
بوسے کا نام میں نے لیا، وہ نکھر گئے

ہمایوں، میاں محمد شاہ دین

نام میاں محمد شاہ دین، ہمایوں تخلص۔ ۱۲ر اپریل ۱۸۶۸ء کو باغبان پورہ، لاہور میں پیدا ہوئے۔ چھ برس کی عمر میں کلام مجید ختم کیا۔ مڈل کے امتحان میں اوّل رہے۔ بی اے کا امتحان لاہور میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۸۸۷ء میں مزید تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے اور بیرسٹر بن کر واپس آئے۔ پنجاب کی مجلس وضع قوانین کے رکن نامزد ہوئے اور پھر عدالت عالیہ میں جج مقرر ہوئے جہاں وہ چیف جسٹس کے عہدے تک پہنچے۔ وفات: ۲ر جولائی ۱۹۱۸ء لاہور۔

منتخب اشعار

اُٹھو، وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا

تنہا اُٹھا لوں میں بھی ذرا لطفِ گمرہی
اے رہنما! مجھے مری قسمت پہ چھوڑ دے

اثر، سیّد مخدوم عالم

نام سیّد مخدوم عالم پیرزادہ، اثر تخلص۔ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں قصبہ مارہرہ، ضلع ایٹہ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ عین عالمِ شباب میں انتقال ہوگیا۔

منتخب اشعار

واعظ کبھی مے خانے میں ہوگا نہ گزر کیا　　جو چاہے سو کہہ لے ہمیں اللہ کے گھر میں

مدتیں گزری ہیں شغلِ مے کشی چھوٹے ہوئے　　وہ بڑے ہیں طاق پر جام وسبو ٹوٹے ہوئے

تصویر دہلوی

نام میاں غلام احمد، تصویر تخلّص، عرف میاں بنّن۔ علمی استعداد کچھ نہ تھی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ محض اُمّی تھے۔ خدا بخش تنویر اور ذوق سے اصلاح لیتے تھے۔ غدر سے پہلے نیچہ بندی کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد شیودان سنگھ کے وقت میں ریاست الور چلے گئے۔ ۶۹-۱۸۶۸ء میں الور میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

عصمت کے معنی یہ ہیں جلی سر سے پا تلک　　لیکن نہ رکھا شمع نے باہر لگن کے پاؤں

کیا بُری چیز ہے محبت بھی　　بات کرنے میں آنکھ بھر آئی

ثاقب لکھنوی

نام میرزا ذاکر حسین قزلباش، تخلّص ثاقب۔ ۲رجنوری ۱۸۶۹ء کو اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ میرزا کی ولادت کو تقریباً چھ ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ ان کے والد نامساعد حالات کی بنا پر اکبرآباد چھوڑ کر مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔ میرزا کی ابتدائی تعلیم قدیم اسلوب پر ہوئی۔ انگریزی تعلیم کے لیے آگرہ بھیجے گئے جہاں تقریباً چار سال قیام رہا۔ وہیں میر مومن حسین صفی کی صحبت میں ان کی شاعرانہ اہلیت بروئے کار آئی۔ پہلے تجارت شروع کی، مگر ناکام رہے۔ ۱۹۰۸ء میں کلکتہ میں ایران کے سفیر کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء ہی میں ریاست محمودآباد میں میرمنشی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۲۴رنومبر ۱۹۴۶ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔

جناب ثاقب کا شمار نہایت متین و سنجیدہ کہنے والوں میں سے ہے۔ ان کے یہاں نہ عشق و محبت کا نامناسب جنون ہے نہ خودداری کی بے جا فرزانگی، وہ نہ عاشق کی حیثیت سے زیادہ کھُل کھیلنا پسند کرتے ہیں اور نہ غیر ضروری فلسفہ طرازی صرف کر کے اپنا آشیانہ بہت بلند دکھانا چاہتے ہیں۔　　(نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

دیارِ دل میں کہیں دوست کا پتا نہ ملا
وہ بدنصیب ہوں کعبے میں بھی خدا نہ ملا

یہ کس نے غم کدہ دُنیا کا نام رکھا ہے
ہمیں تو کوئی یہاں دردآشنا نہ ملا

گلچیں! بُرا کیا جو یہ تنکے جلا دیے
تھا آشیاں، مگر تیرے پھولوں سے دور تھا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی، مگر رہ نہ سکی
میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

مری داستانِ دل کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں
کچھ انھی کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا

اور کچھ باتیں کرواے ہم صفیرانِ چمن!
یہ نہ پوچھو کیوں قفس میں مجھ کو آرام آ گیا؟

ہنس کے بھی، رو کے بھی کہا، لیکن
مطلبِ دل کبھی ادا نہ ہوا

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی، مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

وجودِ بے ضرر ہوں باغباں! گلشن میں رہنے دے
کسی جا پڑ رہوں گا سایۂ برگِ شجر ہو کر

ہے روشنی قفس میں، مگر سوجھتا نہیں
ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

غنیمت ہے قفس، فکرِ رہائی کیا کریں ہمدم
نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں

صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں
کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں

طینتِ آدم میں تھی اللہ کیا نشو و نما
ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ دُنیا ہو گئی

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقبؔ
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کی صِلہ دینے لگے

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

چل اے ہمدم! ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اُٹھ آئیں گے محفل سے

دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے
ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

مکاں منعم کا سونے سے یہ خونِ دل سے بنتا ہے ۔۔۔ خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے

مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لیے ۔۔۔ بہت سی عمر مٹا کر جیسے بنایا تھا

مبارک عظیم آبادی

نام مبارک حسین، ڈاکٹر، مبارک تخلص تھا۔ ۲۹/اپریل ۱۸۶۹ء کو قصبہ تاج پور، سابق سب ڈویژن دربھنگہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔نسباً آپ بابا فرید شکر گنج کی اولاد سے ہیں۔ فارسی کی درسی کتابوں کے بعد عربی کی صرف ونحو پڑھی۔ انٹرنس تک انگریزی بھی پڑھی۔ طب اور ہومیوپیتھی کا بھی مطالعہ کیا اور باضابطہ مطب کو روزی کا ذریعہ بنایا۔ شعروسخن کی طرف اسکول ہی کے زمانے سے طبیعت راغب تھی۔ وہ پہلے حسن سہسرامی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اس کے بعد پریشان عظیم آبادی سے اردو اور فارسی میں اصلاح لیتے رہے۔ ۱۸۹۲ء میں حضرت داغ کے شاگرد ہوئے اور تاحیات استاد سے مشورہ کرتے رہے۔ آخر عمر میں مبارک عظیم آبادی مالی پریشانیوں میں بری طرح پھنس گئے تھے۔ ہندسرکار کی طرف سے ان کی علمی صلاحیت اور شاعری کی شہرت کی وجہ سے ایک سو روپیہ ماہانہ اعزازی وظیفہ تاحیات ملتا رہا۔ وہ ۱۲/اپریل ۱۹۵۸ء کو انتقال کر گئے۔ ان کا منتخب اردو دیوان ''جلوۂ داغ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے سے قبل ۱۹۳۵ء میں ''مرقعِ سخن'' (حصہ اوّل و دوم) کی اشاعت ہوئی۔ اگست ۱۹۹۹ء میں کلّیاتِ مبارک عظیم آبادی بھی چھپ گئی ہے۔

منتخب اشعار

خدا کے سامنے، اے محتسب! سچ بولنا ہوگا ۔۔۔ مرے ساغر میں مے دیکھی تھی یا خوناب دیکھا تھا

اب کون بات رہ گئی، یہ بات بھی گئی ۔۔۔ یعنی کبھی کبھی کی ملاقات بھی گئی

یہ غم کدہ ہے، اِس میں مبارک خوشی کہاں ۔۔۔ غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

جس کو رہنا ہو، رہے قیدیٔ زنداں بن کر ۔۔۔ ہم تو اے ہم نفسو! پھاند کے دیوار چلے

خدا جانے کہاں سے کھنچ کے مے خانے میں آتی ہے ۔۔۔ خبر اِتنی تو ہے، شیشے سے پیمانے میں آتی ہے

~~گھٹا اُٹھی ہے کالی، اور کالی ہوتی جاتی ہے ۔۔۔ صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے~~

آپ کا اختیار ہے سب پر ۔۔۔ آپ پر اختیار کس کا ہے

بغل میں ہم نے رات اک غیرتِ مہتاب دیکھا ہے
تمھیں تعبیر ہو اس خواب کی، کیا خواب دیکھا ہے

حریفِ موج و گرداب و تلاطم کم نظر آئے
بہت ساحل پہ دیکھے سیرِ ساحل دیکھنے والے

مرے دیدہ و دل کی چوری تو دیکھو
تمھیں لے چلے ہیں بھری انجمن سے

اکبر حیدری

نام محمد اکبر نذر علی، سر، تخلّص اکبر۔ ۸/نومبر ۱۸۶۹ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے۔ آزاد انصاری سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۹۳۷ء میں ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے۔ تقسیم ہند کے بعد آسام کے گورنر کے عہدے پر فائز رہے۔ وفات ۱۹۴۹ء۔

منتخب اشعار

صبح دم میرے تعاقب میں رہا جو اکثر
شام تک مجھ سے بھی آگے تھا وہ سایہ میرا

کس سے باتیں ہو رہی ہیں جوش میں
اے تصوّر! کون ہے آغوش میں

ابھی تو ناخدا کے بعد میرا اِک خدا بھی ہے
حوادث کیوں تڑپ کر رہ گئے آغوشِ طوفاں میں

بے کسی کی اگر زباں ہوتی
ہر جگہ میری داستاں ہوتی

کہنے والا جب سے کچھ کہتا نہیں
سننے والا گوش بر آواز ہے

اِک تبسّم ہے اُن کے ہونٹوں پر
یا مری گم شدہ جوانی ہے

سلیم، سیّد وحید الدّین

نام سیّد وحید الدّین، سلیم تخلّص۔ ولادت ۱۸۶۹ء۔ وطن پانی پت۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ عربی اور فارسی لاہور میں پڑھی۔ سلیم حالی کے گہرے دوست تھے۔ حالی کی وساطت سے سر سیّد احمد خاں نے اپنا ادبی مددگار مقرر کیا۔ سر سیّد کے انتقال کے بعد صحافت کو ذریعہ معاش بنایا۔ کچھ عرصے بعد دار الترجمہ، حیدرآباد (دکن) میں ملازم ہو گئے۔ بعد ازاں عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ شعر و سخن سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ اصنافِ ادب: شاعری، تنقید اور تحقیق۔ ۲۹/جولائی ۱۹۲۸ء کو ملیح آباد (یوپی) میں انتقال کر گئے۔ ''افکارِ سلیم'' کے نام سے ان کا کلام چھپ گیا ہے۔

منتخب اشعار

ڈوبا ہے اگر چاند تو سَو بار ہے اُبھرا
دل ڈوب گیا ہو تو اُبھرتے نہیں دیکھا

ستارے کہکشاں سے ٹوٹ کر کچھ ہو گئے غائب
فرشتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُن کو مہ جبینوں میں

ہر اک سفرِ نفس میں غافل! ہزاروں اسرار جلوہ گر ہیں
ورق ورق کھول کر نہ دیکھی یہ زندگی کی کتاب تُو نے

ظفر، مولانا ظفر علی خاں

نام مولانا ظفر علی خاں، ظفر تخلص۔ ۸رجنوری ۱۸۷۰ء کو کوٹ مہرتھ، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ مشہور روزنامہ اخبار ''زمیندار'' ان کی ادارت میں نکلتا تھا۔ خلافت اور کانگریس کی تحریکوں میں نمایاں حصّہ لیا۔ وہ جنگ آزادی کے ایک عظیم مجاہد تھے۔ پوری پبلک لائف میں تقریباً ۱۵ برس قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ متعدّد بار ''زمیندار'' کی ضمانت ضبط ہوئی، لیکن ان تمام مصائب و آلام کے باوجود ان کے پائے استقامت میں ذرّہ برابر فرق نہ ہوا۔ وہ جس حد تک سیاسی شخص تھے اُسی حد تک مذہبی بھی تھے۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں بڑی قدرت رکھتے تھے۔ ۲۷رنومبر ۱۹۵۶ء کو کرم آباد، ضلع وزیرآباد میں انتقال کر گئے۔ ''بہارستان''، ''نگارستان''، ''چمنستان'' اور ''گلشنِ بہار''، شعری مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں شاعر کے علاوہ ایک اعلا درجے کے نثر نگار، انشاپرداز اور صحافی تھے۔

ظفر علی خاں اگر سیاست میں نہ آتے تو دوسرے اقبال ہوتے۔ (پروفیسر آلِ احمد سرور)

منتخب اشعار

جو فلسفیوں سے کُھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں، یہ نور نہ ہو سیّاروں میں

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنّا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو

پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اُس نورِ اوّلیں کا اُجالا تمھیں تو ہو

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاج دارِ یثرب و بطحا! تمھیں تو ہو

اے کربلا کی خاک اِس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ بتول

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

نہ ہوتی گر خودی ہم میں تو جو تُو تھا وہی ہم تھے
یہ پردہ کس لیے ڈالا ہے یارب! درمیاں تُو نے

جھوم کر اُٹھی گھٹا، برسی، برس کر چھٹ گئی
گرد کی چادر زمیں کے مُنہ سے فوراً ہٹ گئی

فخر، مرزا فخر الدّین

نام مرزا فخر الدّین، فخر تخلّص، عرف مرزا چپاتی۔ ایک امّی شاعر جن کا تعلّق دہلی کے شاہی خاندان سے تھا۔ جب تک مرزا چپاتی کے ہاتھ میں روپیہ تھا، خوب الللّے تللّے سے خرچ کیا۔ دہلی والے جب در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے، انھوں نے لنگر جاری کیا ہوا تھا جس میں عام طور سے حلوہ چپاتی تقسیم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے عوام میں مرزا چپاتی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ کبوتر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی اور ستار نوازی میں مشتاق تھے۔ مرزا چپاتی کے آخری ایام بہت تنگ دستی میں گزرے۔ پتنگ بنا کر پیٹ پالا کرتے تھے۔ اکثر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کبوتر بیچتے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۰ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

منتخب اشعار

بنائی شوق میں شدّاد نے، پر یہ نہ سمجھا تھا
نہ میں جنت کے قابل ہوں، نہ جنت میرے قابل ہے

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

یا پنجتن! بچانا جب جان تن سے نکلے
نکلے تو یا محمدؐ کلمہ دہن سے نکلے

میں سر جھکا کے سُوئے جہنم چلا ہی تھا
کچھ رحم آ گیا مرے پروردگار کو

صرّاف کسوٹی پہ گھسا کرتے ہیں زر کو
ہم وہ ہیں جو آنکھوں سے پرکھتے ہیں بشر کو

شاعر قزلباش، آغا مظفّر بیگ

نام آغا مظفر بیگ قزلباش، شاعر تخلّص۔ ''افسر الشعرا'' خطاب۔ ۵ مارچ ۱۸۷۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ سوتیلی ماں کے ظلم سے تنگ آ کر بارہ برس کی عمر میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ آغا صاحب نے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی۔ اپنے وجدان کو رہبر بنایا۔ پہلے احمد سعید خاں طالب سے مشورہ سخن کیا۔ پچیّس تیس سال کی عمر میں حیدر آباد (دکن) جا کر داغ کی شاگردی اختیار کی۔ دکن میں آغا صاحب مہاراجا کشن پرشاد کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے، مگر دلّی کی یاد نے دل میں چٹکی لی اور واپس وطن آ گئے۔ آغا صاحب اپنی آشفتہ مزاجی سے مجبور تھے۔ ساری عمر کہیں بھی ٹک کر نہیں رہے۔ اخبار میں کام کیا۔ کلکتہ میں تھیٹر کے لیے ڈرامے لکھے۔ رباعیات عمر خیام کے منظوم ترجے

کیے۔ان کا ایک اور کارنامہ منظوم ترجمہ کلام مجید ہے۔تین پارے شائع ہوئے، باقی غیر مطبوعہ ہیں۔آواز بڑی پاٹ دار پائی تھی۔شعر پڑھتے تو ساری محفل پر چھا جاتے تھے۔ان کی زندگی میں ایک ایسا وقت آیا کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئے تھے۔۱۲؍مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔مخزن پریس، لاہور سے ان کا دیوان ''تیر ونشتر'' کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔''خُم کدہ خیام'' (عمر خیام کے منتخب رباعیات کے منظوم ترجمے) بھی ان کی تصنیف ہے۔

منتخب اشعار

مسافرانِ عدم کس طرف کو جاتے ہیں
کسی کا گور سے آگے پتا نہیں ملتا

حشر میں انصاف ہوگا، بس یہی سنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہا ہے، کچھ وہاں ہو جائے گا

بڑے سیدھے سادھے، بڑے بھولے بھالے
کوئی دیکھے اس وقت چہرا تمھارا

اُٹھانے پڑے خاک سے دل کے ٹکڑے
بڑا پیار تھا، پیار دیکھا تمھارا

~~وقت تو دو ہی کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں~~
~~اِک ترے آنے سے پہلے، اِک ترے جانے کے بعد~~

دو اجازت تو کلیجے سے لگا لوں رخسار
سینک لوں چوٹ جگر کی اِنھیں انگاروں پر

ملنا نہ ملنا، یہ تو مقدّر کی بات ہے
تم خوش رہو، رہو مرے پیارے جہاں کہیں

روٹھی قسمت کو بارہا جانچا
یہ کبھی راہ پر نہیں آتی

محبت بھی کیا چیز ہے، دیکھنا
اِدھر بات کی، چشمِ تر ہو گئی

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی ہے میرے ماتم کی

کبھی ساون کی جھڑی ہو، کبھی بھادوں برسے
ایسا برسے مرے اللّٰہ کہ چھاجوں برسے

ابرو نہ سنوارا کرو، کٹ جائے گی انگلی
نادان ہو، تلوار سے کھیلا نہیں کرتے

کہاں نصیب یہ شاعؔر وہ دردِ دل پوچھیں
میں مسکرا کے کہوں، 'ہاں حضور! ہوتا ہے'

بے خودی میں تو بڑے چین سے گزری شاعؔر
ہوش جاتے رہے آیا جو ذرا ہوش مجھے

بزمِ دشمن سے اب آئے ہو مزہ لوٹے ہوئے
ہوش میں آؤ، کہیں جُڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے

آزاد انصاری

الطاف احمد انصاری نام، نظیر حسین تاریخی نام، ابوالاحسان کنیت، آزاد تخلّص۔ ولادت ۱۲؍اکتوبر ۱۸۷۱ء ناگپور جہاں ان کے والد اور سیری کے عہدے پر فائز تھے۔ وطن سہارن پور۔ اٹھارہ، انیس سال کی عمر تک مختلف

درس گاہوں میں فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی۔ طب مختلف اساتذہ فن سے پڑھی۔ دہرہ دون، کان پور، انبالہ چھاؤنی اور علی گڑھ میں علاج معالجہ کا کام کرتے رہے۔ جب ان کا کاروبار، مطب نہ چلا تو وہ دہلی چلے گئے اور اواخر ۱۹۲۳ء تک دہلی میں بسر اوقات کرتے رہے۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو حیدر آباد (دکن) پہنچ گئے اور کاروبارِ مطب چھوڑ کر عینک کی تجارت اختیار کر لی۔ انھیں مولانا حالی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۹۴۲ء میں حیدر آباد (دکن) میں انتقال کر گئے۔ ان کا دیوان ''معارفِ جمیل'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ تکرارِ الفاظ سے شعر میں حسن پیدا کرنا ان کا خاص فن ہے۔

منتخب اشعار

اک وہ ہیں کہ بے خوف و خطر گرمِ شکایات
اک ہم ہیں کہ اظہارِ تمنّا نہیں ہوتا

تم اور دل آزاریٔ اربابِ محبت
اربابِ محبت کا یہ شیوا نہیں ہوتا

یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی
یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گماں نہ تھا

اُمیدِ سکوں رخصت، تسکینِ دروں رخصت
اب درد کی باری ہے، اب درد مزا دے گا

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اہل اللّٰہ کی پہچان پیدا کر

زُلفوں والے یہ اندھیر
دُہرے دُہرے کالے ناگ

اگر حد سے گزریں تو بے شک حرام
جو تھوڑی سی پی لی تو کیا ہو گیا

اِس گدائے راہ کو ناحق نہ چھیڑ
جا، فقیروں سے مذاق اچھا نہیں

آؤ، پھر عہدِ وصالِ یار کی باتیں کریں
داستانِ لطف چھیڑیں، پیار کی باتیں کریں

کسے فرصت کہ فرضِ خدمتِ اُلفت بجا لائے
نہ تم بے کار بیٹھے ہو، نہ ہم بے کار بیٹھے ہیں

کبھی دن رات رنگیں صحبتیں تھیں
اب آنکھیں ہیں، لہو ہے اور میں ہوں

اب حالِ دل نہ پوچھو کہ تاب بیاں کہاں
اب مہرباں نہ ہو کہ ضرورت نہیں رہی

اک پائمالِ جَور سے اُمیدِ شکرِ جَور
جا شکر کر کہ تابِ شکایت نہیں رہی

دل اور ترے خیال سے راحت نہ پا سکے
شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی

بے خبر! کارِ خبر مشکل نہیں
بے خبر ہو جا، خبر ہو جائے گی

تمھیں آزاد! ہم اک باخبر سالک سمجھتے تھے
مگر یا پیر و مرشد تم ہمارے بھی چچا نکلے

افسوس! بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

جو وہ ملتا نہیں ہے آپ کھو جا　　　　کہ اک یہ بھی طریقِ جستجو ہے

رسا، منشی حیات بخش

منشی حیات بخش نام، رسا تخلّص۔ تقریباً ۱۸۷۲ء میں کا سنہ، ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر سرکاری ملازمت کر لی۔ ۱۸۸۵ء میں تحصیل مصطفیٰ آباد، مین پوری میں تعینات تھے۔ اور ۱۹۸۹ء میں شکوہ آباد میں محرّر جوڈیشیل کے عہدے پر فائز تھے۔

داغؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۹۰۸ء میں رام پور میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ مضطر خیر آبادی ان کو اس مشاعرے میں لے گئے۔ ان کی غزل بہت کامیاب رہی۔ مضطر کی سفارش سے نواب رام پور نے ان کو ۶۰ر روپیہ پر ملازم رکھ لیا اور عدالت ہائے ریاست میں وکالت کی اجازت بھی دے دی۔ ان کا دیوان نہ چھپ سکا۔ مولانا حسرت موہانی نے مختلف جرائد سے ان کا کلام جمع کر کے ایک مختصر مجموعہ غزلیات مرتب کیا ہے۔ رساؔ ۲۲ر نومبر ۱۹۱۳ء کو رام پور میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

جب سے گم ہو گیا ہے دل اپنا　　　　چیز رکھتا ہوں بھول جاتا ہوں

نہ دَیر میں ہمیں راحت نہ چین کعبے میں　　　　ٹھہرنے دے گا نہ اس دل کا اضطراب کہیں

فکرِ وفا پہ آپ کو شرمِ جفا ہے کیوں　　　　اک بات تھی کہ میری زباں سے نکل گئی

میں سوالِ وصل کر کے اس ادا پر مٹ گیا　　　　ہنس کے فرمایا کہ یہ درخواست نامنظور ہے

تم عرضِ مدّعا پر میری زباں نہ کھینچو　　　　ہاتھوں میں چبھ نہ جائیں کانٹے زبان پر ہیں

شفق عمادپوری

نام سیّد حسن مرتضیٰ، تاریخی نام مظہر سعید، تخلّص شفق۔ ۱۸۷۲ء میں عماد پور، ضلع گیا (بہار) میں پیدا ہوئے، لیکن الہ آباد کو وطن ثانی بنا لیا تھا۔ عربی و فارسی کی درسیات عماد پور میں پڑھیں۔ آغاز مشق سخن میں حکیم محمد عابد علی کوثر خیر آبادی سے مشورہ کیا۔ انھی سے علم طب کی کتابیں بھی پڑھیں۔ بعد ازاں کئی برس امیر مینائی سے شرف تلمذ رہا۔ فن تاریخ گوئی، نعت، اردو غزلیات (دو دیوان)، قصائد کے مجموعے، رباعیات کے مجموعے کے مصنّف ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں وفات پا گئے۔

منتخب اشعار

چمکے گی برقِ طور جمالِ حبیب سے	کہہ دو کلیم ہٹ کے کھڑے ہوں قریب سے
کیا ٹھکانا مجھ سے رندِ لاأبالی کا شفقؔ	آج کعبے میں ہوں کل تک ساکنِ بت خانہ تھا
کس کے آگے درد دل اپنا کہو گے اے شفقؔ!	کوئی دُنیا میں نہیں اب قدر دانِ اہلِ دل
ہوتے ہوتے بس کم اتنی رسمِ الفت رہ گئی	ان سے ہم سے دور کی صاحب سلامت رہ گئی
اُڑا کے نکہتِ گیسوے عنبریں لائی	تری گلی سے صبا مشک ناب ہو کے پھری
شفقؔ بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا	کہ دل تھام کر تم ٹہلنے لگے

آرزو لکھنوی

سیّد انور حسین نام، عرف منجھو صاحب، تخلّص آرزو۔ ۱۶؍فروری ۱۸۷۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میر ذاکر حسین، یاس تخلّص کرتے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی یوسف حسین، قیاس تخلّص کرتے تھے۔ جناب آرزو کو بہت کم سنی سے شعر و سخن کا شوق تھا۔ جب ان کے والد کو ان کے شوق کا حال معلوم ہوا تو جلال لکھنوی کے پاس لے گئے اور ان کا شاگرد کرادیا۔ آرزو نے مالی مشکلات کی وجہ سے کلکتہ میں فلم کمپنیوں کے لیے ڈرامے اور گیت لکھے۔ بمبئی میں بھی فلموں کے لیے گیت لکھے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آ گئے اور یہیں ۱۶؍اپریل ۱۹۵۱ء کو انتقال ہوا۔ آپ کے تین شعری مجموعے ''فغانِ آرزو''، ''جانِ آرزو'' اور ''سریلی بانسری'' شائع ہو چکے ہیں۔ آرزو جلال لکھنوی کے جانشین تھے۔ ان کی شاعری صحتِ زباں کے لحاظ سے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ''سریلی بانسری'' میں خالص ہندوستانی زبان میں شاعری کی ہے۔

منتخب اشعار

دو تند ہواؤں پر بنیاد ہے طوفاں کی	یا تم نہ حسیں ہوتے یا میں نہ جواں ہوتا
خموشی میری معنی خیز تھی اے آرزوؔ! کتنی	کہ جس نے جیسا چاہا، ویسا افسانہ بنا ڈالا
بدلی کی چھاؤں تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی	جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا
پلک جھپکی کہ منظر ختم تھا برقِ تجلّی کا	ذرا سی نعمتِ دیدار اس کا بھی یوں رائگاں ہونا
دفعتاً ترکِ تعلّق میں بھی رسوائی ہے	اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر
آرام کے تھے ساتھی کیا کیا، جب وقت پڑا، تھا کوئی نہیں	سب دوست ہیں اپنے مطلب کے، دنیا میں کسی کا کوئی نہیں

قتالِ جہاں معشوق جو تھے، سُونے ہیں پڑے مرقد اُن کے — یا مرنے والے لاکھوں تھے، یا رونے والا کوئی نہیں

آرزو جلتے ہوئے دل کے شرارے ہیں یہ اشک — آگ پانی کے کٹوروں میں لیے بیٹھا ہوں

ملکِ عدم کے جانے والو! وقت سفر کا ایک نہیں — تم ابھی ٹھہرو، ہم کو ہے جانا، بیچ سے سرکو، رستا دو

بھولے بن کر حال نہ پوچھو، بہتے ہیں اشک تو بہنے دو — جس سے بڑھے بے چینی دل کی، ایسی تسلّی رہنے دو

کل آرزو اک در پر سر پھوڑ کے روتا تھا — میں نے جو کہا یہ کہا، ہنسنے لگا دیوانہ

رہنے دو تسلّی تم اپنی، دکھ جھیل چکے، دل ٹوٹ گیا — اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا، جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

چاہت کا پھل ایسا ہے جیسے جل جائے کھیتی بوئی ہوئی — کیا ہوتا ہے آنسو پونچھنے سے، چھپتی نہیں آنکھیں روئی ہوئی

اول شب وہ بزم کی رونق، شمع بھی تھی پروانہ بھی — رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا، موسم کی بے کیفی پر — اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا مے خانہ بھی

کہہ کے یہ اور کچھ کہا نہ گیا — کہ ہمیں آپ سے شکایت ہے

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی — جھوم کر آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

تارا ٹوٹتے سب نے دیکھا، یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی — کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا، کس کا سہارا ٹوٹا ہے

نشستِ عارضی سے ہے سرائے دہر کی رونق — یہ ہے اک کارواں جس پر بھری محفل کا دھوکا ہے

پوچھی تھی چھیڑ کر جو آپ، کہنے نہ دی وہ بات بھی — تم نے کھٹکتی پھانس کو چھوڑ دیا اُبھار کے

جاتے کہاں ہو دل سے نگاہوں کو موڑ کے — تصویر نکلی پڑتی ہے آئنہ توڑ کے

اُس نے لبھا کے آرزو پھیری ہے مجھ سے آنکھ یوں — جیسے کوئی چھڑک کے تیل آگ لگا کے چھوڑ دے

جوشِ جنوں میں وہ ترے وحشی کا چیخنا — بند اپنے ہاتھ سے درِ زنداں کیے ہوئے

معصوم نظر کا بھولا پن للچا کے لبھانا کیا جانے — دل آپ نشانہ بنتا ہے، وہ تیر لگانا کیا جانے

سرور جہاں آبادی

نام منشی درگا سہائے، تخلص سرور۔ ۱۸۷۳ء میں قصبہ جہاں آباد، ضلع پیلی بھیت (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ کرامت حسین بہار اور بیان ویزدانی سے تلمذ حاصل تھا۔ انھیں اردو شاعری کے طرز جدید کا ایک رکن سمجھا جاتا ہے۔ بیوی اور اکلوتے بیٹے کے انتقال کے بعد غم غلط کرنے کے لیے مے نوشی اختیار کی۔ کثرتِ استعمال سے کم عمری میں ۳ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

اُٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابرِ بہار	چٹک رہے ہیں شگوفے، برس رہی ہے پھوار
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی، یہ ہوا کے سرد جھونکے	تجھے دے رہے ہیں لوری، مرے غم گسار! سو جا

بیباک شاہجہاں پوری

نام میاں سیّد احمد حسین، تخلّص بیباک۔ ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ یہ ساداتِ شاہجہاں پور سے تھے۔ پہلے خیال شاہجہاں پوری سے اصلاح لی، بعد میں داغ کی شاگردی اختیار کی۔ اُستاد کے بہت بڑے ارادت مند تھے۔ ۱۹۳۶ء میں شاہجہاں پور میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

ناتواں قیس، نازنیں لیلیٰ	کون پردہ اُٹھائے محمل کا
وفائے عہد دمِ نزع! اے جزاک اللّٰہ	اب آپ جائیے، آ جائے گا قرار مجھے
یہ بھی خدا کی شان کہ اک حرفِ آرزو	اُس بے وفا کے واسطے افسانہ ہو گیا

لطف بدایونی

نام منشی اکرام احمد صدیقی حمیدی، تخلّص لطف۔ ۱۸۷۵ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ظفریاب خاں راسخ سے تلمذ حاصل تھا۔ ۲۱ر اگست ۱۹۴۳ء کو بدایوں میں انتقال کر گئے۔ ان کا مشہور نعتیہ شعر پیشِ خدمت ہے:

رُخِ مصطفٰے ہے وہ آئینہ، کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں، نہ دکانِ آئینہ ساز میں

حسرت موہانی

سیّد فضل الحسن نام، حسرت تخلّص۔ ۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان، ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے۔[1] ۱۸۹۴ء

---

(۱) ''نگار''، لکھنؤ، جنوری فروری ۱۹۴۱ء، ''خود نوشت نمبر'' ص ۱۰۷۔

حسرتؔ موہانی کے پاسپورٹ میں تاریخ پیدائش ۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۸ء درج ہے۔

بحوالہ: ''مالک رام کا بے حد مفید و بے حد غلط تذکرہ ماہ و سال''، ڈاکٹر گیان چند، مشمولہ سہ ماہی ''اردو''، ۳۳، شمارہ (۴)، ۱۹۹۲ء، ص ۴۷

میں آپ نے اُردو مڈل کا امتحان موہان سے پاس کیا اور پورے صوبے میں اوّل آئے۔ ۱۸۹۹ء میں انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور وظیفہ لے کر اعلا تعلیم کے لیے علی گڑھ پہنچے۔ ۱۹۰۳ء میں حسرت نے علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے علی گڑھ سے ''اردوے معلیٰ'' جاری کیا۔ وہ ترک وطن کر کے پہلے علی گڑھ میں رہے پھر کان پور میں مستقل طور پر رہنے لگے۔ رسالہ ''اردوے معلیٰ'' بھی کان پور سے نکالتے رہے۔ تسلیم لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ آزادیٔ وطن کی خاطر متعدّد بار جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ شاعر کے علاوہ ایک اچھے نقاد اور سیاست دان تھے۔ حسرت ''رئیس المتغزلین'' کہلاتے تھے۔ وہ اپنے گھر کا کام خود کرتے تھے۔ ان کی زندگی بہت سادہ اور فقیرانہ تھی۔ ریل میں ہمیشہ وہ تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ اُنھوں نے کئی بار حج کی سعادت حاصل کی۔ ۱۳رمئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''کلّیاتِ حسرت،'' ''شرحِ دیوانِ غالب،'' ''مشاہداتِ زنداں۔'' اس کے علاوہ حسرت نے اساتذہ قدیم وجدید کے کلام کا انتخاب متعدّد جلدوں میں کیا ہے۔

> حسرت کا کلام اپنی سادگی و پُرکاری کے لحاظ سے اتنی حسین ودل کش چیز ہے کہ بجائے سننے کے اُسے کلیجے سے رکھ لینے کو جی چاہتا ہے۔ (نیاز فتح پوری)
>
> حسرت کا غزل پر بڑا احسان ہے اور میرے نزدیک جس کا غزل پر احسان ہے، اس کا پوری اردو زبان پر احسان ہے۔ حسرت نے غزل کی آبرو اس زمانے میں رکھ لی جب غزل بہت بدنام ہر طرف سے نرغے میں تھی۔ انھوں نے اردو میں غزل کی اہمیت اور عظمت ایک نامعلوم مدت تک منوالی۔ حسرت خالص غزل گو تھے۔ اس سے پہلے بڑے بڑے جید غزل گو گزرے تھے۔ معاصر غزل گو بھی اپنا اپنا مقام رکھتے تھے۔ پھر بھی حسرت کی غزل گوئی ممتاز و منفرد ہے، اس لیے کہ حسرت غزل کا سہارا غزل ہی سے لیتے ہیں کسی اور سے نہیں۔ غزل گوئی کرلے غزل کا معیار حسرت ہی رہیں گے۔ (رشید احمد صدیقی)

منتخب اشعار

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا ۔۔۔ طرفہ عالم ہے ترے حُسن کی بیداری کا

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت ۔۔۔ گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

حُسنِ بے پروا کو خود بین وخود آرا کر دیا ۔۔۔ کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

اب نہیں دل کو کسی صورت، کسی پہلو قرار ۔۔۔ اُس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا — ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر — ہم سے اظہارِ مدّعا نہ ہوا
کبھی کی تھی جو اَب وفا کیجیے گا — مجھے پوچھ کر آپ کیا کیجیے گا
بار بار آتا ہے یہ کس کا خیال — بے خودی! بتلا مجھے کیا ہو گیا
رونقِ پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ نازنیں — اَور بھی شوخ ہوگیا رنگ ترے لباس کا
بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے — ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
اب نہ وہ تم رہے نہ ہم، افسوس — ''کیا زمانے کا انقلاب ہوا''
دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا — شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رسوا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرتؔ — ان سے مِل کر بھی نہ اظہارِ تمنا کرنا
ہم کیا کریں اگر نہ تری آرزو کریں — دُنیا میں اَور بھی کوئی، تیرے سوا ہے کیا؟
جان کو صبر ہے نہ دل کو تاب — تُو نہیں ہے تو زندگی ہے خراب
بہار آئی سب شاد ماں ہیں، مگر ہم — یہ دن کیسے کاٹیں گے بے جام و مینا
مٹے عیب سب عشق بازی میں حسرتؔ — نہ بغض و حسد ہے، نہ غصہ، نہ کینا
اک برق تپاں ہے کہ تکلّم ہے تمھارا — اک سحر ہے لرزاں کہ تبسّم ہے تمھارا
دل نہ توڑو حسرتِؔ ناکام کا — زلف تو پھر بھی بنالی جائے گی
عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے — مہر ذرّوں کو کیا، قطروں کو دریا کر دیا
سیہ کار تھے، باصفا ہو گئے ہم — ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
جب اُن سے ادب نے نہ کچھ مُنہ سے مانگا — تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم
دمِ واپسیں آئے پُرسش کو ناحق — بس اب جاؤ، تم سے خفا ہو گئے ہم
اک بار سنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود — اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک
تھی کبھی یاد اُن کی وجہِ سکوں — اب کسی حال میں قرار نہیں
کچھ محوِ تصوّر تھا میں اِس درجے کہ حسرتؔ — مجھ کو نہ ہوئی یار کے آنے کی خبر تک
روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

اللہ ری جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرتؔ
آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

بلاکشانِ غمِ انتظار ہم بھی ہیں
خرابِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وصل کی بنتی ہیں اِن باتوں سے تدبیریں کہیں؟
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں؟

چھیڑتی ہے مجھے بے باکیٔ خواہش کیا کیا
جب کبھی ہاتھ وہ پابندِ حنا ہوتے ہیں

اب جو بگڑے تو خوشامد نہ کریں گے ہم بھی
کہ منانے سے وہ کچھ اَور خفا ہوتے ہیں

شعر میرے بھی ہیں پُر درد، ولیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

شب وہی شب ہے، دن وہی دن ہیں
جو تری یاد میں گزر جائیں

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

مائلِ شوق مجھے پا کے وہ بولے ہنس کر
دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو!

تھے پاس تو منظورِ نظر، راحتِ دل تھے
اب جانِ تمنّا ہو جو تم ہم سے جدا ہو

آج تک جس سے معطّر ہے محبت کا مشام
آہ کیا چیز تھی وہ پیرہنِ یار کی بُو

غمِ آرزو کا حسرتؔ سبب اَور کیا بتاؤں
مری ہمّتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

محتاجِ بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوبِ یار
خوشبوئے دلبری تھی جو اُس پیرہن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

ہر وضع دل فریب ہے ہر رنگ دل پذیر
کیا بات ہے کسی کے تنِ جامہ زیب کی

تمنّا نے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گی حُسن کی بے شعوری

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا دے گی
اے حُسنِ حیا پرور! شوخی بھی، شرارت بھی

بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی، مگر حسرتؔ
جو پھر بھی دلنوازی پر وہ چشمِ سحر کار آئی

ہم رضا شیوہ ہیں، تاویلِ ستم خود کرلیں
کیا ہوا، اُن سے اگر بات بنائی نہ گئی

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار
ساقی! یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

نسیمِ کُوے جاناں ہے کہ حسرت ہوا آتی ہے فردوسِ بریں سے

چھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

دلوں کو فکرِ دوعالم سے کر دیا آزاد ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

عہدِ یک عمر فراغت سے بھی خوشتر گزرا وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

لوگ سب جان گئے، چھپ نہ سکی شوق کی بات میں گلی سے جو تری ہو کے مکرّر گزرا

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جایئے بندہ پرور! جایئے، اچھا خفا ہو جایئے

جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے؟

دلِ بے تاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت نگہِ شوق نے، کیا جانیے، کیا دیکھا ہے؟

لایا ہے دل پر کتنی خرابی اے یار! تیرا حُسنِ شرابی

پیراہن اُس کا ہے سادہ رنگیں یا عکسِ مَے سے شیشہ گلابی

حُسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

مجھے گرم نظارہ دیکھا تو ہنس کر وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اُس طبعِ نازک پر نگاہِ شوق اِس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً اور دُپٹے سے ترا وہ مُنہ چھپانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر، سب کی مرضی کے خلاف وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

تجھ سے ملتے ہی وہ کچھ بے باک ہو جانا مرا اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

بے خودی سے بڑھ کے آگے ہے فنا کا مرتبہ رہروِ راہِ محبت آخری منزل میں ہے

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے اُنھیں کہتے بنا نہ کچھ، وہ قسم کھا کے رہ گئے

دعوائے عاشقی ہے تو حسرتؔ کرو نباہ
یہ کیا کہ ابتدا ہی میں گھبرا کے رہ گئے

ہزار عشق تری چشمِ نیم وا پر نثار
نہ ڈال مجھ پہ یہ افسونِ خواب، رہنے دے

ہم نے تو نثار کر دیا دل
اب جانے وہ شوخ، یا نہ جانے

اب کاہے کو آئیں گے وہ حسرتؔ
آغازِ جنوں کے پھر زمانے

چھپ کے اُس نے جو خودنمائی کی
انتہا تھی یہ دل ربائی کی

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں، مگر منزلِ جاناں کے قریب

معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدّعا
اب تم سے دل کی بات کہیں کیا زباں سے ہم

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

مجھ سے وہ کھلیں کیا کہ نظر اُٹھ نہیں سکتی
محجوب ہیں پیمائشِ داماں میں لگے ہیں

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرتؔ! اُٹھو، سلام کرو

کیا کام اُنھیں پرسشِ اربابِ وفا سے
مرتا ہے تو مرجائے کوئی، اُن کی بلا سے

بغیر ان کے دم بھر نہیں چین دل کو
کبھی اُن سے گویا جدائی نہ ہوگی

وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے
غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا

نہ بھولے گا وہ وقتِ رخصت کسی کا
مجھے مڑ کے پھر اک نظر دیکھ لینا

وہ شرمائی صورت، وہ نیچی نگاہیں
وہ بھولے سے ان کا اِدھر دیکھ لینا

دل شاہ جہاں پوری

نام ضمیر حسن خاں، حکیم، تخلّص دل، 'اعتبار الملک' خطاب۔ ۱۸۷۵ء میں شاہ جہاں پور میں پیدا ہوئے۔ فارسی کتبِ درسیہ کی تکمیل کے بعد عربی تعلیم کا آغاز ہوا۔ صرف ونحو کی تعلیم کے بعد معقول کی کئی کتابیں پڑھیں۔ فقہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ علم طب کی تعلیم بھی حاصل کی جو ان کا خاندانی مشغلہ تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ امیر مینائی سے پہلے بذریعہ خط و کتابت تلمذ قائم ہوا۔ بعدازاں رام پور جا کر شرف نیاز بھی حاصل کیا۔ وہ اپنے استاد امیر مینائی کے بہترین تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو شاہ جہاں پور میں انتقال کر گئے۔ ''نغمۂ دل'' اور ''ترانۂ دل'' دو شعری مجموعے ان کی یادگار ہیں۔

وہ جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ اپنے استاد کے بہترین تلامذہ میں سے ہیں۔

(نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

اثرِ عشق سے ہوں صورتِ شمع خاموش
یہ مرقّع ہے مری حسرتِ گویائی کا

یہ گویا واقعاتِ بزمِ ہستی کا خلاصہ ہے
ترا یوں دفعتاً خاموش اے شمعِ سحر! ہونا

اُدھر گھبرا کے غم خواروں کی مایوسانہ سرگوشی
اِدھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بے خبر ہونا

خاک ہو جانا نمودِ عشق ہے اے اہلِ دل!
جل گیا پروانہ، لیکن رنگِ محفل بن گیا

وقتِ رخصت تسلّیاں دے کر
اَور بھی تم نے بے قرار کیا

یہ بھیگی رات، یہ ٹھنڈا سماں، یہ کیفِ بہار
یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کا

گوشِ دل کے لیے کچھ طور کی مخصوص نہیں
ہر جگہ ہم تری آواز سُنا کرتے ہیں

حق تو یہ ہے کہ خطا تم سے ہوئی اے منصور!
تھیں چھپانے کی جو باتیں وہ بہ آواز کہیں

محوِ جمال بے خود و مخمور ہو گئے
یعنی قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

مایوسِ ازل ہوں یہ مانا، ناکامِ تمنّا رہنا ہے
جاتے ہو کہاں رُخ پھیر کے تم، مجھ کو تو ابھی کچھ کہنا ہے

قدرت کی چمن آرائی کا گو ایک اثر ہے دونوں پر
غنچے ہیں کہ ہنستے رہتے ہیں، شبنم ہے کہ روتی رہتی ہے

بھلا سا نام ہے اُس کا، اُسے کیا کہتے ہیں زاہد!
صراحی سے جو ڈھلتی ہے، جو مئے خانوں میں ہوتی ہے

فرّخ بنارسی

نام واجد علی، تخلّص فرّخ۔ ۱۸۷۵ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ فائز بنارسی سے تلمذ حاصل تھا۔ محکمہ پولیس سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۵ء میں وفات پا گئے۔

منتخب اشعار

رہے قفس میں تو صیّاد کے ستم دیکھے
چمن میں آئے تو اب آشیاں نہیں ملتا

سراب وہم بہارِ نمودِ ہستی ہے
یہ سب فریبِ نظر ہے جو دیکھتا ہوں میں

بڑھی ہے کیفِ محبت سے بے خودی ایسی
کہ اپنا حال اب اک اک سے پوچھتا ہوں میں

احسن مارہروی

سیّد علی احسن نام، احسن تخلص، ''شاہ میاں'' عرف۔ ۹ نومبر ۱۸۷۶ء کو مارہرہ، ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں داغ کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ میں اردو کے لکچرر کے عہدے پر تقرر ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وفات ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء، پٹنہ، جہاں ان کے بیٹے انعام احسن حریف بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ تدفین مارہرہ۔ ''جلوۂ داغ'' یعنی حیاتِ داغ ''انشائے داغ'' یعنی مکتوباتِ داغ، ''تاریخ نثر اردو،'' ''یادگارِ داغ'' یعنی داغ کا آخری دیوان، ''تحفہ احسن،'' ''احسن الانتخاب،'' ''فصیح اللغات'' ان کی یادگار ہیں۔

منتخب اشعار

بہت بڑھ چڑھ کے دعوا چودھویں کا چاند کرتا ہے
تمھیں میری قسم! اُٹھنا، ذرا تم بھی سنور جانا

شکوہ میرا عدو سے کرتے ہو
یہ تو غیبت ہوئی، گلا نہ ہوا

نہ آئے میری عیادت کو احسنؔ اب کوئی
کہ بند آنکھ ہوئی، ختم انتظار ہوا

کچھ اَور بھی کیا حق کے سوا اُس نے کہا تھا
منصور سرِدار ہے، معلوم نہیں کیوں؟

جو کام زمانے میں ہے سب کے لیے آساں
میرے لیے دشوار ہے، معلوم نہیں کیوں؟

روک لے اے ضبط! جو آنسو کہ چشمِ تر میں ہے
کچھ نہیں بگڑا ابھی تک، گھر کی دولت گھر میں ہے

جما ہوا ہے تصوّر کچھ اِس طرح دل میں
کہ خواب میں بھی اُسی کا خیال ہوتا ہے

بیدم شاہ وارثی

نام غلام حسین، بیدم تخلص۔ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن اناو (یوپی) تھا۔ نعت گو کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں وفات پا گئے۔ دیوہ شریف میں اپنے مرشد پاک کے قدموں میں آسودۂ خاک ہیں۔ ''مصحفِ بیدم'' کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام چھپ گیا ہے۔

منتخب اشعار

آئی نسیمِ کوئے محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلّم
کھنچنے لگا دل سُوئے محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلّم

کعبہ ہمارا کوئے محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلّم
مصحفِ ایماں رُوئے محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلّم

وہ لے گئے چراغ اُٹھا کے، غضب کیا　　زینت تو کچھ نہ کچھ تھی ہمارے مزار کی

مجھ سے پوچھو اُن کی خاموشی کا حال　　کچھ نہ کہنے پر بھی سب کچھ کہہ گئے

اپنی ہستی کا اگر حُسن نمایاں ہو جائے　　آدمی کثرتِ انداز سے حیراں ہو جائے

دینے والے! تجھے دینا ہے تو اتنا دے دے　　کہ مجھے شکوۂ کوتاہی داماں ہو جائے

عہد تھا اُن کے گھر نہ جانے کا　　ہائے، بے تابی لے چلی دل کی

بے خودی میں بتا دیا میں نے　　بات ظالم نے پوچھ لی دل کی

اقبال، علاّمہ

نام محمد اقبال، ڈاکٹر، سر، تخلص اقبال۔ لقب ''حکیم الامت،'' ''ترجمانِ حقیقت،'' ''مفکرِ اسلام'' اور ''شاعرِ مشرق۔'' ۹/ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ایف اے مرے کالج، سیالکوٹ سے کیا۔ عربی، فارسی ادب اور اسلامیات کی تعلیم مولوی میر حسن سے حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور آ گئے۔ بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں لینے کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں فلسفے کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ وہاں قانون کے ساتھ فلسفے کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ ہائیڈل برگ (میونخ) یونیورسٹی میں ''ایران میں مابعدالطبیعیات کا ارتقا'' پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔

انگلستان سے واپس آ کر کچھ عرصے پروفیسر رہے۔ بعد ازاں وکالت شروع کی، مگر یہ پیشہ ان کے مزاج کے موافق نہ تھا اس لیے اسے ترک کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی اعلا قابلیت کے صلے میں ''سر'' کا خطاب ملا۔ ۱۹۲۷ء میں پنجاب کی مجلس مقننہ کے ممبر چنے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس، لندن میں شرکت کی۔ اقبال نے شروع میں کچھ غزلیں ارشد گورگانی کو دکھائیں۔ داغ سے بذریعہ خط کتابت بھی تلمذ رہا۔ اقبال بیسویں صدی کے اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اُن کے اردو مجموعہ ہائے کلام کے نام یہ ہیں: ''بانگِ درا،'' ''بالِ جبریل،'' ''ضربِ کلیم'' ارمغانِ حجاز'' (اردو اور فارسی کلام)۔ ''کُلیاتِ اقبال'' اردو بھی چھپ گئی ہے۔ فارسی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''اسرارِ خودی'' ''رموزِ بے خودی''، پیامِ مشرق،'' ''زبورِ عجم،'' ''جاوید نامہ،'' ''مسافر،'' ''پس چہ باید کرد۔'' ۲۱/ اپریل ۱۹۳۸ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔

کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا

اندازِ بیاں پھر وجود میں آئیں گے اور اردو ادب کے فروغ کا باعث ہوں گے۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللّٰہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں، جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔ (شیخ عبدالقادر)

منتخب اشعار

کی محمد سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

وہ دانائے سُبل، ختم الرُّسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یاسیں، وہی طٰہٰ

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ 'رفعنا لک ذکرک' دیکھے

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ!
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

کوئی دل نظر نہ آیا، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے، نگار خانہ ہے آرزو کا

تری نگاہ کی زد میں ہے چرخِ نیلی فام
مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے تیرا

پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ، کیا ہوا، کیونکر ہوا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

جو تُو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تُو رہنا

باطل سے دبنے والے اے آسماں! نہیں ہم
سَو بار کر چکا ہے تُو امتحاں ہمارا

زندگی انساں کی ہے مانند مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اُڑ گیا

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں غازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصوّرات

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

یارب! یہ جہانِ گزراں خوب ہے، لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں، حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تُو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تُو ہے محیطِ بے کراں، میں ہوں ذرا سی آب جُو
یا مجھے ہم کنار کر، یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ، میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خذف تو تُو مجھے گوہر شاہوار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

آئے عشّاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ، بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حُسین، ابتدا ہے اسماعیل

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مومن کی ہے پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

نہ پوچھو مجھ سے لذّت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں، نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو! تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ستاروں سے آگے جہاں اَور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اَور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سیکڑوں کارواں اَور بھی ہیں

اِسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان ومکاں اَور بھی ہیں

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اَور بھی ہیں

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

زائرانِ کعبہ سے اقبالؔ یہ پوچھے کوئی کیا حرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

قہاری و غفاری و قدّوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات تُو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا نہ تن

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر تُو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں ڈھونڈنے والوں کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ اِسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

رنگ و آبِ زندگی سے گل بداماں ہے زمیں سیکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ، کیا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الّا اللّٰہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الّا اللّٰہ

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تُو
دوڑ پیچھے کی طرف، اے گردشِ ایّام تُو

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

مرے ہم صفیر اِسے بھی اثرِ بہار سمجھے
اُنھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گِلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

مرے خاک و خوں سے تُو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا، لا الٰہ الّا اللّٰہ

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز، اِسے بار بار دیکھ

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تُو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے، سلطانی بھی عیّاری

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خَم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

اے طائرِ لاہوتی! اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

تری زندگی اِسی سے، تری آبرو اِسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسیاہی

تُو اِسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم رواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر، اگر زندوں میں ہے
سِرِّ آدم ہے، ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جُوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جُوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اِسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ افغانی، نہ ایرانی

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا، نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حُسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بہ خود کرتی ہے لالے کی حنابندی

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلّت ہے کارِ آشیاں بندی

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی!

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے وہ رسمِ شاہبازی

تجھے کیوں فکر ہے اے گل! دلِ صد چاک بلبل کی
تُو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

تمنّا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے، نہ ناری ہے

گیسوے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیٔ دل سوزیٔ پروانہ ہے

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ، رزّاقی نہیں ہے

تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز، مگر رکھتی ہے

خودی کو کر بلند اِتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا، تیری رضا کیا ہے؟

قوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اُجالا کر دے

دشت تو دشت ہے، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

اچھا ہے، دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی، اور کافری کیا ہے!

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں
خبر نہیں، روشِ بندہ پروری کیا ہے!

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اُمید امیٹھوی

نام محمد علی، کنیت ابوالکمال، تخلّص امید۔ ۳ر فروری ۱۸۷۸ء کو قصبہ گڑھ امیٹھی، ضلع سلطان پور، (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امیٹھی میں ہوئی۔ ۱۸۹۳ء میں لکھنؤ آئے اور وہاں فارسی، عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ادب وفنِ عروض کی بھی چند کتابیں پڑھیں۔ ایک عرصے تک اودھ پنچ کی نامہ نگاری کرتے رہے۔ ۱۸۸۸ء سے ۱۹۱۱ء تک بہ سلسلۂ ملازمت لکھنؤ میں رہے اور چند غزلیں جلال لکھنوی کو دکھائیں۔ فارسی میں بھی شاعری کی۔ وفات:

منتخب اشعار

اب تو ایسا بھی نہیں کوئی جو اُن سے پوچھے
آپ نے کھو کے مجھے غیر کو پایا کیسا

سمجھے نہ تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا
ہنسنے پر اپنے آپ ہی رویا کریں گے ہم

ارے چشمِ بددور اُمّید صاحب!
یہ آج آپ کو میں کہاں دیکھتا ہوں

ہستی عاشق حجابِ جلوۂ معشوق ہے
یہ جو اُٹھ جائے تو پردہ پھر کوئی حائل نہیں

جلوہ بہ اعتبارِ تماشا تھا اے کلیم!
ورنہ ابھی وہ شمعِ حقیقت بجھی نہیں

نام سن کر خوشی کا اے اُمّید!
رنج ہوتا ہے اب، خوشی کیسی

دل کی اُلجھن نہ پوچھیے اُمّید!
ہم نہ خلوت کے ہیں نہ محفل کے

وہ آخر رو دیے کیوں؟ میں نے تو اتنا ہی پوچھا تھا
کبھی اُمّید کو ہنستے ہوئے بھی تم نے دیکھا ہے؟

جوہر، محمد علی

محمد علی نام، جوہر تخلّص۔ لقب ''رئیس الاحرار''۔ ۱۸۷۸ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ اور لنکن کالج، آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ریاست ہائے بڑودہ اور رام پور میں ملازم رہے۔ ترک ملازمت کے بعد کلکتہ سے ہفتہ وار ''کامریڈ'' اخبار جاری کیا۔ دہلی میں ''ہمدرد'' کے نام سے اردو میں بھی اخبار کا اجرا کیا۔ ۱۹۱۴ء میں برطانوی پالیسی کے خلاف لکھنے پر آپ کو نظر بند کیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد تحریک خلافت میں حصّہ لیا۔ گاندھی کی معیت میں ملک کی آزادی وتحریک خلافت کی تنظیم وتبلیغ کی غرض سے تحریکِ موالات میں حصّہ لیا جس کی وجہ سے دوبار جیل جانا پڑا۔ ۱۹۲۳ء میں رہا ہوئے اور اسی سال کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ بعض ہندوؤں کی ذہنیت کی وجہ سے

مولانا کانگریس سے الگ ہو گئے۔ مولانا گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے اور وہیں ۴رجنوری ۱۹۳۱ء کو انتقال کر گئے۔ بیت المقدس میں دفن ہوئے۔ شاعری میں داغ کے شاگرد تھے۔ دیوان ''جوہر'' شائع ہو گیا ہے۔ محمد علی جوہؔر انگریزی زبان کے صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے بہت بڑے علم بردار اور مسلمانوں کے محبوب لیڈر تھے۔

محمد علی کے پاس میکالے کا قلم، برک کی زبان اور نپولین کا دل تھا۔ (ایچ جی ویلز)

منتخب اشعار

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں

اس نغمۂ الست کی کچھ دل کشی نہ پوچھ
کانوں میں آ رہی ہے ابھی تک صدائے دوست

دَورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تم تو کعبے کے خدا تھے پھر نکالے کیوں گئے
اے بتو! کیسی خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دل سے ہوتی رہتی ہیں سرگوشیاں
اب یہی اک مشغلہ دن رات ہے

ہے رشک ایک خلق کو جوہؔر کی موت پر
یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

ہے مسلماں کی بس یہی پہچان
کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے

ناطق لکھنوی

نام سیّد ابوالعلیٰ سعید احمد، ناطق تخلّص۔ آپ کے جدِ اعلا بغداد سے ہندوستان آئے اور ضلع بارہ بنکی میں قصبہ دیوا آباد کیا۔ ناطق ۱۸۷۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہوئے۔ طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ابتدا میں تصنیف و تالیف کو ذریعہ معاش بنایا۔ بعد ازاں کانپور کے ایک اردو اخبار کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ حیدر آباد (دکن) کے اخبار ''ملک و ملّت'' کے ادارتی فرائض بھی انجام دیے۔ ۱۹۱۷ء میں مستقلاً کلکتہ آ گئے اور وہیں طبابت کرنے لگے۔ تقسیم ہند کے بعد سابق مشرقی پاکستان چلے گئے۔ ۹راکتوبر ۱۹۵۰ء کو چاٹگام میں انتقال کر گئے۔ مختلف علوم و فنون پر ان کی متعدد کتابیں یادگار ہیں۔ اُن کی چند تصانیف

کے نام یہ ہیں: ''اسرارِ حقیقت،'' ''افسانۂ شہر آشوب،'' ''نشانِ معرفت،'' ''دیوانِ ناطق،'' ''مصحفِ ناطق۔''

منتخب اشعار

دوبارہ دل میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا
تمھاری پہلی نظر کا جواب ہو نہ سکا

چلو دیکھیں تو ناطقؔ اپنی حد سے بڑھ نہ آیا ہو
اُٹھا ہے شور کعبے میں کہ اک خانہ خراب آیا

اک فریبِ حسرتِ دیدار تھا جلوہ ترا
نور سمجھے تھے جسے وہ بھی حجابِ نور تھا

اے شمع! تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

غربت کی بے کسی پر کرلوں گا صبر یارب!
واپس، مگر نہ کرنا اس حال سے وطن میں

نار کو نور کر دیا سرورِ کائنات نے
وہ جو لگی تھی طور پر آ کے بجھی حجاز میں

ضبط کرنا چاہیے، گو ضبط ہو سکتا نہیں
آنکھ میں آنسو بھرے بیٹھا ہوں، رو سکتا نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا بھر سے ہے بے گانہ وہ
دیکھتا ہوں میں کہ بے رونق کوئی محفل نہیں

گدائے مے کدہ تھا، اب ہوں میں شیخِ حرم ناطقؔ
کہیں ایسا نہ ہو پہچان لے کوئی یہاں مجھ کو

مزے پر قصہ آیا تھا کہ نظمِ زندگی بگڑا
کہاں پر ختم کردی بے وفا نے داستاں میری

جہاں ہم نے دیکھے ذرا بدلے تیور
وہیں ہم نے طرزِ شکایت بدل دی

ان کے تیور بھی نہ بگڑے، بات بھی اپنی بنی
حال ہم کہتے رہے، وہ داستاں سمجھا کیے

مے کشو! مے کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے، کس کو کتنا ہوش ہے

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے، اُتنا ہی وہ خاموش ہے

یوں کھلی ہے چشمِ مسحور اُس کی خوابِ ناز سے
جس طرح جادو جگا کر کوئی جادوگر اُٹھے

عمر بھر سوچا کیے سمجھے نہ ہم
آنکوں آنکھوں میں وہ کیا کیا کہہ گئے

وہ بے نقاب کہیں بے نقاب ہوتا ہے
کہ آفتاب خود اپنا حجاب ہوتا ہے

ہے وہی دیوان مطبوعہ مرا
جس قدر لوگوں کو ناطقؔ یاد ہے

محبت ایک مدّت سے ہے، یہ معلوم ہوتا ہے
تمھیں ہر چند پہلی بار دیکھا ہے ابھی میں نے

خیالِ بے اثریٔ دعا، معاذاللہ!
کہ ہاتھ اُٹھے کے اُٹھے رہ گئے دعا کے لیے

حشر کاشمیری

نام آغا محمد شاہ، حشر تخلّص ۔ ۳؍اپریل ۱۸۷۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے ۔ ان کا آبائی وطن کشمیر ہے ۔ عرصے سے ان کے خاندان کا مسکن بنارس تھا اور شال کی تجارت ہوتی تھی ۔ آغا حشر ایک بہت بڑے ڈراما نگار ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر، عظیم فن کار اور زبردست مقرر تھے ۔ انھوں نے کئی ڈرامے نیوالفریڈ کمپنی کے واسطے تحریر کیے ۔ نیوالفریڈ سے ترک تعلّق کے بعد اپنی ذاتی کمپنی موسوم بہ شیکسپیئر تھیٹریکل کپنی کھولی جو تھوڑے ہی دنوں میں بند ہوگئی ۔ اس کے بعد حشر کلکتہ چلے گئے اور ایک معقول تنخواہ پر تھیٹریکل کمپنی میں ایکٹنگ کرنے لگے ۔ ان کی بعض تصانیف یہ ہیں ۔ ''ترکی حور،'' ''خوبصورت بلا،'' ''سفید خون،'' ''سورداس،'' ''رستم وسہراب،'' ''سیتا بن باس'' وغیرہ۔ ۲۸؍اپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کر گئے ۔

ڈرامے اور تھیٹر کی دنیا میں آغا صاحب کی حیثیت ایک اہم سنگ میل کی ہے اور ان کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی ۔ (امتیاز علی تاج)

منتخب اشعار

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے

اے دعا! ہاں، عرض کر عرشِ الٰہی تھام کے
اے خدا! اب پھیر دے رُخ گردشِ ایّام کے

خلق کے مارے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں ہم تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے

خوار ہیں، بدکار ہیں، ڈوبے ہوئے ذلّت میں ہیں
کچھ بھی ہیں، لیکن ترے محبوب کی امّت میں ہیں

حق پرستوں کی اگر کی تُو نے دل جوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

جی میں تھا اے حشرؔ! اُس سے اب نہ بولیں گے کبھی
بے وفا جب سامنے آیا تو پیار آ ہی گیا

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اِس دعا کے بعد

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں
بھولنے والے کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں میں؟

او وفا نا آشنا! کب تک سنوں تیرا گلہ
'بے وفا' کہتے ہیں تجھ کو اور شرماتا ہوں میں

مے و جام و معشوق کا ساتھ چھوٹا
بہت حشرؔ یاد آئی ہم کو جوانی

چوری کھلے کہیں نہ، نسیم بہار کی
خوشبو اُڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

کتنی گھٹائیں آئیں، برس کر نکل گئیں
آنسو مرے، مگر نہ تھمے تم سے چھوٹ کے

امیدیں مر کے جی اُٹھیں تری جھوٹی تسلّی سے   ارے بے درد! کیوں جینا مرا دشوار کرتا ہے

فانی بدایونی

نام شوکت علی، فانی تخلّص ۔۱۳؍ستمبر ۱۸۷۹ء کو قصبہ اسلام نگر، بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں بی اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء تک لکھنؤ اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء تک آگرہ میں پیشہ وکالت ذریعہ معاش بنایا۔ کچھ عرصہ بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کرتے رہے، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک حیدرآباد، دکن میں صدر مدرس رہے۔ فانی کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا، لیکن انھوں نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ فانی کے کلام میں میر کا سوز و گداز اور یاس و محرومی بھی ہے اور غالب کا مفکرانہ انداز بھی۔ فانی ۲۶؍اگست ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد، دکن میں انتقال کر گئے۔ ۱۹۳۹ء میں ''عرفانیاتِ فانی'' کے نام سے فانی کے قدیم و جدید کلام کا مکمل مجموعہ انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی نے شائع کیا۔

> فانی کی شاعری غم والم کی شاعری ہے، لیکن موضوع سے قطع نظر ان کی غزلیں بجائے خود بڑی پاکیزہ، سجل اور آراستہ ہوتی ہیں۔ فانی کے یہاں فن اور زبان کا بڑا احترام ہے۔ ان کا لہجہ بڑا استوار و ہموار ہے۔ فانی کے غم کا اردو میں ایک خاص مقام ہے۔ (رشید احمد صدیقی)

منتخب اشعار

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا   زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانیؔ!   زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے   ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول   تیرا کرم کہ تُو نے دیا دل دُکھا ہوا

نام بدنام ہے ناحق شبِ تنہائی کا   وہ بھی اک رُخ ہے تری انجمن آرائی کا

ہم جی سے گزر جانا آسان سمجھتے تھے   دیکھا تو محبت میں یہ کام بھی مشکل تھا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی؟ کیوں درِ زنداں کھلتا ہے؟   کیا کوئی وحشی اَور آ پہنچا، یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی   تھک تھک کر اِس راہ میں آخر، اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن   غربت جس کو راس نہ آئی، اور وطن بھی چھوٹ گیا

جب ترا ذکر آ گیا، ہم دفعتاً چپ ہو گئے
وہ چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا

یوں چُرائیں اُس نے آنکھیں، سادگی تو دیکھیے
بزم میں گویا مری جانب اشارا کر دیا

بھڑک کے شعلۂ گل! تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

تجھے خبر ہے، ترے تیرِ بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

بُوئے خزاں سے مست ہیں، یاد ہمیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں، پھول کہاں کے، خار کیا

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے
اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا

اُس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ
کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا

مفہومِ کائنات تمھارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا

دل ہی نگاہِ ناز کا ایک اداشناس تھا
جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا

یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

موت آنے تک نہ آئے، اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی، مرنا بھی مشکل ہو گیا

فکرِ راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی
ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا

ناکام ہے تو کیا ہے، کچھ کام پھر بھی کر جا
مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو وہ بھی کیا معلوم

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانیؔ
وجود دردِ مسلّم، علاج نامعلوم

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اِس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

وہ ہے مختار جزا دے کہ سزا دے فانیؔ
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

نا مہربانیوں کا گِلہ تم سے کیا کریں
ہم بھی کچھ اپنے حال پہ اب مہرباں نہیں

چلے بھی آؤ، وہ ہے قبرِ فانی، دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میّت ہے
اب اُٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

خدا سے اور پھر گھڑی گھڑی کی یہ چھیڑ اچھی نہیں ہے فانی
دعائیں مانگے ہی جا رہے ہو، نہ صبح دیکھو، نہ شام دیکھو

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانے کا ذکر کیا
اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام موت
جب ہم نے کوئی شاخ چنی، شاخ جل گئی

دُنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

دل اُن کے نہ آنے تک لب ریز شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

یا کہتے تھے کچھ کہتے، جب اُس نے کہا، کہیے
اب چپ ہیں کہ کیا کہیے، کھلتی ہے زباں کوئی

راحت کا مفہوم یہی ہے، جہدِ طلب سے باز نہ آ
بڑھنے دے دل کی بے چینی، تڑپے جا، آرام نہ لے

طور تو ہے، ربِّ ارنی کہنے والا چاہیے
لن ترانی ہے، مگر نا آشنائے گوش ہے

چمکا دیا ہے رنگِ چمن لالہ زار نے
شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میّت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی، ان داموں تو سَستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں ہے، بستے بستے بستی ہے

اک فسانہ سن گئے، اک کہہ گئے
میں جو رویا، مسکرا کے رہ گئے

حد پہ جب پہنچی نظر، حدِ نظر آگے بڑھی
جو نظر آیا زیادہ، کم نظر آیا مجھے

یارب! تری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیے

تمہیں کہو، تمھیں اپنا سمجھ کے کیا پایا
مگر یہی کہ جو اپنے تھے، سب پرائے ہوئے

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے — یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ — اک تُو ہی ناخدا نہیں، ظالم خدا بھی ہے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے — ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

میں نے فانیؔ ڈوبتی دیکھی ہے نبضِ کائنات — جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

نوح ناروی

نام محمد نوح، تخلّص نوح۔ ۱۸؍ستمبر ۱۸۷۹ء کو اپنے ننھیال بھوانی پور، تحصیل سلون، ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن قصبہ نارہ، ضلع الہ آباد ہے۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم بھوانی پور میں حاصل کی۔ انگریزی بھی پڑھی۔ شروع میں میر نجف علی سے شعروسخن میں اصلاح لیتے رہے۔ بعدازاں امیر مینائی اور جلال لکھنوی کو کچھ غزلیں دکھائیں۔ آخر میں مرزا داغ کے شاگرد ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء میں حیدرآباد، دکن گئے اور کچھ عرصہ داغ کی صحبت میں رہنے کے بعد وطن واپس آ گئے۔ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۶۲ء کو نارہ میں انتقال کر گئے۔ ان کے تین دیوان ''سفینۂ نوح''، ''طوفانِ نوح'' اور ''اعجازِ نوح'' شائع ہو گئے ہیں۔ دیوانِ چہارم ''یادگارِ نوح'' غیر مطبوعہ ہے۔

منتخب اشعار

سنتے رہے ہیں آپ کے اوصاف سب سے ہم — ملنے کا آپ سے کبھی موقع نہیں مِلا

مرنا خیالِ حق میں معراجِ زندگی ہے — دار و رسن سے سنیے منصور کا فسانہ

مشیّت کو نہیں منظور دو دن پارسا رکھنا — اِدھر کی میں نے توبہ اور اُدھر فوراً بہار آئی

آپ ہیں، ہم ہیں، مَے ہے، ساقی ہے — یہ بھی اک امرِ اتفاقی ہے

ہو گئیں ختم ہجر کی گھڑیاں — اَور تھوڑی سی رات باقی ہے

کچھ نہ کہنا بھی کسی کے سامنے — اک طرح کا انکشافِ راز ہے

اُن سے مِل کر میں انھیں میں کھو گیا — اور جو کچھ ہے وہ آگے راز ہے

عشق نے دل کو پکارا اِس طرح — میں یہ سمجھا، آپ کی آواز ہے

کیوں کر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھیے — سب مجھ سے پوچھیے، یہ مصیبت نہ پوچھیے

کعبہ یہی ہے دیر یہی، طور بھی یہی — اس بے دلی سے دل کی حقیقت نہ پوچھیے

وہ ملنے کو مجھ سے بڑھے تھے، مگر　　خدا جانے کیا سوچ کر رہ گئے

فقیر، مرزا فقیر محمد

نام مرزا فقیر محمد۔ ۱۸۷۷ء میں ڈھاکا میں پیدا ہوئے۔ ڈھاکا کے نواب خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ایک عرصے تک نواب سر سلیم اللہ کے سکریٹری رہے۔ داغ سے تلمذ حاصل تھا۔ مشرقی بنگال کے قابل قدر بزرگوں میں تھے۔ تمام عمر مشرقی بنگال میں رہ کر اردو زبان و ادب کی خاموش خدمت کرتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد مرزا صاحب اکثر گوشہ نشین رہے۔ ثقلِ سماعت کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ ۲۴ رجولائی ۱۹۶۰ء کو ڈھاکے میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

خود فریبی نے کر دیا آساں　　ورنہ جینا عذاب ہو جاتا
ہم آئینے میں عکسِ نظر دیکھتے رہے　　کس رُخ کو دیکھنا تھا کدھر دیکھتے رہے

سیماب اکبر آبادی

نام سیّد عاشق حسین صدیقی، سیماب تخلص۔ ۱۸۸۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ کتبِ متداولۂ عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد انگریزی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۷ سال کی عمر میں ایف اے کا آخری امتحان ہونے والا تھا کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ مجبوراً انھیں سلسلہ تعلیم ترک کرنا پڑا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کا فرزند اکبر ہونے کی حیثیت سے گھر کا تمام باران کے سر پر آ پڑا۔ زمانۂ طالبِ علمی میں ان کا یہ دستور تھا کہ فارسی نصاب میں جتنے اشعار شریکِ درس ہوتے تھے ان کا ترجمہ اردو نظم میں کر کے اساتذہ کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ بہ سلسلہ معاش کان پور گئے۔ ۱۸۹۸ء میں داغ کے شاگرد ہو گئے۔ کچھ عرصہ ریلوے میں ملازم رہے۔ وہاں سے مستعفی ہو کر زبان و ادب کی خدمت کے خیال سے آگرہ میں ''قصر الادب'' کی بنیاد ڈالی۔ ایک ہفتہ وار پرچہ ''تاج'' اور ایک ماہ نامہ پرچہ ''شاعر'' نکالا جس نے ان کی شاعری اور شہرت کو فروغ دیا۔ ان کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ یہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ قرآنِ حکیم کا منظوم ترجمہ کیا۔ تقسیم ہند کے بعد سیماب کراچی آ گئے اور یہیں ۳۱ رجنوری 1951ء کو انتقال کر گئے۔ ''کلیمِ عجم''، ''سدرۃ المنتہیٰ''، ''لوحِ محفوظ'' ورائے سدرہ، ''کارِ امروز''، ''ساز و آہنگ''، ''الہامِ منظوم'' (مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ) ''وحیِ منظوم'' (قرآن مجید کا منظوم ترجمہ)، ''عالمِ آشوب؛ (رباعیات)، ''تغیرِ غم'' (سلام و مراثی)، شعر انقلاب (انقلابی نظمیں) ان کی تصانیف ہیں۔

منتخب اشعار

ڈبویا تھا جہاں طوفاں نے ہم کو — وہاں سب تھے، خدا کیا، ناخدا کیا

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر — پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

تم نے ہمارے ظرفِ نظر پر نہ کی نگاہ — سارے جہاں کو حُسن سے معمور کر دیا

سرائے دہر میں سیمابؔ نیکیاں کیسی — گناہ بھی تو بقدر گناہ کر نہ سکا

سیمابؔ کیا سناؤں میں اپنا کسی کو حال — زندہ ہوں اور شکر ہے پروردگار کا

وفا کے گیت جب حُسن و محبت مل کے گائیں گے — وہ دَورِ عاشقی سیمابؔ کتنا دل کشا ہوگا

یہ نکمّا پن جمودِ دل کا اک انجام ہے — دل سے کوئی کام لے، دل کام کا ہو جائے گا

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر — ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

شورِ ہستی ابھی ذرا ٹھہرے — سُن رہا ہوں ضمیر کی آواز

محبت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا — مگر یہ کہ درد آشنا ہو گئے ہم

دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا — کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

ہر چیز پر بہار، ہر اک شے پہ حُسن تھا — دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

وہی سب سے بڑی نعمت ہے جو مل جائے بے مانگے — سکونِ دل سے بہتر اضطرابِ دل سمجھتا ہوں

مری خاموشیوں پر دنیا مجھ کو طعن دیتی ہے — یہ کیا جانے کہ چپ رہ کر بھی کی جاتی ہیں تقریریں

تُو کیا سمجھے گا اے بت ساز! یہ پردے کی باتیں ہیں — تراشا جس کو، تھی پہلے سے وہ تصویر پتھر میں

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ — شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن — دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں (۱)

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں — اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

خدا پر کر بھروسا، ناخدا کیا کام آئے گا — اُٹھاتا ہے جو طوفاں، روک بھی سکتا ہے طوفاں کو

سجّاد اسیرِ جَور ہوئے، افسوس، کسی نے یہ نہ کہا — یہ پاؤں ستونِ کعبہ ہے، زنجیر کسے پہناتے ہو

---

(۱) یہ شعر بہ ادنا فرق ''لائی تھی'' کے بجائے ''لائے تھے'' بہادر شاہ ظفرؔ سے منسوب ہے۔ یہ شعر اپنی اصل شکل میں سیمابؔ اکبرآبادی کا ہے۔
بحوالہ: ''کلیم عجم'' سیمابؔ اکبرآبادی، مکتبۂ قصر الادب، آگرہ، جولائی ۱۹۴۷ء، ص ۲۲۸

یہ کس نے شاخِ گل لا کر قریب آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

خلوصِ دل سے سجدہ ہو تو اس سجدے کا کیا کہنا
وہیں کعبہ سرک آیا، جبیں ہم نے جہاں رکھ دی

پہروں رہتی تھی گفتگو جن سے
اُن سے اب بات بھی نہیں ہوتی

اسی میں خیریت ہے آگہی محدود ہے تیری
کہ اُتنا ہی بڑھے گا وہم جتنی آگہی ہوگی

کیا آ گئی نیند اہلِ محفل؟
کہنی تھی ہمیں بھی اک کہانی

تیرے جلوؤں نے مجھے گھیر لیا ہے اے دوست!
اب تو تنہائی کے لمحے بھی حسیں ہوتے ہیں

چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترتیب رکھّی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کوئی یہ شکوہ سرایانِ جَور سے پوچھے
وفا بھی حُسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے

صانع کی صنعتوں پر سَو حُسن کیوں نہ برسیں
اپنی کسی ادا کو انساں بنا دیا ہے

دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب
کہ اُس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے

کہانی ہے تو اتنی ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

مری دیوانگی پر ہوش والے بحث فرمائیں
مگر پہلے انھیں دیوانہ بننے کی ضرورت ہے

ہے حصولِ آرزو کی وجہ ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے

نہ غرض حرم کے وقار سے، نہ صنم کدے کی بہار سے
ہمیں کام ہے درِ یار سے، درِ یار پھر درِ یار ہے

کیا تھا بادِ حوادث نے منتشر جن کو
سمٹ سمٹ کے وہی ذرّے کوہسار بنے

بھاری قدم، نظر متحیّر، نفس دراز
کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آ گئے؟

ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں
یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتے ہوئے

وحشتؔ کلکتوی

نام سیّد رضا علی، وحشت تخلّص۔ ۱۸ر نومبر ۱۸۸۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عالیہ، کلکتہ میں تعلیم پائی۔ کچھ عرصہ امپریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ میں چیف مولوی کے عہدے پر فائز رہے۔ بعد ازاں کلکتہ میں اسلامیہ کالج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۱ء میں حکومت وقت نے ''خان بہادر'' کا

خطاب عطا کیا۔ شمس فرید پوری سے تلمذ حاصل تھا جو داغ کے شاگرد تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وحشت کلکتہ سے ہجرت کر کے ڈھاکا چلے گئے اور وہیں ۲۰/جولائی ۱۹۵۶ء کو وفات پا گئے۔ وحشت نے غالب کا تتبع بڑی خوبی سے کیا ہے۔ کلام کا پہلا مجموعہ ''دیوانِ وحشت'' ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا جس میں کچھ فارسی کلام بھی شامل تھا۔ ''ترانۂ وحشت'' کے نام سے مکمل کلام کا مجموعہ ۱۹۵۰ء میں چھپا۔ ''نقوش و آثار'' بھی اُن کی تصنیف ہے۔

آپ نے مرزا (غالب) کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کر کے ثابت کر دیا ہے کہ سچائی کا مقابلہ کیسی ہی سختی کے ساتھ کیا جائے، وہ آخر کار اپنا نقش لوگوں کے دلوں پر جمائے بغیر نہیں رہتی۔ (محمد یحیٰ تنہا)

منتخب اشعار

اپنا بھی وہی حال ہوا راہِ وفا میں
جو حال ہوا کرتا ہے اربابِ وفا کا

نہ شوقِ مے کدہ چھوٹا، نہ سودائے صنم چھوٹا
ہمیں جس شغل کا چسکا پڑا وہ ہم سے کم چھوٹا

ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیرِ وفا ڈالی
تمھارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا؟

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

ہائے وہ عالم کسی کے حُسن کا
دیدنی تھا مجھ پہ جو عالم رہا

تیری محفل کا یار کیا کہنا
ہم بھی نکلے ہیں چشمِ تر لے کر

حالِ چمن خزاں میں بھی ایسا کبھی ہوا نہ تھا
اپنا جو حال ہو گیا رنگِ بہار دیکھ کر

پابندیٔ رسوم کو سمجھا ہے بندگی
زنار چھین لیں گے ابھی برہمن سے ہم

وصل اس کا ہو میسّر اس کو قسمت چاہیے
ہجر ہی سے دوستی کی ابتدا کرتے ہیں ہم

اس دل نشیں ادا کا مطلب ہم تو کبھی نہ سمجھے
جب ہم نے کچھ کہا ہے، وہ مسکرا دیے ہیں

قسمت میں نا امیدی و حسرت ہے کیا کروں
اس بے وفا سے مجھ کو محبت ہے، کیا کروں

کس کو خبر نہیں ہے کہ دیتا ہے وہ فریب
یاں تو فریب کھانے کی عادت ہے، کیا کروں

مزہ آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے تم بیاں کرتے، کہیں سے ہم بیاں کرتے

پتا ملتا نہیں جنسِ وفا کا اب زمانے میں
کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے

نہ پروا کی ہماری کارواں نے جب تو پھر ہم بھی
بچھڑ کر کارواں سے کیا تلاشِ کارواں کرتے

ہے ہدایت کے لیے موجود خود میرا ضمیر
گوشِ دل سے سُن حقیقت کی یہی آواز ہے

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

دل والے ہیں واقف مری بربادیٔ دل سے
ہر چند کہ یہ واقعہ مشہور نہیں ہے

ہنسا ہوں حال پر اپنے جہاں رونے کا موقع تھا
کیا ہے شکر کے پردے میں قسمت کا گلہ میں نے

اللہ رے زورِ مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اُٹھانا پڑتا ہے کیسے وہ اُٹھایا جاتا ہے

وطن میں آنکھ چراتے ہیں ہم سے اہلِ وطن
تڑپتے رہتے تھے غربت میں ہم وطن کے لیے

جگہ جو آنکھوں میں میں نے دی تھی تو ان سے تھی چشمِ رازداری
یہ کیا خبر تھی کہ اشک میرے مجھی کو بے آبرو کریں گے

چکبست، برج نرائن

نام پنڈت برج نرائن، چکبست تخلّص۔ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں اپنے وطن لکھنؤ میں آ گئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی اے اور ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ میں وکالت شروع کردی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت سے صفِ اوّل کے وکلا میں شمار ہونے لگے۔ شاعری کا ذوق فطری تھا۔ کم عمری ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ افضل علی خاں افضل کے شاگرد تھے۔ ابتدا میں انھوں نے کچھ غزلیں کہیں۔ بعدازاں قومی، سیاسی، سوشل اور نیچرل نظمیں کہنے لگے۔ ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو وہ کسی مقدمے کی پیروی میں رائے بریلی گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ریلوے اسٹیشن پر فالج کا شدید دورہ پڑا اور اسٹیشن پر ہی فوت ہو گئے۔ جب ان کے بڑے بھائی کو اس سانحے کی خبر ملی تو وہ لاش کو لکھنؤ لے گئے۔ ''کلّیاتِ چکبست'' مرتبہ کالی داس گپتا رضا ۱۹۸۱ء میں چھپ گئی ہے۔

منتخب اشعار

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے، یہی اور یہی انساں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

کمالِ بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

اِس کو ناقدریٔ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر چکے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اُس کے لیے چمن کی خزاں کیا، بہار کیا

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

کیوں رُلانے کو سناتے ہو وفا کے قصے
دوستو! اب تو محبت کا یہ دستور نہیں

فنا کا ہوش آنا، زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے، خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

وہ پپیہوں کی صدائیں اور وہ موروں کا رقص
وہ ہوائے سرد اور کالی گھٹا برسات کی

خدمتِ انساں سے دل کو آشنا کرتے رہے
دل کے آئینے پہ الفت کی جلا کرتے رہے

زندگی نام تھا جس کا اُسے کھو بیٹھے ہم
اب امیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے یہاں کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

خود پرستی مٹ گئی، قدرِ محبت بڑھ گئی
ماتمِ احباب ہے تعلیمِ روحانی مجھے

ضیا عظیم آبادی

نام مرزا علی رضا، ضیا تخلص۔ تقریباً ۱۸۸۰ء میں محلہ شاہ املی، عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جناب عبدالسبحان صاحب مائل تلمیذ شوق نیموی کے شاگرد ہوئے اور چند سال تک ان سے اصلاح لیتے رہے۔ جب نقص عوارض کے سبب مائل دماغی محنت سے مجبور ہوئے تو ضیاء استاد الاستاد شوق نیموی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ کچھ دنوں تک فقیرانہ وضع اختیار کی۔ گیروا لباس پہنتے رہے۔ شادی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ۲۷ راپریل ۱۹۰۱ء کو ہیضے کے مرض میں اس دنیا سے چل دیے۔ ان کا دیوان چھپ گیا ہے جس کا تاریخی نام ''ریاضِ شاداب'' معروف بہ ''دیوان رضا'' ہے۔

منتخب اشعار

در سے نہ اُٹھاؤ تم ضیا کو
کم بخت پھرے گا مارا مارا

یہ نصیب کی ہیں باتیں، کہ ہوں جس کی بندگی میں
نہ وہ سر اُٹھا کے دیکھے، نہ وہ لے سلام میرا

کوچے سے نکلواتے ہو عبث ہم ایسے وطن آواروں کو
رہنے دو پڑے ہیں ایک طرف دکھ دیتے ہو کیوں بیماروں کو

اک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے، اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں، جب سارا عالم سوتا ہے

راز رام پوری

نام منشی امتیاز احمد خاں، عرف پیارے خاں، تخلص راز۔ ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ وطن رام پور تھا۔ احمد علی رسا اور

امیر مینائی سے تلمذ حاصل تھا۔ اپنا کلام جمع کرنے کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔ ۲۸؍جنوری ۱۹۱۸ء کو رام پور میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

مِل گئی مجھ کو تو دُنیا سے نجات — قتل کر کے آپ کو کیا مل گیا

دل چرانے کی عبث ان سے شکایت کر دی — اب وہ آنکھیں بھی چراتے ہیں پشیماں ہو کر

تم مل گئے تو نعمتِ کونین مل گئی — ہم کھو گئے تو کھو گئے کچھ اس کا غم نہیں

زندہ رہنا نہ سکھاؤ، لیکن — جان دینا تو بتا دو ہم کو

فرصتِ عرضِ محبت نہ مِلی خوب ہوا — آپ سنتے بھی تو کیا آپ سے کہتا کوئی

شبّیر رام پوری

نام صاحب زادہ محمد شبیر علی خاں عرف ننھے صاحب۔ ولادت ۱۶؍ستمبر ۱۸۸۴ء۔ فرزند نواب کلبِ علی خاں۔ تلمیذِ محمود رام پوری۔ کچھ کلام مضطر خیر آبادی کو بھی دکھایا تھا۔ ابتدا میں اسٹیٹ سے تعلّقات خراب ہو گئے تھے اس لیے دہلی چلے گئے تھے۔ بعد ازاں رام پور آ کر آنریری مجسٹریٹ ہو گئے۔ ۹؍اور ۱۰؍مئی ۱۹۳۱ء کی درمیانی شب کو انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

ہاتھوں کو نہ مَل مَل کے مجھے کوسنے دیجے — ہاتھوں سے نہ اُڑ جائے کہیں رنگ حِنا کا

کوئی زمانے میں روتا ہے کوئی ہنستا ہے — یہاں کسی سے کسی کی صدا نہیں ملتی

یاد آ جاتے ہیں یارانِ وطن غربت میں — بھولا بھٹکا جو مسافر کوئی آ ملتا ہے

عزیز لکھنوی

مرزا محمد ہادی نام، عزیز تخلص۔ ۱۴؍فروری ۱۸۸۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ انھیں، یہ خاندانی صفت ورثے میں ملی تھی۔ صرف ونحو، کتبِ معقول اور فارسی درسیات کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا شوق ابتدائے عمر سے تھا۔ صفی لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ انھوں نے غزل کے علاوہ قصائد، نظمیں اور مرثیے بھی کہے ہیں۔ جلال لکھنوی کے بعد جن شعرا نے غزل کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی ان میں عزیز لکھنوی ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ ۲۹؍جولائی ۱۹۳۵ء کو وفات پا گئے۔ ''گل کدہ'' اور ''قصائد عزیز'' ان کی یادگار

ہیں۔ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں۔ ''غم کدہ''، ''باقیاتِ عزیز''، ''نالۂ جرس۔'' جوش ملیح آبادی اور اثر لکھنوی انھی کے شاگرد تھے۔

عزیز لکھنؤ کے قدیم رنگِ تغزل کی آخری یادگار تھے۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منتخب اشعار

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

ہنس رہا ہے دیر سے یہ کون تجھ کو دیکھ کر — سر اُٹھا اے دل سے باتیں کرنے والے سر اُٹھا

جھوٹے وعدوں پر تھی اپنی زندگی — اب تو وہ بھی آسرا جاتا رہا

وہ دن گئے عزیز کہ ہنستے تھے رات دن — ملتا ہے چین دل کو اب آنسو بہانے میں

صدا یہی جرسِ کارواں سے آتی ہے — چلے چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں

مر گیا بیمارِ الفت ان سے اتنا کہہ کے بس — جائیے اب آپ سے کوئی گلہ باقی نہیں

کبھی حوصلے دل کے ہم بھی نکالیں — اِدھر آؤ تم کو گلے سے لگا لیں

یہ مانا کہ آزردہ تم سے ہمیں تھے — مگر آؤ اب ہم تمھیں کو منالیں

ہوں گے بدنام تو ہو لینے دو — ہم کو جی کھول کے رو لینے دو

دگرگوں حالتِ بیمارِ فرقت ہو گئی ہوتی — اگر دم بھر نہ آتے تم قیامت ہو گئی ہوتی

دن کٹ گیا فراق کا، لو رات آ گئی — میں جس سے ڈر رہا تھا، وہی بات آ گئی

کسی کی چارہ سازی سے مقدر بن نہیں سکتا — جو قسمت میں لکھا ہے وہ بہر تقدیر دیکھیں گے

کیا پوچھتے ہو ہم سے مریضوں کی سرگذشت — دن کاٹتے ہیں زندگیِ مستعار کے

آیئے، دیکھ لیجیے مجھ کو — اب جو دم ہے، بہت غنیمت ہے

وارفتگانِ حُسن پہ، کیا جانے، کیا بنے — اُٹھ جائیں گر نگاہ سے پردے حجاب کے

ہر گل میں تُو ہے، تجھ میں ہزاروں تجلیاں — دیوانہ کر دیا مجھے فصلِ بہار نے

ہم کو متاعِ عالمِ ہستی سے کیا مِلا — بس اک دماغ و دل میں ترا نور لے گئے

دل! ترا کیوں کہا کیا میں نے — ہائے افسوس کیا کیا میں نے

وہ بادۂ شبانہ کی مستی، وہ دَورِ جام — اب تک مزے ہیں یاد شبِ ماہتاب کے

وعدے کا نام لب پہ نہ آئے پیام بر — کہنا فقط یہی کہ بہت دن گزر گئے
خدا جانے وہ کیوں شرما کے اُٹھ جاتے ہیں محفل سے — قریبِ شمع جب پروانے پر پروانہ آتا ہے
آگ تو دل کی بجھا لینے دو، پھر کچھ پوچھنا — ہوش کس کو جو بتائے، کیا رہا کیا جل گیا
داغِ الفت نے لگا دی، آگ سب دل میں عزیزؔ — ایک چنگاری سے سارا گھر ہمارا جل گیا

اصغر گونڈوی

نام سیّد اصغر حسین، اصغر تخلص۔ یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ وطن ضلع گورکھ پور (گونڈہ) تھا۔ دینی تعلیم کے بعد باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا، مگر نامساعد حالات کی وجہ سے وہ مدرسے میں زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ البتہ خداداد ذہانت، مطالعہ اور شوق کی بدولت عربی اور فارسی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی تھی۔ شروع میں کچھ غزلیں وجد بلگرامی، امیر مینائی اور تسلیم لکھنوی کو دکھائیں۔ حصولِ معاش کے سلسلے میں کچھ عرصہ ادبی مرکز، لاہور سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصہ انڈین پریس، الہ آباد میں رسالہ ''ہندوستانی'' کے مدیر رہے۔ چشموں کا کاروبار بھی کیا۔ اصغر گونڈوی نہایت نفاست پسند، خلیق اور وسیع المشرب شخص تھے۔ اصغر کا کلام کم ہے، مگر منتخب ہے۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انھیں الہ آباد میں حضرت شیخ محبّ اللہ کے مزار کے احاطے میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اصغر کے دو شعری مجموعے ''نشاطِ روح'' اور ''سرودِ زندگی'' شائع ہو گئے ہیں۔

میں نے یہ مجموعہ (''سرودِ زندگی'') بے دلی کے ساتھ اُٹھایا تھا، لیکن جب رکھا تو اس اعتراف کے ساتھ کہ اردو میں ایک شاعر موجود ہے۔ (مولانا ابوالکلام آزاد)

اصغر کے یہاں تخیل زیادہ جذبہ کم ہے۔ ان کی شاعری حسن کی شاعری ہے۔ (رشید احمد صدیقی)

منتخب اشعار

چُھٹ جائے اگر دامنِ کونین تو کیا غم — لیکن نہ چُھٹے ہاتھ سے دامانِ محمدؐ
آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا، اُسے غمِ جاناں بنا دیا
وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے — جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا
ہم اُس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
میں کامیابِ دید بھی، محرومِ دید بھی — جلووں کے ازدحام نے حیراں بنا دیا

کیا کیا قیود دہر میں ہیں، اہلِ ہوش کے
ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچاننے لگا ہوں تمھاری نظر کو میں

کہہ کے کچھ لالہ وگل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حُسن کا رُسوا ہونا

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائگاں ہے، وہی رائگاں نہیں

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

رودادِ چمن سنتا ہوں اِس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

بہت لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بے خود نہ ہوشیار ہوا

مری نگاہوں نے جھک جھک کے کردیے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حُسنِ یار ہوا

عارضِ نازک پہ ان کے رنگ سا کچھ آ گیا
اِن گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

کچھ اس ادا سے مرا اُس نے مدّعا پوچھا
ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود

یوں نہ اس دَورِ خزاں کو بے حقیقت جانیے
پرورش پائی ہے اس نے زیرِ دامانِ بہار

داستاں ان کی اداؤں کی ہے رنگیں، لیکن
اِس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

آج خوں گشتہ تمنائیں مجھے یاد آ گئیں
ہر طرف ہنگامۂ جوشِ بہاراں دیکھ کر

نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ ہے بقا معلوم
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

نہ کامیاب ہوا میں، نہ رہ گیا محروم
بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں میں

ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے، تُو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ "کیا ہوں میں"

خیرگیِ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتا نہیں
اور بھی دور ہو گئے آ کے ترے حضور میں

تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں، میرے ہر اک قصور میں

یکا یک توڑ ڈالا ساغرِ مے ہاتھ میں لے کر
مگر ہم بھی مزاجِ نرگسِ رعنا سمجھتے ہیں

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں

اب وہ زماں، نہ وہ مکاں، اب وہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

بہت سمجھے ہوئے ہے شیخ راہ و رسمِ منزل کو
یہاں منزل کو بھی ہم جادۂ منزل سمجھتے ہیں

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ وگل کو
مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

دل میں اک بوند لہو کی نہیں، رونا کیسا
اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد؟
تُو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی؟

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہیے
تڑپ کے ساتھ اونچی ہوگئی دیوارِ زنداں کی

جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر، وہ دیکھ لے ہمدم!
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو
تمھارے حُسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری

قربان ترے مے کش! ہاں، اے نگہِ ساقی!
تُو صورتِ مستی ہے تو معنیِ مے خانہ

ہے اب تو تمنّا کہ کسی کو بھی نہ دیکھوں
صورت جو دکھا دی ہے تو لے جاؤ نظر بھی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

ازل میں اک تجلّی سے ہوئی تھی بے خودی طاری
تمھیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد پڑتا ہے

تیرا جلوہ، ترا انداز، ترا ذوقِ نمود
اب یہ دنیا نظر آتی نہیں دنیا مجھ کو

نہ میں دیوانہ ہوں اصغؔر، نہ مجھ کو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لیے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

سَو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

ایک ایک نفس میں ہے صد مرگ بلا مضمر
جینا ہے بہت مشکل، مرنا بہت آساں ہے

آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اس کو
یہ جان ازل ہی سے پرورۂ طوفاں ہے

اک جہدِ کشاکش ہے، ہستی جسے کہتے ہیں
کفّار کا مٹ جانا خود مرگِ مسلماں ہے

میرے سرِ نیاز کی محویتیں مٹا نہ دے
موت ہو یا حیات ہو، کوئی مجھے صدا نہ دے

عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حُسن کو
پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں
تم چیر کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشمِ مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ مے خانہ دیکھتے

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

مجھ کو نہیں ہے تابِ خلش ہائے روزگار
دل ہے نزاکتِ غمِ لیلا لیے ہوئے

تُو برقِ حُسن اور تجلّی سے یہ گریز
میں خاک اور ذوقِ تماشا لیے ہوئے

صد ہا تو لطفِ مے سے بھی محروم رہ گئے
یہ امتیازِ ساغر و مینا لیے ہوئے

تبسّم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے
نظر سے چھیڑ دے رگ رگ مری ہشیار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہو زندگی دشوار ہو جائے

تُو بہت سمجھا تو کہہ گزرا فریبِ رنگ و بو
یہ چمن، لیکن اُسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

مری رندی عجب رندی، مری مستی عجب مستی
کہ سب ٹوٹے پڑے ہیں شیشۂ و پیمانہ برسوں سے

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے

لَو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُڑا کر جزو و کُل
اب نہ کچھ شیشے میں ہے باقی، نہ پیمانے میں ہے

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی
تُو، کمالِ زندگی، کہتا ہے، مر جانے میں ہے

میری فغانِ درد پہ اس سروِ ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

میں ہوں ازل سے گرمِ رَوِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دُنیا کہیں جسے

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
اک ربطِ خاص رنجشِ بیجا کہیں جسے

بہارِ سبزہ و گل ہے کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتی ہے دنیا مے کدہ آباد ہوتا ہے

ازل میں اک تجلّی سے ہوئی تھی بیخودی طاری
تمھیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیّاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

یہ ذوقِ سیر، یہ دیدارِ جلوۂ خورشید
بلا سے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے
ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز اب کہاں
رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے

اسرارِ عشق ہے دلِ مضطر لیے ہوئے
قطرہ ہے بے قرار سمندر لیے ہوئے

موجِ نسیمِ صبح کے قربان جائیے
آئی ہے بُوئے زلفِ معنبر لیے ہوئے

کیا مستیاں چمن میں ہیں جوشِ بہار سے
ہر شاخِ گل ہے ہاتھ میں ساغر لیے ہوئے

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی — ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لیے ہوئے

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں — رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لیے ہوئے

نہ یہ شیشہ، نہ یہ ساغر، نہ یہ پیمانہ بنے — جانِ مے خانہ تری نرگسِ مستانہ بنے

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے — جس جگہ بیٹھ کے پی لیں، وہی مے خانہ بنے

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال — اِس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

یگانہ چنگیزی

نام مرزا واجد حسین، یگانہ تخلص۔ پہلا تخلص یاس تھا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو محلّہ مغلپورہ، عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم عظیم آباد میں ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں انٹرنس پاس کیا۔ پہلے بیتاب عظیم آبادی اور پھر شاد عظیم آبادی سے تلمذ حاصل رہا۔ ۱۹۰۴ء میں کلکتہ گئے اور مٹیا برج میں پرنس میرزا محمد مقیم کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ کلکتہ کی آب و ہوا یگانہ کو راس نہ آئی۔ کچھ دنوں علیل رہ کر عظیم آباد واپس چلے آئے یہاں بھی طبیعت ٹھیک نہ ہوئی۔ آخر کار لکھنؤ پہنچے۔ یہ واقعہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور رنگا رنگ دلچسپیوں نے کچھ ایسا اثر کیا کہ یہیں کے ہو رہے۔ یگانہ کافی عرصہ اودھ اخبار سے منسلک رہے۔ ۱۹۲۶ء میں لاہور میں ایک اشاعتی ادارہ ''اردو مرکز'' کے نام سے قائم ہوا۔ یگانہ اس مرکز سے ۱۹۲۶ء کے شروع سے ۱۹۲۷ء کے اوائل تک وابستہ رہے۔ ''اردو مرکز'' سے علاحدگی کے بعد بھی یگانہ کچھ عرصہ لاہور میں رہے۔ بعد ازاں حیدر آباد، دکن کا رخ کیا۔ یہاں دارالترجمہ میں سب رجسٹرار کے عہدے پر تقرر ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں اس عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ ۱۹۴۹ء تک کسی معقول آمدنی کا ذریعہ ہونے کی توقع میں حیدر آباد، دکن میں رہے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ پاکستان آئے اور اپنے بیٹوں کے ساتھ یہاں سات ماہ قیام کیا۔ ان کی زندگی کے آخری پانچ سال نہایت پریشانی اور کس مپرسی میں گزرے۔ اپنی طبیعت کے باعث انھیں شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کافی دنوں سے ان کی صحت خراب تھی۔ آخر کار ۳۔۴ فروری کی درمیانی شب ۱۹۵۶ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ ان کے جنازے میں بمشکل بارہ آدمی شریک تھے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''نشترِ یاس''، ''آیاتِ وجدانی''، ''گنجینہ۔'' ''کلّیاتِ یگانہ'' مرتبہ مشفق خواجہ بھی شائع ہو گئی ہے۔

یگانہ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبروتی رُخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا سب سے نمایاں خصوصیت مردانہ عزم و اعتماد ہے۔

(مجنوں گورکھ پوری)

منتخب اشعار

دیکھو تو اپنے وحشیوں کی جامہ زیبیاں
اللہ رے حُسن پیرہن تار تار کا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

زنجیر پھر ہلا دی نسیم بہار نے
پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہو گیا

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا
نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

خدا کسی کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا

انساں کو رہے حفظِ مراتب کا بھی کچھ دھیان
کیوں اُس سے ملو یاسؔ جو جھک کر نہیں ملتا

چت بھی اپنی ہے، پٹ بھی اپنی ہے
میں کہاں ہار ماننے والا

یاسؔ اِس چرخِ زمانہ ساز کا کیا اعتبار
مہرباں ہے آج، کل نامہرباں ہو جائے گا

مجھے اے ناخدا! آخر کسی کو مُنہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر پھوڑ کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

وائے حسرت کہ تعلق نہ ہوا دل کو کبھی
نہ تو کعبے کا ہوا میں، نہ صنم خانے کا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دَیر و حرم، گھر کا راستا نہ ملا

بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ
کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتا نہ مِلا

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

پیالہ خالی اُٹھا کر لگا لیا مُنہ سے
کہ یاسؔ کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

چار دن کی زندگی ہے کاٹ دو ہنس بول کر
دل لگا لو پھر قفس ہی آشیاں ہو جائے گا

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا

گناہِ زندہ دلی کہیے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اِتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

پڑے ہو کون سے گوشے میں تنہا
یگانہ! کیوں خدائی ہو چکی بس!

آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے
سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ محملِ یار دیکھ کر

ارے او جلنے والے، کاش جلنا ہی تجھے آتا
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر

اُٹھو اے سونے والو سر پہ دھوپ آئی قیامت کی
کہیں یہ دن نہ ڈھل جائے نصیبِ دشمناں ہو کر

عجب کیا وعدۂ فردا پسِ فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اَور آ جائے نہ شامِ بے سحر ہو کر

کہاں پر نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے
پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر

خدا معلوم، اِس آغاز کا انجام کیا ہوگا
چھڑا ہے سازِ ہستی مبتدائے بے خبر ہو کر

عمر گھٹنے کے لیے ہے، وقت کٹنے کے لیے
مفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

منزل کی دُھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے
شورِ جرس سے دل نہ رہا اختیار میں

دنیا سے یاسؔ جانے کو جی چاہتا نہیں
واللہ کیا کشش ہے اس اُجڑے دیار میں

کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو
دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

بے اجل منزلِ فانوس پہ مرنے والے
جان کیا دیتے ہیں اک رسم ادا کرتے ہیں

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی نظر سے بدگماں کیوں ہو

گرفتارانِ ساحل کود پڑتے، ڈر نکل جاتا
کبھی تو زیستِ مشکل آزماتی مرگِ آساں کو

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن رنگ لائے گی
قفس سے چھوٹ کر سر پر اُٹھا لیں گے گلستاں کو

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

مری نظر کی خطا ہوگی یا گلوں کی خطا
تمھارے راج میں کانٹے ہی برگزیدہ سہی

نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر
تُو بندگانِ ضرورت کا آفریدہ سہی

دلِ طوفاں شکن تنہا جو آگے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے

نگاہوں سے گرایا یاسؔ کو کم بخت اسی دل نے
اسی دل کی بدولت لوگ کیا کیا کام کرتے ہیں

کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اُجڑتی ہے، ایک سمت بستی ہے

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سُراغ باطن کا
چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

یادش بخیر، یادِ خدا آ ہی جاتی ہے — اپنی طرف سے لاکھ بھلایا کرے کوئی

دُور سے آج اُن کو دیکھ لیا — دل کو تسکیں ہوئی، مگر نہ ہوئی

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے — آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے

تمام انساں تو کیا دو بھی برابر ہو نہیں سکتے — جہاں دو ہوں گے، بڑھ جائے گا ایک اپنے مقابل سے

گناہِ عشق امرِ اضطراری کے سوا کیا تھا — مگر توفیقِ رسوائی بھی شامل ہوتی جاتی ہے

حاصلِ فکرِ نارسا کیا ہے — تُو خدا بن گیا، بُرا کیا ہے

کیسے کیسے خدا بنا ڈالے — کھیل بندے کا ہے، خدا کیا ہے

پہنچی یہاں بھی شیخ و برہمن کی کش مکش — اب مے کدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا

علم کیا علم کی حقیقت کیا — جیسی جس کے گمان میں آئی

ہنس بھی لیتا ہوں اوپری دل سے — جی نہ بہلے تو کیا کرے کوئی

اتنا تو زندگی کا کوئی حق ادا کرے — دیوانہ وار حال پر اپنے ہنسا کرے

رفتارِ زندگی میں سکوں آئے کیا محال — طوفاں ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے

مجذوب، خواجہ عزیز الحسن غوری

نام خواجہ عزیز الحسن غوری، تخلّص مجذوب۔ تاریخی نام مرغوب احمد۔ ۱۲ر جون ۱۸۸۴ء کو اورئی، ضلع جالوں (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ تربیت خالص دینی اور مشرقی طرز پر ہوئی۔ علی گڑھ سے بی اے کیا۔ ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ خواجہ صاحب نے قانون چھوڑ کر پہلے آبکاری میں نوکری کی۔ اس نوکری سے مستعفی ہو کر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سات برس اس عہدے پر رہے۔ چوں کہ یہ عہدہ ان کی طبیعت کے خلاف تھا اس لیے کوشش کر کے اپنا تبادلہ تنخواہ کی کمی پر محکمہ تعلیم میں کرالیا۔ پہلے مکاتب اسلامیہ کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے پھر انگریزی اسکولوں کے انسپکٹر آف اسکولز (یوپی) مقرر ہوئے اور اسی عہدے سے پنشن پا کر ریٹائر ہوئے۔ شاعری میں کسی سے تلمذ نہ تھا۔ عزیز الحسن غوری حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ان میں خاکساری اور تواضع کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انھوں نے انگریزی کپڑے کبھی نہیں پہنے۔ ڈپٹی کلکٹری اور انسپکٹری میں بھی اپنی وضع نہیں بدلی۔ ۱۶ اور ۱۷ اگست ۱۹۴۴ء کی درمیانی شب کو اورئی میں انتقال کر گئے۔ ان کا کلام ''گفتۂ مجذوب'' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔

منتخب اشعار

ہر چیز پر عکسِ رُخِ زیبا نظر آیا
عالم مجھے جلوہ ہی جلوا نظر آیا

بے پردہ کس کا جلوۂ رخسار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

پردے تعینات کے جس دن سے اُٹھ گئے
عالم تمام جلوہ گہِ یار ہو گیا

یہ برق صفت کون اُٹھا دیتا ہے پردہ
ہو جاتا ہے اک دم جو اُجالا مرے دل میں

پینے دے، کیا بجھے گی، بلا کی ہے تشنگی
ساقی! مجھے تو آج ڈبو دے شراب میں

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لَو شمعِ محفل کی
پتنگوں کے عوض اُڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

اب بھی مجذوب جو محرومِ پذیرائی ہے
کیا جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے؟

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

اب کہاں دن رات کی وہ صحبتیں
مِل گئے صاحب سلامت ہو گئی

جوش ملسیانی

پنڈت لبھو رام نام، جوش تخلص۔ یکم فروری ۱۸۸۴ء کو ملسیان، ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۸۹۷ء میں ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا۔ جوش صاحب جب پندرہ برس کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مدرسی کا پیشہ اختیار کیا جائے۔ اس مقصد سے انھوں نے نارمل اسکول، جالندھر میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۰۱ء میں نارمل کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وکٹر ہائی اسکول، جالندھر میں دس روپیہ مشاہرے پر مدرس مقرر ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور کی ایس۔ وی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ضلع جالندھر کے کئی اسکولوں میں مدرس رہے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ ڈسٹرکٹ بورڈ اسکول، نکودر میں فارسی کے مدرس اول مقرر ہوئے۔ اسی دوران محکمانہ ضرورت کے پیش نظر منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات امتیاز سے پاس کر لیے۔ ۱۹۳۶ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے اور بقیہ زندگی نکودر میں مقیم رہے۔ انھوں نے شعر گوئی طالبِ علمی کے زمانے سے شروع کر دی تھی۔ انھیں داغ سے تلمذ حاصل تھا۔ خانہ نشینی کے ایام میں انھیں دو ہی مشغلے رہے۔ ایک شعر و شاعری دوسرے شطرنج۔ جوش نے یوں تو تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن غزل پر زیادہ توجہ رہی ہے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''بادۂ سر جوش''، ''جنون و ہوش''، ''فردوسِ گوش'' (منظومات و غزلیات)، ''نغمۂ سروش''

(رباعیات)، دستور القواعد فارسی، ''مکتوباتِ جوش'' اور ''منشوراتِ جوش۔'' ۲۷؍جنوری ۱۹۷۶ء کو نکودر میں انتقال کر گئے۔ مرکزی حکومت نے ان کی خدمات کا اعتراف یوم جمہوریہ ہند جنوری ۱۹۷۱ء کے موقع پر ''پدم شری'' کے اعزاز سے نوازا۔ اردو کے مشہور شاعر عرش ملیسانی انھی کے فرزند ہیں۔

منتخب اشعار

خراب بھی ہوئے، دردر کی خاک بھی چھانی — ترا مزاج نہ اے گردشِ زمانہ ملا

میری رسوائی کا حال اے داورِ محشر نہ پوچھ — میں بھری محفل میں یہ قصہ سنا سکتا نہیں

ترے انداز پر عمرِ رواں کچھ شک گزرتا ہے — لیے جاتی ہے تُو مجھ کو کدھر آہستہ آہستہ

سب تمنائیں ہماری مرچکیں — ایک مرنے کی تمنا رہ گئی

ہر شام پر گمان تھا صبحِ نشاط کا — کیا دن تھے وہ خوشی کے جو آ کر چلے گئے

ناخدا غافل، ہوائیں تند، موجیں ہول ناک — وہ تو قسمت تھی کہ ساحل پر سفینہ آ گیا

پلائی ہے ساقی جو آنکھوں سے آج — اِسی کا بس اب دَور چلتا رہے

نیاز فتح پوری

نام نیاز محمد خاں، نیاز تخلص۔ ۲۸؍دسمبر ۱۸۸۴ء کو سنی گھاٹ، ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن فتح پور ہسوہ (یوپی) تھا۔ چھ سات سال کی عمر تک گھر پر تعلیم پائی۔ نو دس سال کی عمر میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ علوم اسلامی کے ساتھ ساتھ یہیں سے ۱۸۹۸ء میں انگریزی مڈل اور ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل دار العلوم ندوہ، لکھنؤ اور پھر مدرسہ عالیہ رام پور میں تعلیم حاصل کی۔ نیاز ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۱ء تک مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ان عہدوں سے مستعفی ہو کر ادب اور صحافت کو ذریعہ معاش بنایا۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۹ء تک مختلف اخبارات اور ہفتہ واروں سے منسلک رہے۔ فروری ۱۹۲۲ء میں ماہ نامہ ''نگار'' کا آگرے سے اجرا کیا۔ ''نگار'' باقاعدگی سے بھوپال اور لکھنؤ سے نکلتا رہا۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں منجانب حکومت ہند ''پدم بھوشن'' کا خطاب ملا۔ نیاز نقل مکانی کر کے کراچی آ گئے۔ اگست ۱۹۶۲ء سے کراچی سے ''نگار'' نکلنا شروع ہوا۔ وہ فارسی، عربی، انگریزی کے علاوہ ہندی اور ترکی زبانیں بھی جانتے تھے۔ وفات ۲۴؍مئی ۱۹۶۶ء کراچی۔ وہ ۳۵ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں افسانہ، ناولٹ، تنقید، مذہب، مکتوب نگاری، مقالہ نگاری، نفسیات شامل ہیں۔

اُن کی چند تصانیف اور تالیفات کے نام یہ ہیں: ''مکتوباتِ نیاز،'' ''شہاب کی سرگذشت،'' ''جذباتِ بھاشا،'' ''فلاسفۂ قدیم،'' ''شاعر کا انجام،'' ''فراست الید،'' ''مذاکراتِ نیاز،'' ''انتقادیات،'' ''من ویزداں،'' ''ترغیباتِ جنسی،'' ''گہوارۂ تمدّن،'' ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ،'' ''مشکلاتِ غالب،'' ''تاریخ کے گم شدہ اوراق،'' ''نقاب اُٹھ جانے کے بعد،'' ''نگارستان،'' ''جمالستان،'' ''عرضِ نغمہ'' (ترجمۂ گیتا نجلی)۔

نیاز جیسے مکمّل ادیب صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ (جوش ملیح آبادی)

منتخب اشعار

نہ دنیا کا ہوں میں، نہ کچھ فکرِ دیں کا
محبت نے رکھا نہ مجھ کو کہیں کا

چھٹے مجھ سے احباب ایک ایک کر کے
بُرا ہو مری طبعِ اندوہ گیں کا

ہم نے دیکھا تھا، ہے وہی تو نیاز
لا اُبالی سا اک جوان خموش

گھڑی گھڑی نہ اِدھر دیکھیے کہ دل پہ ہمیں
ہے اختیار، پہ اِتنا بھی اختیار نہیں

عزیز وڈال دو اب میرے مُنہ پہ تم چادر
اور ان سے کہہ دو کہ اب مجھ کو انتظار نہیں

پلکیں کچھ بھیگ گئیں آج تو اُس کی بھی نیاز
اُس نے، کیا جانیے، کس حال میں دیکھا مجھ کو

آرام دن کا، رات کا سونا، سکونِ دل
ہاں، تم سے چھٹ کے کون سی راحت نہیں مجھے

بالیں پہ آئے ہو تو نہ بیٹھو جھکا کے سر
اچھا ہوں، اب تو کوئی شکایت نہیں مجھے

خدا معلوم دنیائے محبت کیسی دنیا ہے
جو دشمن ہے تمنّا کا، وہی جانِ تمنّا ہے

چوم لینے دیں وہ اپنے لب، یہ میں کیسے کہوں
ورنہ کچھ مشکل نہ تھا دشنامِ جاناں کا جواب

مجھ کو مارا ہے اُسی نوخیز نے، ہاں ہاں وہی
جو دبا کر دانت سے آنچل کا کونا جائے ہے

اب یہ حالِ دل ہے جیسے رکھ کے کانٹوں پر نیاز
ریشمی چادر کو بے دردی سے کھینچا جائے ہے

ذوقِ تخلیق برہمن کی بلندی دیکھیے
بت بناتا جائے ہے، سجدہ بھی کرتا جائے ہے

روشنی ہی روشنی ہے، عہدِ برق و نور ہے
یہ، مگر سایہ سا کیوں دنیا پہ چھایا جائے ہے

برق، مہاراج بہادر ورما

نام منشی مہاراج بہادر ورما، تخلّص برقؔ۔ ۱۸۸۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن ضلع ایٹہ (یوپی) تھا، لیکن دہلی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں چند غزلیں آغا شاعر قزلباش کو

دکھائیں۔ بعدازاں خود غور وفکر سے کہنے لگے۔ 1918ء میں ایف اے اور ۱۹۲۰ء میں بی اے پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں سب آرڈی نیٹ اکاؤنٹس سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ پوسٹل آڈٹ آفس، دہلی میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۹/فروری ۱۹۳۶ء کو آپ ایک شادی کے سلسلے میں بال بچوں کے ساتھ پانی پت گئے۔ ۱۲/فروری ۱۹۳۶ء کی شب بارہ بجے رات کو حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔ اُن کا ایک مجموعہ ''مطلعِ انوار'' کے نام سے چھپ چکا ہے اور بہت سا کلام شائع نہیں ہوا۔ اِن کا یہ شعر زبان زدِ خاص وعام ہے:

وہ آئے بزم میں اتنا تو برقؔ نے دیکھا
پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی (۱)

اثر لکھنوی

میرزا جعفر علی خاں نام، اثرؔ تخلص۔ ۱۲/جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ۱۹۰۹ء سے ملازمت شروع کی۔ ڈپٹی کلکٹر، ڈپٹی کمشنر اور الہ آباد ڈویژن کے اڈیشنل کمشنر کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۴۰ء میں پنشن ہوگئی۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک حکومت کشمیر میں وزیر تعلیم، وزیر داخلہ اور قائم مقام وزیر اعظم کے فرائضِ منصبی سنبھالے۔ وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ عزیزؔ لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ شاعر کے علاوہ ایک اچھے نقاد تھے۔ وہ کلاسکل اردو شاعری اور لکھنوی طرز سخن گوئی کی آخری یادگار تھے۔ ۶/جون ۱۹۶۷ء کو انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''اثرستان''، ''بہارستان''، ''بہاراں''، ''لالہ وگل''، ''نو بہاراں''، ''نغمۂ جاوید''، ''چھان بین'' (تنقیدی مضامین) ''اثر کے تنقیدی مضامین''، ''انیس کی مرثیہ نگاری''، ''مزامیر'' (میر کے کلام کا انتخاب)۔

جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی ان لوگوں میں ہیں جو شاعر پیدا ہوئے اور شعر وشاعری ہی ان کی زندگی کا مقطع ہوگا۔ (نیاز فتح پوری)

---

(۱) تابش دہلوی اپنی کتاب ''دید باز دید'' حیات اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۰ء، میں صفحات ۱۴۴-۱۴۳ پر ''مشاعروں کی کہانی'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں: میرے بچپن میں گلستان، بوستان، انوارِ سہیلی، خالق باری اور مثنوی مُلّا غنیمت، کلامِ مجید کے ساتھ عام طور پر بچوں کو پڑھائی جاتی تھیں اور اس طرح ہر شخص کو کم از کم خطوط ہی میں لکھنے کے لیے موقع کے دس بیس اشعار ضرور یاد ہوجاتے تھے اور اس طرح شعر فہمی کا مذاق عام تھا۔ اُس زمانے کے دلّی میں بیخودؔ دہلوی، سائلؔ دہلوی، آغا شاعرؔ قزلباش، پنڈت امرناتھ ساحرؔ، زارؔ زتشی اور شیداؔ دہلوی اور نوجوانوں میں مہاراج بہادر برقؔ اور جادوؔ دہلوی بزمِ ادب کی رونق تھے۔ یہ شعر برقؔ ہی کا ہے جو میرؔ سے منسوب ہے۔

منتخب اشعار

ڈبڈبا آئیں خود بخود آنکھیں — بارہا ایسا اتّفاق ہوا

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں — جیسے کچھ اختیار ہے اپنا

ترے شہر کا نام جس نے لیا — میں سمجھا کہ خط کا جواب آ گیا

وہ گزرا اِدھر سے جو بیگانہ وار — چراغِ لحد جھلملانے لگا

اِدھر دیکھ لینا، اُدھر دیکھ لینا — پھر اُن کی طرف اِک نظر دیکھ لینا

آج کچھ مہربان ہے صیّاد — کیا نشیمن بھی ہو گیا برباد؟

بجھتے ہوئے چراغ بھی ہیں کام کے آثرؔ — شمعیں نئی اِنھیں سے جلاتے چلے چلو

تفریقِ مذاہب سے کیا کام آثرؔ مجھ کو — اِک سجدے سے مطلب ہے، کعبہ ہو کہ بت خانہ

تمام عمر آثرؔ جس کی راہ دیکھی تھی — اِدھر سے آج وہ گزرا تو مثلِ بیگانہ

جھپکی ذرا جو آنکھ، جوانی گزر گئی — بدلی کی چھاؤں تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی

کچھ دن کی اور کش مکشِ زیست ہے آثرؔ — اچھی بُری، گزرنی تھی جیسی، گزر گئی

سنتے نہیں تو اِتنا بتا دو — کس کو سناؤں اپنی کہانی

یاد کر لے بھولنے والے مرے — اب تو بچھڑے ایک مدّت ہو گئی

اس بزمِ اعتبار میں، دُنیا کہیں جسے — ایسا ملا نہ کوئی کہ اپنا کہیں جسے

یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے — اے شوقِ دید! اب نہ پھرا در بدر مجھے

مجلسِ وعظ سے اِک رند یہ کہتا اُٹھا — کافر اچھے ہیں دل آزار مسلمانوں سے

کیوں کر کہوں کہ ختم ہوا دَورِ انتظار — آنسو کی ایک بوند ابھی چشمِ تر میں ہے

کس نے وحشی آثرؔ کو چھیڑا — دیوار سے سر پٹک رہا ہے

اسیری ایسی آزادی سے بہتر — چمن اپنا نہ اپنا آشیاں ہے

پیغام یہ کس کو جاتے ہیں، معلوم تو ہو دیوانے آثرؔ — تُو خاک پہ بیٹھا کیا لکھتا اور لکھ کے مٹایا کرتا ہے

کسی بے کس کا دل دُکھانے سے — کیا ملا آپ کو بھلا، کہیے

پاؤں میں چھالے، راہ میں کانٹے، آنکھ تلے اندھیارا ہے — ڈوبتے دل کی آس نہ توڑو، ہار کے تم کو پکارا ہے

ناصری، مہدی علی

نام مہدی علی، ناصری تخلص۔ ۱۸۸۵ء میں فتح پور، ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایف اے پاس کیا۔ ۱۹۱۳ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد میور سینٹرل کالج میں عربی اور فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے اور تقریباً دس سال تک الہ آباد میں علمی ادبی خدمت میں مشغول رہے۔ ۱۹۲۲ء میں الہ آباد سے تبادلہ ہوکر گورنمنٹ ہائی اسکول بجنور میں بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر تقرر ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں بارہ بنکی آئے اور ۱۹۲۹ء تک وہاں رہے۔ بعدازاں علی گڑھ تبادلہ ہوگیا اور ۱۹۳۱ء میں انتقال کرگئے۔ فتح پور، ضلع بارہ بنکی میں دفن ہوئے۔ پروفیسر ضامن نے ''ناصری خلد بریں کو پہنچے'' تاریخ وفات نکالی۔ ناصری صاحب کی تصانیف یہ ہیں۔ ''مخزن القوائد،'' ''منصور کی سرگذشت،'' ''صنادیدِ عجم،'' ''دیوان حصّہ اول'' (نذر احباب) ''دیوان حصّہ دوم،'' ''قصائد'' وغیرہ۔

منتخب اشعار

گل تو شگفتہ ہوگئے بادِ بہار سے — لیکن علاج حسرتِ بلبل نہ ہوسکا

سیرِ دریا کرنے والے ہم بھی یاد آئے کہیں — کوئی ٹکرایا سفینہ کیا لبِ ساحل نہ تھا؟

مضطرب روح کوئی آ گئی مَے خانے میں — خود بخود مَے کو ہے گردش مرے پیمانے میں

ناصریؔ خوف سے گھٹ گھٹ کے نہ مرجاؤ کہیں — چپ ہو کس واسطے، نالہ کرو فریاد کرو

ہر ادا اُن کی مسیحا بھی ہے اور قاتل بھی ہے — اب تو مرجانا ہمیں آساں بھی ہے مشکل بھی ہے

صدا لگانے ترے در پہ تو گئے تھے، مگر — ہم اپنے ہی دلِ بے تاب کو پکار آئے

آسماں پر ابر جب چھانے لگے — ہم قفس سے سر کو ٹکرانے لگے

ہجر شاہ جہاں پوری

نواب ناظم علی خاں، ہجر تخلص۔ ولادت ۱۸۸۱ء۔ وطن شاہ جہاں پور۔ داغ سے تلمذ حاصل تھا۔ وفات: ۲۰ رجون ۱۹۱۴ء، بمبئی۔

منتخب اشعار

دل کی حالت کیا ہوئی، دل کی مسرّت کیا ہوئی — سوچتا رہتا ہوں پہروں میری حالت کیا، ہوئی

یاد ہے اتنا کہ دیکھا تھا کسی کو بے نقاب — دھیان کچھ اس کا نہیں پھر میری حالت کیا ہوئی

یا کوئی جان بوجھ کے انجان بن گیا | یا پھر یہی ہوا مری صورت بدل گئی

یاد کرتے ہیں، مگر یاد نہیں آتا ہے | بھول آئے ہیں کہاں ہم دلِ مضطر اپنا

اقبال سہیل اعظمی

نام اقبال احمد خاں، تخلص سہیل۔ ۷/جنوری ۱۸۸۴ء کو ضلع اعظم گڑھ کے بڑیرہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گاؤں میں حاصل کی۔ عربی تعلیم سرائے میر، اعظم گڑھ کے مدرسۃ الاصلاح میں حاصل کی۔ ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں عربی ادب کی اعلا کتابیں مولانا شبلی نعمانی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوکر مطالعہ کیا۔ ۱۹۱۳ء میں انٹر کا امتحان بنارس سے پاس کیا۔ ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا اور ایم اے، ایل ایل بی کی سندیں لے کر نکلے۔ انھوں نے شاعری میں باقاعدہ اصلاح کسی سے نہیں لی، اپنے ذوقِ سلیم کو رہبر بنایا۔ ۱۹۱۹ء میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۳۵ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے باوجود وہ شبلی کالج، دارالمصنفین اور مدرستہ الاصلاح وغیرہ جیسے علمی اداروں کے ہمیشہ اہم رکن رہے۔ وہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ ۸/نومبر ۱۹۵۵ء کو اعظم گڑھ میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

اُٹھی تھی بحرِ حُسن میں اک موجِ بے قرار | قدرت نے اس کو پیکرِ انساں بنا دیا

مجھے بھی اذنِ فغاں مِل سکے تو مرغِ اسیر! | ترے قفس سے بدل لوں میں آشیاں اپنا

دوستی کیا نبھائیں گے جن سے | دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

اب کسی اور کی تلاش نہیں | ہے خود اپنی ہی جستجو مجھ کو

اب ہجر کا شکوہ، نہ تغافل کا گلہ یاد | آئی جو تری یاد تو کچھ بھی نہ رہا یاد

اُف کیا مزہ مِلا ستمِ روزگار میں | تم کیا چُھپے تھے پردۂ لیل و نہار میں

یہ مختصر سی داستاں ہے جبر و اختیار کی | کرشمہ ساز کوئی ہو خطا گناہ گار کی

شاید حیات اسی کو کہتے ہیں کہنے والے | ہوتی ہے اک چبھن سی رگ رگ میں آرزو کی

کیوں بڑھایا آپ نے جامِ تہی میری طرف | اور اس سے تیز میری تشنہ کامی ہو گئی

وہ سامنے ہے منزلِ مقصود اے جنوں | بس چند گام لغزشِ مستانہ چاہیے

دو تیلیاں قفس کی ہیں ان کی بساط کیا
مرغِ اسیر ہمتِ مردانہ چاہیے

عقوبت ہائے فردا سے ڈراتا کیا ہے اے واعظ!
یہ دنیا رفتہ رفتہ خود جہنم ہوتی جاتی ہے

پہنچی یہاں بھی شیخ و برہمن کی کشمکش
اب مے کدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا
ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

ناطق گلاوٹھوی

نام سیّد ابوالحسن، ناطق تخلّص۔ ۱۱؍نومبر ۱۸۸۶ء کو کامٹی میں پیدا ہوئے جو ناگپور سے ۹ میل کے فاصلے پر ایک بڑا قصبہ ہے۔ ان کے والد کاروبار کے سلسلے میں کامٹی میں سکونت پذیر تھے۔ ان کا آبائی وطن گلاوٹھی ضلع میرٹھ ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند سے علوم عربیہ کی سند حاصل کی۔ طب کی تعلیم بھی حکیم احمد حسن سے حاصل کی۔ انگریزی زبان پرائیوٹ طور پر سیکھی۔ ۱۹۰۰ء میں شاعری شروع کی۔ ۱۹۰۴ء میں داغ کی شاگردی اختیار کی۔ ابھی چار چھ غزلوں پر اصلاح لینے پائے تھے کہ داغ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد کسی کو کلام نہیں دکھایا۔ اپنے لکھے پر خود ہی اصلاح کرتے رہے۔ داغ کی شاگردی سے پہلے بیان یزدانی سے مشورہ سخن کیا۔ عرصہ دراز تک بہ سلسلہ تجارت ناگپور میں مقیم رہے۔ وہ مسلسل ۲۰؍سال تک ناگپور میونسپل کمیٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۳۶ء میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ناطق صاحب کا آخری زمانہ بہت عسرت میں گزرا۔ ۲۶؍مئی ۱۹۶۹ء کو ناگپور میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''نطقِ ناطق'' (چند نظموں کا مجموعہ)، ''ان کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ ''کنزالمطالب'' (غالب کے دیوان کی شرح) ان کی کچھ اور تصانیف بھی غیر مطبوعہ رہ گئیں جن کے مسوّدے ان کے بعض شاگردوں کے پاس تھیں۔

منتخب اشعار

اب کہاں گفتگو محبت کی
ایسی باتیں ہوئے زمانہ ہوا

دیکھ لو اہلِ چمن! رسوائی فصلِ بہار
کون سا گل ہے کہ جس پر قطرۂ شبنم نہیں

اے بادہ کش! گئی ہے مۓ عیش کس کے ساتھ
ہر اک نے لے کے جام کو آگے بڑھا دیا

ہوا ایمان تازہ شورِ ناقوسِ برہمن سے
مری بھولی ہوئی یاد آ رہی ہیں مجھ کو تکبیریں

اِس دَور میں بھی ناطق جویائے محبت ہے
کس وہم میں پھرتا ہے کھویا ہوا دیوانہ

ہمارے بعد جو دنیا کہے گی، وہ بھی سن لینا
ابھی تو تم ہماری بے زبانی دیکھتے جاؤ

میں بھی کوئی چیز تھا، لیکن نہ پہچانا مجھے
بندہ پرور قدر ہی تم نے نہیں جانی مری

گئے ہیں جب سے، وہ، اپنے بھی آئے، غیر بھی آئے
سب آئے بھی، گئے بھی، گھر کی ویرانی نہیں جاتی

یہ مدّتِ ہستی کی آخر یوں بھی تو گزر ہی جائے گی
دو دن کے لیے میں کس سے کہوں، آسان مری مشکل کر دے

پھر وہی ہم ہیں، وہی شیشہ وہی پیمانہ ہے
توبہ کیا ہے رند کی اک لغزشِ مستانہ ہے

ساتھ بھی چھوڑا تو کب جب سب بُرے دن کٹ گئے
زندگی! تُو نے کہاں آ کر دیا دھوکا مجھے

وہ بے خودی میں خود کو مرا اُن سے پوچھنا
اور اُن کا مسکرا کے یہ کہنا کہ مر گئے

کس کو مہرباں کہیے، کون مہرباں اپنا
وقت کی یہ باتیں ہیں، وقت اب کہاں اپنا

اے خدا! گلہ سن لے اپنی بے نیازی کا
آج حال کہتا ہے ایک بے زباں اپنا

محروم، تلوک چند

نام تلوک چند، محروم تخلص۔ ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۷ء میں تحصیل عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پہلے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں انٹرنس، اس کے بعد بی اے اور ایس اے وی پرائیویٹ طور پر پاس کیے۔ ۱۹۰۸ء میں مشن ہائی اسکول، ڈیرہ اسماعیل خاں میں انگلش ٹیچر ہو گئے۔ ۱۹۳۳ء میں کنٹونمنٹ بورڈ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ زمانہ طالبِ علمی میں ان کی نظمیں پنجاب کے اخبارات اور رسائل میں شائع ہونی شروع ہو گئیں۔ محروم نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ۱۹۲۹ء میں اُن کا مجموعہ کلام ''گنجِ معانی'' کے نام سے میسرز عطر چند کپور نے لاہور سے شائع کیا۔ ان کے دوسرے شعری مجموعے کا نام ''شعلہ نوا'' ہے۔ تقسیم ہند کے بعد دہلی چلے گئے اور وہیں ۶ رفروری ۱۹۶۶ء کو انتقال ہوا۔

منتخب اشعار

اے ہمرہانِ دشتِ محبت! بڑھے چلو
اپنا تو پائے شوق سلاسل میں رہ گیا

ہو دَورِ غم کہ عہدِ خوشی دونوں ایک ہیں
دونوں گذشتنی ہیں خزاں کیا بہار کیا

ہے یہ دنیا ایک ہی افسانۂ ناکامِ شوق
جس نے جو چاہا الگ تجویز عنواں کر دیا

ہمدم! کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے
ایامِ حُسن و عشق کی پھر داستاں نہ چھیڑ

زندگی ناکامیوں کی اک مسلسل داستاں — موت کیا ہے زندگی کی داستاں کا خاتمہ
نظر کر خندۂ گل پر، ریاضِ دہر میں غافل! — نہایت مختصر ہے جو گھڑی ہے یاں مسرّت کی
اے ہم نفس! نہ پوچھ جوانی کا ماجرا — موجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی
عقل کو کیوں بتائیں عشق کا راز — غیر کو رازداں نہیں کرتے
سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جا رہے ہیں ہم — مجھے یہ ساری دنیا کارواں معلوم ہوتی ہے
کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر — اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہی دنیا کی حقیقت ہے
پڑی جو ہم پہ نظر مے کدے میں واعظ کی — وہیں صراحی اُٹھا کر چلا وضو کے لیے

قمر جلالوی

نام سیّد محمد حسین، قمر تخلّص۔ ۱۸۸۷ء میں قصبہ جلالی، ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بچپن میں سیّد زندہ علی سے باقاعدہ اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ضلع علی گڑھ میں بائیسکل کی دکان تھی، یہی ان کی روزی کا ذریعہ تھا۔ امیر مینائی ان کے روحانی استاد تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ معاش کے لیے پاکستان کوارٹرز میں سائیکل کی دکان کر لی تھی۔ شاعری کے جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ ہندوستان اور پاکستان میں آپ کے متعدّد شاگرد تھے۔ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ یہ کلاسیکی روایت کے آخری مقبول شاعر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے قدردانوں نے ان کی حسبِ ذیل کتابیں شائع کیں۔ ''عقیدتِ جاوداں'' (سلام اور مراثی کا مجموعہ)، ''رشکِ قمر''، ''روحِ قمر''، ''غمِ جاوداں''، ''اوجِ قمر''۔

منتخب اشعار

اب نہ آوازِ جرس ہے اور نہ گردِ کارواں — یا تو منزل رہ گئی یا رہ گئے منزل سے ہم
سُرمے کا تل بنا کے رُخِ لاجواب میں — نقطہ بڑھا رہے ہو خدا کی کتاب میں
حق بھی کہنا ہے اگر جرم تو سرکار کو ہم — اختیارِ رسن و دار دیے دیتے ہیں
قمر تسبیح پڑھتے جا رہے ہیں سُوئے بت خانہ — کوئی دیکھے تو یہ سمجھے بڑے اللہ والے ہیں
مرکز سے دائرے کا وہی فاصلہ رہا — سر پر تھا آسمان گئے جس دیار میں
اب تو دامن پہ لہو ہے، کہو، کیا کہتے ہو — اب تو انکارِ ستم کا کوئی پہلو بھی نہیں

کبھی کہا نہ کسی سے ترے فسانے کو — نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو

دبا کے قبر میں سب چل دیے، دعا نہ سلام — ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

ساقیا! جام ہے، ٹوٹے گا، صدا آئے گی — یہ مرا دل تو نہیں ہے کہ جو آواز نہ ہو

بس اب تو چین سے تیمار دار سو جائیں — مریض اب نہ کہے گا، سحر نہیں ہوتی

گیسو ہیں ان کے عارضِ تاباں کے ساتھ ساتھ — کافر لگے ہوئے مسلماں کے ساتھ ساتھ

راستے بند کیے دیتے ہو ویرانوں کے — ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے

یہ خَم نہیں ہے ضعف سے پیری میں اے قمرؔ! — جُھک جُھک کے ڈھونڈتا ہوں جوانی کدھر گئی

جب کسی نے کیا ہے ذکرِ وطن — جانے کس کس کی یاد آئی ہے

گوشۂ چشم سے باہر ہوئی سرمے کی لکیر — خیر ہو، میان سے تلوار نکل آئی ہے

چمن میں روتی ہے شبنم اب اُس کلی کے لیے — خزاں نے جس کو اجازت نہ دی ہنسی کے لیے

حامد حسن قادری

نام حامد حسن قادری، مولانا، تخلّص حامد۔ ۲۵؍مارچ ۱۸۸۷ء کو پیدا ہوئے۔ وطن بچھراؤں، ضلع مراد آباد تھا۔ رام رام پوری سے تلمذ حاصل تھا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور کراچی میں اقامت پذیر ہوئے۔ پہلے زار تخلّص کرتے تھے، بعد میں استاد کی ایما پر حامد تخلّص اختیار کیا۔ ان کی مشہور کتاب ''داستانِ تاریخ اردو'' ہے جس میں ابتدا سے بیسویں صدی کے شروع تک اردو ادب کے نشو و نما کی تاریخ، مصنّفین نثر اردو کے حالات اور تصنیفات کے نمونے درج ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''تاریخ و تنقید'، '' تاریخ فرشتہ گوئی'، ''کمالِ داغ'، ''نقد و نظر'، ''صید و صیّاد'، الکحل اور ہماری زندگی، ''فطرتِ اطفال۔'' وہ ایک نام ور ادیب، نقاد، مؤرّخ، محقّق، ماہرِ تعلیم اور تاریخ گو تھے۔ سینٹ جانسن کالج، آگرہ میں صدرِ شعبۂ اردو و فارسی کے عہدے پر فائز رہے۔ ۶؍جون ۱۹۶۴ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ اُن کا یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے:

اب اُن سے سامنا ہوتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں
کہاں کی رسمِ الفت! چھوڑ دی صاحب سلامت بھی

مزاج، نثار یار جنگ

نواب نثار یار جنگ۔ نام نثار احمد اور تخلّص مزاج۔ علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں وہ یتیم ہو گئے۔ بیوہ ماں نے بڑے حوصلے کے ساتھ ان کی پرورش کی۔ آغازِ جوانی میں تلاش معاش کے لیے بمبئ گئے۔ وہاں انھوں نے ڈیڑھ دو سال ایک اسکول میں ٹیچری کے فرائض انجام دیے۔ وہاں سے حیدر آباد، دکن چلے گئے۔ انھوں نے وہاں ٹھیکیداری بھی کی۔ دفتروں میں اہلکار (کلرک) بھی رہے۔ آفس سپرنٹنڈنٹ کی ذمہ داریوں کو بھی نباہا۔ دکن کے صدرِ اعظم سر علی امام کی پیشی میں پیشکار کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ سر علی امام کے جانے کے بعد نواب صاحب محکمۂ سیاسیات میں انڈر سیکریٹری ہو گئے، پھر دوم تعلّقہ دار ہوئے اور ضلع کے کلکٹر بنا دیے گئے۔ نواب صاحب کو بوجوہ قبل از وقت پنشن پر جانا پڑا۔ ڈیڑھ دو سال خانہ نشین رہے۔ نظام دکن نے انھیں اطراف بلدہ کا تعلّق دار (کلکٹر) بنا دیا۔ کئی سال اس عہدے پر فائز رہنے کے بعد اس خدمت سے بھی سبک دوش ہو گئے۔ زوال حیدر آباد کے بعد اپنے داماد قمر مقصود کے اہل وعیال اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ کراچی آ گئے۔ نواب صاحب کو داغ سے تلمذ حاصل تھا۔ نواب صاحب کی صحت پہلے ہی خراب تھی۔ کراچی آ کر اور بھی خراب ہو گئی۔ ۱۹۵۱ء میں داغِ مفارقت دے گئے۔ اپنے کلام کا مجموعہ ''کیفیات'' یادگار چھوڑا۔

منتخب اشعار

رہروِ راہ محبت کے لیے منزل کہاں
ہر قدم پر یوں تو منزل کا گماں ہوتا رہا

دنیا مری ویراں تھی جب اُس نے نظر پھیری
معمور تھی نغموں سے جب اُس نے اِدھر دیکھا

جب سے اُلٹی ہے نقابِ رُخِ روشن تُو نے
در و دیوار سے سنتا ہوں میں افسانۂ عشق

میں داستانِ شب غم سنا رہا ہوں انھیں
وہ سن رہے ہیں، مگر مسکرائے جاتے ہیں

ہر ذرّے سے انوارِ حقیقت ہیں نمایاں
اے دوست ضرورت ہے ذرا فکر و نظر کی

میری سب داستانِ غم سن کر
پوچھتے ہیں کہ مدّعا کیا ہے؟

اتنا تو مجھے یاد ہے کچھ اُس نے کہا تھا
کیا اُس نے کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں ہے

بھولا نہیں ہوں عہدِ محبت کی داستاں
ہلکا سا درد اب بھی دلِ ناتواں میں ہے

اشکِ غم کی قدر بے دردوں کو کیوں ہونے لگی
یہ گہر ہیں ہم نشیں! اپنے ہی داماں کے لیے

لذّتِ دردِ محبت جو نمایاں ہو جائے　　　ہر فرشتے کو یہ حسرت ہو کہ انساں ہو جائے

منیر بھوپالی

نام محمد منیر الدّین، منیر تخلّص۔ وطن بھوپال۔ بہت پرانے وکیل اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ آخری عمر میں بینائی زائل ہونے کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے تھے۔ سیّد محمد میاں شہید سے تلمذ حاصل تھا۔ وفات اوائل ۱۹۵۸ء۔ ان کا ایک شعر پیشِ نظر ہے:

یقیں ان کے وعدے پہ لانا پڑے گا
یہ دھوکا تو دانستہ کھانا پڑے گا

تمنّا عمادی

نام سیّد حیات الحق محمد محی الدّین، علّامہ۔ ۱۴؍جون ۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے۔ پھلواری شریف، ضلع پٹنہ آپ کا مولد و مسکن تھا۔ آپ نے درسِ نظامی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ حدیث شریف اور طب کا بھی مطالعہ کیا۔ شمشاد لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ فارسی شاعری اور عربی ادب میں علّامہ شبلی سے استفادہ کیا۔ جب سیّد عبد العزیز، بیرسٹر، پٹنہ، حیدر آباد، دکن گئے اور وزارت امور مذہبی و عدلیہ پر مامور کئے گئے تو مولانا تمنّا عمادی بھی حیدر آباد، دکن تشریف لے گئے اور عرصے تک ان کے ساتھ اقامت پذیر رہے۔

تمنّا عمادی ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا ہجرت کر گئے۔ کافی عرصہ ڈھاکا ریڈیو سے قرآن شریف کا درس دیتے رہے۔ ڈھاکا سے نقل مکانی کر کے چاٹگام اور پھر آنکھ کے آپریشن کے سلسلے میں کراچی آ گئے اور یہیں ۲۷؍نومبر ۱۹۷۲ء کو انتقال کر گئے۔ علّامہ تمنّا عمادی کا علم بحرِ بے پایاں تھا ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ یہ بڑے پُر گو اور مشاق شاعر تھے۔ شعر و سخن اور فن عروض میں انھیں استادی کا مرتبہ حاصل تھا۔ اُن کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

ساقی! گھٹا ہے، صحنِ چمن ہے، بہار ہے
اب کارِ خیر میں تجھے کیا انتظار ہے

مہر گوالیاری

نام منشی نرائن پرشاد ورما، پروفیسر، مہر تخلّص۔ ۱۸۸۸ء میں سُبل گڑھ، مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے۔ ریاست

گوالیار ان کا وطن تھا۔ داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار تھا۔ داغ کے ہندو تلامذہ میں ان کا خاص مقام تھا۔ ۲۶ رجولائی ۱۹۴۳ء کو گوالیار میں انتقال کر گئے۔ ان کا دیوان ''شعاعِ مہر'' کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

منتخب اشعار

ابھی کچھ اور پروانے گلے ملنے کو باقی ہیں — ذرا تھمنا ابھی رخصت نہ اے شمع سحر ہونا

کُھل جائے بھرم ضبطِ محبت کا نہ اُن پر — ڈرتا ہوں کہیں آنکھ میں آنسو نہ بھر آئے

کچھ کہہ سکے نہ داورِ محشر کے سامنے — آنکھیں بھر آئیں اس کو گنہگار دیکھ کر

جگر مرادآبادی

نام علی سکندر، تخلص جگر۔ ولادت ۱۵/۶ اپریل ۱۸۹۰ء، مرادآباد۔ قرآن پاک، فارسی اور اردو کی تعلیم اُس زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ اسکول کی تعلیم نویں جماعت، تک حاصل کی۔ وہ کسی باقاعدہ نصاب کی تکمیل نہ کر سکے، مگر انھیں فطری استعداد بے پایاں ودیعت ہوئی تھی۔ ان کے والد علی نظر شاعر تھے اور خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ جگر کے خاندان کے دوسرے اصحاب بھی شاعر تھے، اس طرح جگر کو شاعری ورثے میں ملی۔ چناں چہ جگر کی شعر گوئی کا آغاز اُس وقت ہوا جب وہ ۱۴۔۱۳ برس کے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے حیات بخش رسا کو کلام دکھایا۔ پھر داغ سے رجوع کیا اور کچھ عرصہ امیر اللہ تسلیم سے بھی اصلاح لی۔ مین پوری کی رہنے والی دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن سے اصغر نے نکاح کیا اور چھوٹی بہن سے جگر نے۔ جگر تھوڑے ہی دنوں میں اپنی لاابالی طبیعت کی بنا پر بے نیاز ہو گئے۔ ایک عرصہ دراز تک بیوی کی کوئی خبر نہ لی۔ اصغر نے ان پر زور دیا کہ وہ اسے آزاد کر دیں۔ چناں چہ جگر نے اسے طلاق دے دی۔ چند ہی دنوں کے بعد نسیم کے اندر ایسے امراض پیدا ہو گئے کہ اگر اس کی شادی نہ کی جاتی تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ چناں چہ اصغر نے یہ ایثار کیا کہ بڑی بہن کو طلاق دے کر چھوٹی بہن نسیم (مطلقہ جگر) سے نکاح کر لیا اور بڑی بہن کو سالی کی حثیت سے اپنے پاس رکھ لیا۔ جب اصغر کا انتقال ہو گیا تو جگر کے دل میں اپنی پرانی بیوی کی محبت نے کروٹیں لینا شروع کیا۔ چناں چہ جگر نے اپنی مطلقہ بیوی سے دوبارہ نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ آمادہ ہو گئی، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جگر شراب چھوڑ دیں۔ جگر نے شراب چھوڑنے کا وعدہ کیا اور اپنی پرانی بیوی سے ہمکنار ہو گئے۔ یہ رشتہ اخیر دم تک قائم رہا۔

جگر صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ مختلف اضلاع میں گزرا۔ ان کا پیشہ چشموں کی تجارت تھا۔ اصغر گونڈوی کی صحبت نے جگر کی شاعری کو بہت جلا بخشی۔ جگر مشاعروں کے بہت کامیاب شاعر تھے۔ ان کا ترنم بہت اچھا تھا۔

بحیثیت انسان وہ نہایت شریف واقع ہوئے تھے۔ بھارتی حکومت نے انھیں ''پدما بھوشن'' خطاب دیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے جگر کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ ان کے آخری مجموعہ کلام ''آتشِ گل'' پر ان کو ساہتیہ اکیڈمی سے انھیں پانچ ہزار روپیہ کا انعام ملا۔ اور دو سو روپیہ ماہ نامہ وظیفہ مقرر ہوا۔ ''آتشِ گل'' کے علاوہ ''داغِ جگر'' اور ''شعلۂ طور'' ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔

شراب ترک کرنے کے بعد ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ وہ مستقل طور پر گونڈہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اور روز بروز ان کی حالت خراب ہوتی گئی۔ دل کی حرکت بند ہونے کی وجہ سے ۹ رستمبر ۱۹۶۰ء کو تقریباً صبح ۶ بجے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے انتقال کی خبر جنگل کے آگ کے مانند تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ اُس دن مقامی دفاتر دن کو ایک بجے بند کر دیے گئے۔ جنازے میں ۶۔۵ ہزار آدمی شریک تھے۔

> گذشتہ نصف صدی کے اندر جن ممتاز غزل گویوں کے نام بے تکلف زبان پر آتے ہیں ان میں جگر کی حیثیت کافی ممتاز ہے۔ جگر کے ہاں جذبے کی شدت ہے اس لیے تخیل کی کمی۔ جگر کے ہاں محبوب کے جذبات واحساسات کی بھی ترجمانی ملتی ہے۔ (رشید احمد صدیقی)
>
> جگر خالص غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے ہاں رنگینی، سوز و گداز، جوش وولولہ، عجز وفتادگی، بیخودی وسرشاری سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

کچھ ہم کو نہیں کام، جگرؔ! اور کسی سے — کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ

تُو نے سُو سُو رنگ سے پردا کیا — دیکھنے والا تجھے دیکھا کیا

اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی — جس طرف دیکھا کیا، دیکھا کیا

نگاہوں سے چُھپ کر کہاں جایئے گا — جہاں جایئے گا، ہمیں پایئے گا

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل — کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا؟

بھلانا ہمارا مبارک، مبارک! — مگر شرط یہ ہے، نہ یاد آیئے گا

دونوں جہاں تو اپنی جگہ پر ہیں برقرار — کیا چیز تھی کہ جس کو مرا دل بنا دیا

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں — ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا

کوچۂ عشق میں نکل آیا — جس کو خانہ خراب ہونا تھا

یہ کیا مقامِ عشق ہے ظالم کہ ان دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آ گیا

احباب مجھ سے قطع تعلّق کریں جگرؔ
اب آفتابِ زیست لبِ بام آ گیا

ترا ملنا، ترا نہیں ملنا
اور جنت ہے کیا؟ جہنم کیا؟

موت کی نیند چھائی جاتی ہے
کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا؟

کرشمہ سازیٔ حُسنِ ازل ارے توبہ!
مرا ہی آئینہ مجھ کو دکھا کے لوٹ لیا

مانا غرورِ عشق بھی اک چیز ہے، مگر
اتنے بھی دور دور ترے آستاں سے کیا

صیّاد برق ہی کی توجہ نہیں، تو پھر
مجھ کو حصولِ خار و خس آشیاں سے کیا

کیا کم ہے یہ کہ نسبتِ کامل نصیب ہے
انعام سجدہ اور ترے آستاں سے کیا

بھلا دیا ہمیں تُو نے تو رنج کیا، لیکن
ہمیں بھی تیری محبت کو بھول جانا تھا

موت کیا؟ ایک لفظِ بے معنی
جس کو مارا، حیات نے مارا

سب کو مارا جگرؔ کے شعروں نے
اور جگرؔ کو شراب نے مارا

چمن تو برقِ حوادث سے ہو گیا محفوظ
مری بلا سے اگر میرا آشیاں نہ رہا

دریا کی زندگی پر صدقے ہزار جائیں
مجھ کو نہیں گوارا ساحل کی موت مرنا

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

مدّت ہوئی اک حادثۂ عشق کو، لیکن
اب تک ہے، مگر دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتا آپ بتاؤں
کیجیے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

اتنے حجابوں پر تو یہ عالم ہے حُسن کا
کیا حال ہو جو دیکھ لیں پردہ اُٹھا کے ہم

نویدِ بخششِ عصیاں سے شرمسار نہ کر
گناہگار کو یارب گناہگار نہ کر

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصلِ بہار پر

ہجومِ تجلّی سے معمور ہو کر
نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر

مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر
بہت پاس نکلے، بہت دُور ہو کر

فروغِ بادہ ترے حُسن کا جواب ہوا
سنبھالنا مجھے ساقی! میں بے نقاب ہوا

عرضِ شوق پر میری پہلے کچھ عتاب اُن کا
خاص اک ادا کے ساتھ اُف وہ پھر حجاب اُن کا

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے، گوشۂ نقاب اُن کا

جیسے حُسن کی دیوی جھانکتی ہو چلمن سے | نیم واسی آنکھوں میں اُف وہ کیفِ خواب اُن کا

کوئی حسیں حسیں ہی ٹھہرتا نہیں جگر | باز آئے اِس بلندیٔ ذوقِ نظر سے ہم

ورنہ کیا تھا صرف ترتیب عناصر کے سوا | خاص کچھ بے تابیوں کا نام انساں ہوگیا

مسرّت زندگی کا دوسرا نام | مسرّت کی تمنا مستقل غم

ہر چند کائنات دو عالم میں اے جگر | انساں ہی ایک چیز ہے، انساں، مگر کہاں؟

کیا بتاؤں کس قدر زنجیر پا ثابت ہوئے | چند تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

آتشِ عشق وہ جہنم ہے | جس میں فردوس کے نظارے ہیں

کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر | کون چھڑائے اپنا دامن

برقِ حوادث اللہ اللہ! | جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن

آدمی کے پاس سب کچھ ہے، مگر | ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

گلشن پرست ہوں، مجھے گل ہی نہیں عزیز | کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر | جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

آ کہ تجھ بن اِس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں | جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم، میری فطرت اضطراب | کوئی منزل ہو، مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

آسودۂ ساحل تُو ہے، مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں | ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

جنونِ محبت یہاں تک تو پہنچا | کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں

پہلے شرابِ زیست تھی اب زیست ہے شراب | کوئی پلا رہا ہے پیے جا رہا ہوں میں

اب کہاں انساں جسے انساں کہیں | چلتی پھرتی دیکھ لو پرچھائیاں

بھڑکا رہا ہوں آتشِ عصیاں ہر ایک سمت | پھیلا رہا ہوں رحمتِ پروردگار کو

قدم ذرا جو ہٹے جادۂ وفا سے کہیں | ہر ایک ذرّہ پکارا کہ دیکھتا ہوں میں

وہ ہزار دشمن جاں سہی، مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے | جسے خاکِ پا تری چھوگئی، وہ بُرا بھی ہوتو بُرا نہیں

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں | فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

کیوں مست وشرابِ عیش وطرب، تکلیف توجہ فرمائیں | آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے، آوازِ شکستِ جام نہیں

اک جامِ آخری تو پینا ہے اور ساقی! | اب دستِ شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں

اک خطا پر سزائے بے میعاد
ہائے تقدیر ابنِ آدم کی

یہ مرا پیام کہنا تُو صبا مؤدّبانہ
کہ گزر گیا ہے پیارے تجھے دیکھے اک زمانہ

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہیے بہانہ

ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے، تم کیا کرو ہم کیا کریں

ہوگئی دل کو تری یاد سے اک نسبتِ خاص
اب تو شاید ہی میسّر کبھی تنہائی ہو

وفا کا نام کوئی بھول کر نہیں لیتا
ترے خلوص نے چونکا دیا زمانے کو

آنسوؤں کی کمی نہیں، لیکن
کچھ سبب تھا کہ آنکھ تر نہ ہوئی

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح وشام ہی نہ ہوئی

آئی جب اُن کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

کُل ہستیِ عالم پر طاری ہیں صفات اس کے
سب کہنے کی باتیں ہیں مختاری و مجبوری

محبت میں ہم تو جیے ہیں، جییں گے
وہ ہوں گے کوئی اَور مر جانے والے

ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اُٹھاؤ، بدل دو فضا زمانے کی

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی
نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

آئینہ چوم چوم رہے تھے وہ بار بار
دیکھا جو یک بہ یک مجھے، شرما کے رہ گئے

وہ بھی ہے اک مقامِ عشق جہاں
ہر تمنّا گناہ ہوتی ہے

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

دل گیا، رونقِ حیات گئی
غم گیا، ساری کائنات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں، لیکن
اِک مسیحا نفس کی بات گئی

خاکِ منزل کو مُنہ سے ملتا ہوں
یادگارِ شکستہ پائی ہے

اُس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے
بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے

یہ مصرع کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو، مرنے کے لیے تیّار ہو جائے

سنا ہے، حشر میں ہر آنکھ اُسے بے پردہ دیکھے گی
مجھے ڈر ہے نہ توہینِ جمالِ یار ہو جائے

حدودِ کوچۂ محبوب ہیں وہیں سے شروع
جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگائے ہوئے

بس ایک سمت اُڑا جا رہا ہوں وحشت میں
خبر نہیں کہ خودی کیا ہے بے خودی کیا ہے

لبوں پہ موجِ تبسم، نگہ میں برقِ غضب
کوئی بتائے یہ انداز برہمی کیا ہے

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حُسن
جب دیکھیے اک نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

یوں تو ساقی ہر طرح کی تیرے مَے خانے میں ہے
وہ بھی تھوڑی سی جو ان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

حُسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے، مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جانے میں ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

ازل ہی سے چمن بندِ محبت
یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے

کلی کوئی جہاں پہ کھل رہی ہے
وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے

معراجِ شوق کہیے یا حاصلِ تصور
جس سمت دیکھتا ہوں تو مسکرا رہا ہے

اُن کی وہ آمد آمد، اپنا یہاں یہ عالم
اک رنگ آ رہا ہے، اک رنگ جا رہا ہے

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے

خوب رو لے فراق میں اے دل
کچھ طبیعت سنبھل ہی جاتی ہے

لٹا دے دولتِ کونین میرے لیے
بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دے

انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم!
پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

اپنے حدود سے نہ بڑھے کوئی عشق میں
جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

اے محتسب نہ پھینک، مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

مانوس اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے
اب ہر خطائے شوق اُسی کا جواب ہے

سمجھے تھے تجھ سے دور نکل جائیں گے کہیں
دیکھا تو ہر مقام تری رہ گذر میں ہے

صیّاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں
اک لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں
کچھ خوشی بھی ہے، کچھ ملال بھی ہے

بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی، مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے

مجھے تھا شکوۂ ہجراں کہ یہ ہوا محسوس
مرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گزرے

اک لفظ محبت کا ادنا یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے

ہم عشق کے ماروں کا اِتنا ہی فسانہ ہے
رونے کو نہیں کوئی، ہنسنے کو زمانہ ہے

آنکھوں میں نمی سی ہے، چُپ چُپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں، نازک سا فسانہ ہے

یا وہ تھے خفا ہم سے، یا ہم ہیں خفا اُن سے
کل اُن کا زمانہ تھا، آج اپنا زمانہ ہے

یہ عشق نہیں آساں، اِتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اِنھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹّی میں ملا ظالم
پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللّٰہ اللّٰہ
سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

ہم سے نظر پھیر لی اس شوخ نے
ہم بھی ہیں انسان خفا ہو گئے

حُسن جس رنگ میں ہوتا ہے، جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لیے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

ہائے وہ سلسلۂ اشک کہ جو تیرے حضور
دل میں رکتا ہے، نہ آنکھوں سے رواں ہوتا ہے

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل، مگر کم کسی سے ملتا ہے

کمال حُسن کا دکھلا دیا تُو نے
چراغ سامنے رکھ کر بجھا دیا تُو نے

کس طرف جاؤں، کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں
اے ہجومِ نامرادی جی بہت گھبرائے ہے

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قدِ بالا، وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں، تمام رنگیں بنا رہے ہیں

بندگی جس کی ہے فقط رونا
وہ ہمارا خدا ہے کیا کہیے

محبت اثر کرتی ہے چپکے چپکے
محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں

قدم ڈگمگائے، نظر بہکی بہکی
جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں
ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

شروعِ راہِ محبت، ارے معاذ اللّٰہ!
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

محوِ تسبیح تو سب ہیں، مگر ادراک کہاں
بندگی خود ہی عبادت ہے، مگر ہوش نہیں

شاعر ہے محوِ فطرت، جذبات چھا رہے ہیں
پیغام جا رہے ہیں، پیغام آ رہے ہیں

ساون کی رین اندھیری، تنہائیوں کا عالم　　بھولے ہوئے فسانے سب یاد آ رہے ہیں

اس عشق کی تلافیِ مافات دیکھنا　　رونے کی حسرتیں ہیں، جب آنسو نہیں رہے

پی رہا ہوں آنکھوں آنکھوں میں شراب　　اب نہ شیشہ ہے، نہ کوئی جام ہے

پھر وہ ہم سے خفا ہے، کیا کہیے　　زندگی بے حیا ہے، کیا کہیے

چاندنی ہے، ہوا ہے، کیا کہیے　　مفلسی کیا بلا ہے، کیا کہیے

سینۂ نَے پہ جو گزرتی ہے　　وہ لبِ نَے نواز کیا جانے

مرا عشق زندہ، مرا عزم راسخ　　مجھے شکوۂ ناتوانی نہیں ہے

ایک تجلّی، ایک تبسّم، ایک نگاہ بندہ نواز　　اس سے زیادہ اے غمِ جاناں! دل کی قیمت کیا کہیے

رہائی ہو نہیں سکتی کبھی قیدِ تعلّق سے　　جو اک زنجیر ٹوٹی، دوسری زنجیر دیکھیں گے

اِتنے حجابوں پر تو یہ عالم ہے حُسن کا　　کیا حال ہو جو دیکھ لیں پردہ اُٹھا کے ہم

کس ادا پر جان دوں، تُو ہی بتا اے چشمِ یار!　　جس ادا کو دیکھتا ہوں، حُسن کی تصویر ہے

رنگِ حیا ہے یہ ترے جوشِ شباب میں　　یا چاندنی کا پھول کھلا ہے گلاب میں

ندرت میرٹھی

نام شعیب احمد، ندرت تخلّص۔ ۱۸۸۸ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما ہوئی۔ عربی، فارسی، صرف و نحو، ادب، معقول، فلسفہ، فقہ اور احادیث کی تعلیم حاصل کی۔ میرٹھ میں نہایت شان دار مشاعرے ہوتے تھے۔ ان مشاعروں کی شرکت نے انھیں شعر گوئی کی طرف مائل کر دیا۔ اصلاح اپنے والد سے لیتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں ایک ادبی رسالہ ''عندلیب'' میرٹھ سے جاری کیا۔ یہ رسالہ بعض مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اس کے بعد رسالہ ''نظارہ'' جناب حمید میرٹھی کی ملکیت میں میرٹھ سے جاری ہوا۔ یہ اس کے عملہ ادارت میں مدّت تک کام کرتے رہے۔ بعد ازاں محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم رئیس جہانگر آباد، سابق سکریٹری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کُلّیات خسرو کے عملہ تصحیح میں شامل کر لیا۔ ۱۹۲۳ء میں اپنا ذاتی اخبار (ہفتہ وار) ''آئینہ'' میرٹھ سے جاری کیا۔ آپ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی پَے بہ پَے آپ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ندرت میرٹھی کی زندگی بے کیف ہو گئی اور وہ ۲۳؍جون ۱۹۵۴ء کو میرٹھ میں انتقال کر گئے۔ آپ کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''خونابۂ دل'' (دو حصّوں میں)، ''لوح و قلم''، ''صحیفۂ ندرت''، ''تار ہائے نفس''۔

منتخب اشعار

ہمارے چاکِ گریباں میں کوئی بات تو ہے — کہ دیکھ دیکھ کے وہ مسکرائے جاتے ہیں

قفس میں کوئی اذیت نہیں مجھے صیّاد — بس ایک حشر بپا بال و پر میں رہتا ہے

ہم چھوٹ کر قفس سے چمن کو چلے تو ہیں — شاید ہی آشیاں کی جگہ آشیاں ملے

یا زندگی ہی کام کی ہم کو ملی نہ تھی — یا کام ہی لیا نہ گیا زندگی سے کچھ

اُٹھتا نہیں نظر سے جب تک حجابِ ہستی — کھلتا نہیں کسی پر سربستہ راز تیرا

فکر، ابن الحسن

نام ابن الحسن، فکر تخلّص۔ تاریخی نام محمد نظیر احمد۔ ۸۸۔۱۸۸۷ء میں شاہ آباد (آرہ، بہار) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں پٹنہ کالج سے بی اے کیا۔ ۱۹۱۲ء میں پریسیڈنسی کالج، کلکتہ سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ شعر و سخن کا شوق اوائلِ عمر سے تھا۔ پہلے اپنے پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد اسماعیل مہر آروی سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد بدر آروی کے شاگرد ہو گئے۔ ڈرامہ نویسی کا خاص ملکہ تھا اور اس فن میں انھیں تمغا بھی ملا۔ فن موسیقی کا بھی اعلا نداق تھا۔ پٹنہ سکریٹریٹ میں محافظ دفتر کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۵۰ء میں انتقال کر گئے۔ ان کا یہ شعر دیکھیے:

تصویر تیری دیکھ کے، رونا وہ ہجر میں
رونے کے بعد پھر تری تصویر دیکھنا

رواں، جگت موہن لال

نام جگت موہن لال، رواں تخلّص۔ ۱۴؍جنوری ۱۸۸۹ء کو قصبہ مورانواں، ضلع سیتاپور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم اناو کے مکتب میں مولوی سبحان خاں سے پائی۔ انٹرنس درجہ اوّل میں پاس کیا۔ ایف اے، بی اے کیننگ کالج، لکھنؤ سے پاس کیا اور کالج میں اوّل آئے۔ ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں بھی حاصل کی۔ پیشہ اڈووکیٹ، اناو (اودھ)۔ عزیز لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ رباعیات کہنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ قدیم عمارتوں کے دیکھنے کا خاص شوق تھا۔ ۲۶؍ستمبر ۱۹۳۴ء کو اناو میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

اب چمن میں بھی کسی صورت سے جی لگتا نہیں — ہاں، مگر جب تک قفس میں تھے، قفس بدنام تھا

پیہم دیے وہ رنج کہ انساں بنا دیا منّت پذیر ہوں ستمِ روزگار کا

وہ عرضِ حال میں شکووں پہ معترض ہیں عبث میں کیا کروں یہی سرخی ہے اس فسانے کی

ہادی مچھلی شہری

نام سیّد محمد ہادی، تخلّص ہادی۔ تقریباً ۱۸۹۰ء میں مچھلی شہر، ضلع جون پور میں پیدا ہوئے۔ فارسی وعربی کے صرف ونحو کی تعلیم مچھلی شہر میں حاصل کی۔ بعدازاں علی گڑھ سے بی اے، ایل ایل بی کی سندیں حاصل کیں۔ تقریباً ۱۵ سال علی گڑھ میں وکالت کرنے کے بعد الہ آباد منتقل ہو گئے اور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آ گئے۔ ہادی مچھلی شہری کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد سیّد عبدالرزاق غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے نام کے اکثر خطوط مکتوبات غالب کے مجلدات میں موجود ہیں۔ ہادی مچھلی شہری کی باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ انھوں نے کسی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ البتہ شروع میں چند غزلیں جلیل مانک پوری کو دکھائیں۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام اس زمانے کے رسائل وجرائد میں چھپتا رہا۔ ۲۵؍اکتوبر ۱۹۶۱ء کو کراچی میں دمہ کا شدید حملہ ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''صدائے دل''، ''نوائے دل''۔

منتخب اشعار

اُس نے اِس انداز سے دیکھا مجھے زندگی بھر کا گِلہ جاتا رہا

خندۂ صبح پر بہت موسم گل کو ہے غرور تم بھی نگاہ ناز سے دیکھ کے مسکرا تو دو

دل سے تری یادوں کو نسبت ہے فقط اتنی موجیں ہیں کہ ٹکرا کر رہ جاتی ہیں ساحل سے

دل جس کو ہم سمجھتے تھے سرمایۂ حیات ٹوٹا ہوا شراب تمنا کا جام ہے

فرصتِ دید اور جلوہ بے نقاب اے نگاہِ شوق اب کیا چاہیے

سَو باتیں نئی دل نے مصیبت کی سنا دیں ہم قصہ ماضی کو بھلانے میں لگے تھے

وقت ایسا بھی ترے شوق میں ہم پر آیا سر اُٹھانے بھی نہ پائے تھے کہ پتھر آیا

اب یہ تقدیر کی ہے بات کہ چھلکے یا رہے یہی کیا کم ہے مرے ہاتھ میں ساغر آیا

جگر بریلوی

والدین نے نام شیام موہن رکھا تھا جسے بعد کو جگر بریلوی نے خفیف سی تبدیلی کر کے شیام موہن لال کر دیا۔ ان کا تخلص جگر تھا۔ یکم جنوری ۱۸۹۰ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ چند سال کی نجی تعلیم کے بعد بریلی کے ایک اسکول سے ۱۹۱۱ء میں دسویں جماعت کی سند لی۔ ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج سے بی اے پاس کیا۔ سب سے پہلے مقامی مشن اسکول میں مدرس ہو گئے۔ سال بھر بعد مئی ۱۹۱۸ء میں نائب تحصیل دار منتخب ہو گئے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے پانچ سال قبل پنشن ہو گئی۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں ایک مقامی انٹر کالج میں ساٹھ روپیہ ماہانہ پر پڑھانے کی عارضی ملازمت مل گئی۔ جون ۱۹۵۲ء میں اپنے بڑے بیٹے کے پاس میرٹھ آ گئے۔ ۴؍ مارچ ۱۹۷۶ء کو سہ پہر دل کا دورہ پڑا اور اسی شب ساڑھے گیارہ بجے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

جگر بریلوی کے دادا، نانا اور والد شاعر تھے۔ گویا شاعری جگر بریلوی کو ورثے میں ملی۔ شروع میں اپنے والد سے مشورہ سخن کیا۔ والد کا تخلص ''دل'' تھا اور بیٹے کا جگر۔ مختلف اوقات میں سوہن لال حقیر شاہجہان پوری، جلیل مانک پوری، شوکت میرٹھی، شوق قدوائی، عزیز لکھنوی اور یگانہ چنگیزی سے تلمذ حاصل رہا۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۹۶۰ء میں انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا۔ ان کی چند دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''پپیہا اور پی کہاں''، ''حدیثِ خودی'' (خودنوشت سوانح عمری)، ''یادگارِ نظر'' (منشی نوبت رائے نظر کی سوانح اور کلام پر تنقید)۔

منتخب اشعار

نہ پوچھو زندگی کس طرح گزری — میں ہر ہر سانس پر رو رو دیا ہوں

کسی کو دیکھ لیتے ہیں جو روتے — یہی دل چاہتا ہے ہم بھی رو لیں

سمایا جاتا ہو جیسے کوئی رگ رگ میں دل بن کر — یوں ہی غم میں کوئی شے اور بھی محسوس ہوتی ہے

اور سب کچھ ہوا زمانے میں — ہم جو چاہا کیے وہی نہ ہوا

ہونے لگی قدر زندگی کی — جب عمرِ عزیز کھو چکے ہم

آج کیا جانے کیا ہے ہونے کو — ''جی بہت چاہتا ہے رونے کو''(۱)

(۱) یہ شعر کسی نامعلوم شاعر کا اس طرح مشہور ہے:

ہے کوئی بات آج ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

اشک رام پوری

نام صاحبزادہ سیّد واجد علی خاں عرف اچھن صاحب، تخلّص اشک۔ تلمیذ محمود رام پوری۔ ۱۸۹۷ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ اچھن صاحب نواب یوسف علی خاں ناظم، والیٔ رام پور کے نواسے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اچھن صاحب کو اعظم الدّین میموریل ہائی اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ اِس اسکول کے ہیڈ ماسٹر اس وقت محمد علی جوہر تھے۔ یہ اچھن صاحب کے پرائیوٹ ٹیوٹر بھی تھے۔ ۱۹۱۴ء میں اشک رام پوری فارغ التحصیل ہوکر انجینئرنگ کی اعلا تعلیم کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ انگلینڈ سے جرمنی گئے اور جرنلزم کو ذریعہ معاش بنا کر برلن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جرمنی میں چھ سال گزار کر رام پور واپس آ گئے۔ ۱۹۳۰ء میں اچھن صاحب ریاست کے حلقہ ملازمت میں آ گئے۔ اختلافِ رائے کے سبب ان کو ریاست کی ملازمت سے سبک دوش ہونا پڑا۔ انھوں نے حضرت شاہ غلام محی الدّین سجادہ نشین پیر مہر علی شاہ سے بیعت کر لی اور غالباً ۱۹۴۶ء میں وہ گولڑا، ضلع راولپنڈی میں اپنے پیرو مرشد کے پاس آ گئے اور باقی عمر وہیں گزار دی۔ ۲۸/اگست ۱۹۵۸ء کو راولپنڈی میں وفات پا گئے۔ تدفین گولڑہ شریف میں ہوئی۔ ''رنگِ اشک'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ چھپ گیا ہے۔

منتخب اشعار

شکوۂ جور سے خود مجھ کو ندامت ہوئی — وہ تو کہیے کہ وہ شوخ پشیماں نہ ہوا

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہگذر کہیں — پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھیے — میری نظر کہیں ہے تو ان کی نظر کہیں

اک زمانہ ہو گیا گو شغلِ مے چھوٹے ہوئے — جی بھر آیا دیکھ کر جام و سبو ٹوٹے ہوئے

میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ — آپ للہ چلے جائیے مے خانے سے

خدا ملے گا تو خود سے ملے گا اے زاہد! — دعا یہ مانگ تجھے کوئی آدمی مِل جائے

سکون موت کے پردے میں ڈھونڈنے والے — فنا کے بعد یہی زندگی نہ مِل جائے

جو دم بھرتے تھے سوتے جاگتے مہر و محبت کا — اب اُن سے اور ہم سے دُور کی صاحب سلامت ہے

تسلّی کو بس چاہیے اِک بہانہ — کرو تو سہی عہد، پھر بھول جانا

ہاتھ رکھ کر جو وہ پوچھیں دلِ بے تاب کا حال — ہو بھی آرام تو کہہ دوں، مجھے آرام نہیں

نیّر اکبرآبادی

نام سیّد اسماعیل حسین، نیّر تخلص۔ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ اکبرآباد ان کا وطن تھا۔ والد کا سایہ عین عنفوانِ شباب میں سر سے اُٹھ گیا اور یوں تکمیل تعلیم سے محروم ہونا پڑا۔ شاعری کی طرف طبیعت ابتدا سے مائل تھی۔ شروع میں کچھ غزلیں سخاوت علی شوخ اکبرآبادی کو دکھائیں۔ علاّمہ سیماب اکبرآبادی سے علاوہ ہم وطنی کے بڑی قربت تھی۔ غازی آباد ایک چھوٹا سا قصبہ دلّی کے قریب ہے، وہاں گیارہ سال بہ سلسلہ ملازمت قیام رہا۔ اس کے بعد کلکتہ میں بھی ایک سال رہے۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء میں پاکستان آ گئے۔ نیّر اکبرآبادی مہر اکبرآبادی اور نیساں اکبرآبادی کے والد تھے۔ ۴؍جون ۱۹۶۸ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

ڈر تھا یہی کہ ہو نہ جائے ضبط جنوں میں منتقل
خیر ہوئی کہ آپ نے ہنس کے مجھے رُلا دیا

سنا رہے ہیں فسانہ وہ یوں جوانی کا
ہمارا جیسے کبھی عالمِ شباب نہ تھا

ابھی کے دن ہوئے اُجڑے ہوئے میرے نشیمن کو
ابھی پہچانتا ہے مجھ کو ہر پتّا گلستاں کا

ٹھکانہ رہنے کو مِل ہی گیا بہر صورت
قفس بنا جو مرا آشیاں خراب ہوا

اب آگے کھیل مقدّر رہے آب و دانے کا
قفس میں خواب تو دیکھا ہے آشیانے کا

فقط پھولوں کی رنگینی چمن میں دیکھنے والے
بلا کا حُسن کانٹوں پر بھی ہوتا ہے جوانی میں

حدودِ سعیٔ طلب سے گزر گیا ہوں میں
وہ مِل گئے ہیں، مگر ان کو ڈھونڈتا ہوں میں

پسینا پھولوں کو نیّر چمن میں آتا ہے
نگاہ بھر کے جو کانٹوں کو دیکھتا ہوں میں

طے ہو سکیں نہ جب کہ محبت کی منزلیں
گھبرا کے میں نے راہِ جنوں اختیار کی

دیا ہوا ہے غم اُن کا چھُپائے جاتے ہیں
مگر یہ آنکھوں سے آنسو جو آئے جاتے ہیں

مری آنکھوں میں آنسو آ گئے تم درگزر کر دو
قسم لے لو کہ میں واقف نہ تھا آدابِ محفل سے

مسافر راہِ الفت کے ہٹا کانٹوں کو، بڑھ آگے
جو پیچھے آ رہے ہیں ان کی خاطر راستہ کر دے

چمن میں جا کے نیّر پھول تو دنیا ہی چنتی ہے
مجھے دیکھو کہ چن کر خار لایا ہوں گلستاں سے

کانٹوں سے پوچھ عشق کے ذوقِ سلیم کو
جو چبھ گیا اسی کو رگِ جاں بنا لیا

وہ ایک تم تمھیں پھولوں پہ بھی نہ آئی نیند
وہ ایک میں مجھے کانٹوں پر اضطراب نہ تھا

جگر گورکھ پوری

نام منشی رنگ بہادر لعل، تخلص جگر۔ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ وطن گورکھ پور تھا۔ وکالت کے پیشے سے منسلک تھے۔ ۲۸/ جون ۱۹۳۸ء کو انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

کیوں بڑھ رہے ہیں سُوئے گریباں ہمارے ہاتھ ۔۔۔ کیا آ گیا قریب زمانہ بہار کا؟

کلیاں چٹک کے پھول بنیں اور مٹ گئیں ۔۔۔ کس درجہ مختصر ہے زمانہ بہار کا

سُہا، سیّد ممتاز حسن

نام سیّد ممتاز حسن مجدّدی، سُہا تخلص۔ ۹/ فروری ۱۸۹۲ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ بلند شہر ان کا وطن تھا۔ ان کا قد صرف تین فٹ تھا جسے دیکھ کر لوگ اکثر مذاق اُڑاتے تھے۔ ۲۷/ دسمبر ۱۹۴۷ء کو بھوپال میں انتقال کر گئے۔ ''مطالب الغالب'' مرزا غالب کے اردو دیوان کی شرح ان کی مشہور کتاب ہے۔

منتخب اشعار

آئے تھے ابھی ہو کے پشیمان جہاں سے ۔۔۔ پھر دل کا تقاضا ہے کہ اک بار وہیں اور

یہ بجا کہ خلوتِ دل میں ہے تُو ہزار رنگ سے جلوہ گر ۔۔۔ ذرا آ کے سامنے بیٹھ جا کہ نظر کو خوئے مجاز ہے

تاجور نجیب آبادی

نام احسان اللہ خاں، تاجور تخلص۔ ۲/ مئی ۱۸۹۳ء کو نینی تال، بھارت میں پیدا ہوئے۔ وطن نجیب آباد (یوپی) تھا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے وطن نجیب آباد میں حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند گئے اور اگست ۱۹۱۴ء میں درس نظامیہ کی تکمیل کر کے لاہور آ گئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۵ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۱۶ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۶ء میں رسالہ ''مخزن'' کے اڈیٹر بنے۔ ۱۹۲۱ء میں دیال سنگھ کالج، لاہور میں فارسی اور اردو کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اسی سال رسالہ ''ہمایوں'' کے معاون مدیر کے فرائض سنبھالے۔ ۱۹۲۹ء میں رسالہ ''ادبی دنیا'' اور ۱۹۳۴ء میں رسالہ ''شاہکار'' جاری کیا۔ 'اردو مرکز' کے نام سے ایک ادارہ تصنیف و تالیف کا بھی قائم کیا۔ ۳۰/ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کا ایک مجموعہ اشعار گُم ہو گیا۔ اس مجموعے کے گُم

ہو جانے سے ان کی ہمّت کم ہو گئی اور پھر کبھی انھوں نے اپنے کلام کی فراہمی کی جانب توجہ نہ کی۔

منتخب اشعار

بس اتنی داد دینا بعد میرے میری الفت کی — کہ یاد آؤں تو اپنے آپ کو تم پیار کر لینا
سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا — الٰہی! ساری دُنیا کو میں کیوں کر راز داں کر لوں
اُف وہ نظر کہ سب کے لیے دل نواز ہے — میری طرف اُٹھی ہے تو تلوار ہو گئی
یہ کیسا خواب دیکھا ہے قفس میں — الٰہی! خیر میرے آشیاں کی
غم کی تنہائی میں جب وہ خوابِ حسیں یاد آتا ہے — یوں ہی بیٹھے بیٹھے دل کو جانے کیا ہو جاتا ہے
یہ ستم قیدِ قفس میں صیّاد! — کس نے پوچھا تھا، بہار آئی ہے؟

رشید رام پوری

نام رشید احمد خاں، رشید تخلص۔ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ وطن مالوف رام پور تھا۔ عربی، فارسی فقہ، حدیث کی تعلیم کے بعد طبّی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ بعد ازاں محکمۂ ایکسائز میں ملازم ہو گئے اور لکھنؤ، اُناؤ، کان پور اور دوسرے شہروں میں تعینات رہے۔ چند سال میونسپل بورڈ، رام پور میں بھی ملازم رہے۔ حصولِ علم اور ملازمت کے سلسلے میں تقریباً ۲۲ سال لکھنؤ میں قیام رہا۔ رشید رام پوری، محمود رام پوری (تلمیذِ داغ) کے بھتیجے تھے اور انھی کے شاگرد تھے۔ رشید صاحب جملہ اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ تاریخ گوئی میں انھیں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ تقریباً ۲۰ غیر مطبوعہ اور ۱۵ مطبوعہ کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ۱۸ اپریل ۱۹۶۴ء کو انتقال ہوا اور رام پور میں سپردِ خاک ہوئے۔

منتخب اشعار

شوق تھا غیر سے محبت کا — کہیے کیا حال ہے طبیعت کا؟
ہیں بے شمار جُرم تو کچھ اس کا غم نہیں — مجرم کے پاس اشکِ ندامت بھی کم نہیں

اثر، رام پوری

نام محمد علی خاں، تخلص اثر۔ ۱۸۹۲ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ جلیل مانک پوری اور آرزو لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۶۳ء کو رام پور میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

بن کے سائل بھی نہ نکلا کچھ کام — در پہ پہنچا تو صدا بھول گیا

ایسے کانٹوں کا پوچھنا کیا ہے — جن پہ پھولوں کو نیند آئی ہے

کارواں آگے جارہا ہے تو جائے — میری منزل شکستہ پائی ہے

بہ کوشش جذبۂ اُلفت کبھی پیدا نہیں ہوتی — یہ آتش خود بھڑک اُٹھتی ہے، بھڑکائی نہیں جاتی

آسی الدنی

نام عبدالباری، آسی تخلّص۔ پہلا تخلّص عاصی۔ ۱۸۹۳ء میں الدن، تحصیل ہاپوڑ، ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا محمد حسن محدث دیوبندی سے بھی بعض کتب حدیث وفقہ کا استفادہ کیا۔ ۱۹۰۸ء میں دہلی میں حکیم نواب جان سے کتب طب پڑھیں اوران کے مطب میں نسخہ نویسی بھی کرتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں شاہجہاں پور میں دوبرس تک فارسی پڑھانے پر مامور رہے۔ ۱۹۱۲ء میں دفتر اخبار ''ہمدرد'' دہلی میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں ناطق گلاوٹھی کے شاگرد ہوئے۔ ناطق نے سب سے پہلے ان کے تخلّص میں اصلاح فرمائی یعنی ''عاصی'' کے بجائے ''آسی'' تجویز کیا۔ دسمبر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ چلے آئے اور مستقل سکونت یہیں اختیار کی۔ انھوں نے دوغزلوں پر براہ راست داغ سے بھی اصلاح لی تھی۔ آسی نے تمام صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کی تصانیف کی تعداد تیس سے زیادہ ہے۔ شرح دیوانِ غالب، ترجمہ وشرح دیوانِ حافظ، شرح تحفۃ الحراقین، لغتِ اردو، تذکرہ خندۂ گل (ظریف شاعروں کا تذکرہ) ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ شعراء کی کافی تعداد نے آپ سے کسب فن کیا۔ ان میں شوکت تھانوی، شہید بدایونی، مجروح سلطان پوری قابل ذکر ہیں۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۴۶ء کو آسی الدنی لکھنؤ میں اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔

منتخب اشعار

جہاں ہم کو قصہ سنانا پڑا — وہیں ہم کو رونا رلانا پڑا

بڑا دکھ دیا گردشِ چرخ نے — کہ احباب کو آزمانا پڑا

جب چمن میں کچھ انقلاب ہوا — اک نہ اک آشیاں خراب ہوا

ترا کفر معلوم ہے مجھ کو آسی — ارے تو بھلا کیا مسلمان ہوگا

یہ کچھ نہیں کھلا کہ جلی شمع کس لیے — اتنا سنا کہ خاک میں پروانہ مل گیا

آسی نے ہم کو حال سنایا تھا، اپنا رات | اُس خانماں خراب کی باتیں بھی خوب ہیں

اب میں کیا تم سے اپنا حال کہوں | بخدا یاد بھی نہیں مجھ کو

یہ سب فریب ہے نظرِ امتیاز کا | دُنیا میں ورنہ کوئی بھی اچھا بُرا نہیں

پھول ہنس ہنس کر دکھاتے ہیں جہاں کو داغِ دل | مختلف شکلیں ہیں اظہارِ غم و آلام کی

یہ راز ہے اے حریصِ دنیا، تجھے کچھ اِس کی خبر نہیں ہے | اسی کا گھر ہے تمام دنیا کہ جس کا دنیا میں گھر نہیں ہے

منتخب طنزیہ و مزاحیہ اشعار

اختلافِ مذہبی جس وقت پیدا ہو گیا | اتحادِ قوم چوں چوں کا مربا ہو گیا

اس کا اقرار ہے ہم کو بھی کہ اچھا گائی | دیکھنا یہ ہے کہ کیا لیتی ہے کندن بائی

جنابِ شیخ بھی چپکے سے کہہ گئے آخر | شراب رات کو اکثر حلال ہوتی ہے

حضرتِ دل جو کسی مِس کے حوالے ہوتے | جتنے گورے ہیں مقرّر مرے سالے ہوتے

اختر حیدر آبادی

نام علی اختر، تخلّص اختر۔ ۱۶؍اپریل ۱۸۹۴ء کو ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن علی گڑھ تھا۔ فارسی اور عربی کا درس مولانا نصیر الدّین سے حاصل کیا اور اس زمانے کی مروجہ تکمیل کے بعد ننہال کے تعلق سے آگرہ سینٹ جانسن کالج میں داخلہ لیا۔ کالج کے ابتدائی ایام ہی میں سل کے مرض میں مبتلا ہو گئے جس کی وجہ سے ایک سال تک تعلیم ملتوی رہی۔ بعد ازاں طبیعت تعلیم کی طرف راغب نہ ہوئی۔ ۱۹۱۰ء سے حیدر آباد، دکن میں بہ سلسلہ ملازمت مستقلاً قیام پذیر رہے۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء میں پاکستان آ گئے۔ ۱۱؍جنوری ۱۹۵۸ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ نثار یار جنگ اختر حیدر آبادی کے حقیقی چچا اور نظر حیدر آبادی ان کے فرزند تھے۔ اختر حیدر آبادی کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''انوار'' (غزل)، ''اسرار'' (نظموں کا انتخاب)، ''قولِ فیصل'' (طویل نظم)، ''نوائے مشرق'' (نظموں کا مجموعہ)۔

منتخب اشعار

دل کے اکثر فسانہ ہائے جمیل | آنسوؤں میں سنائے جاتے ہیں

عشق بقدرِ آرزو تشنۂ زخم ہے ابھی | تیر نگاہِ ناز کو اور بھی دل نواز کر

کہاں کا ہوش، کیسی آگہی اس بزمِ امکاں میں | مگر اک نیم بیداری سی ہے خوابِ پریشاں میں

عقل ہے پھر حریفِ عشق، اب یہ بساط اُلٹ نہ دو
پردہ اُٹھا کے آ نہ جاؤ عالمِ امتیاز میں

مقام اور بھی ہیں دانش آزما، لیکن
طلسمِ ہستیٔ فانی! ترا جواب نہیں

نغمۂ درد چھیڑ کر انجمنِ حیات میں
عشق نے جان ڈال دی پیکرِ کائنات میں

یہاں تو گلستاں بھی بیمِ گردش سے نہیں خالی
نہ جانے پھول کیا سمجھے ہوئے ہیں مسکرانے کو

وہی کچھ خواب ہوں گے اور کچھ اوہامِ بیداری
جہاں سے چھیڑیے کم بخت دنیا کے فسانے کو

حشر آئے گا نہ جانے کب تک
زندگی اور بھی رسوا ہوگی

فریبِ جلوہ کہاں تک بروئے کار رہے
نقاب اُٹھاؤ کہ کچھ دن ذرا بہار رہے

خرابِ شوق رہے، وقفِ انتظار رہے
اب اور کیا ترے وعدوں کا اعتبار رہے

حریفِ جادۂ دشوار بن اور مسکراتا جا
کہ مشکل اصل میں بنتی ہے صرف احساسِ مشکل سے

سراج لکھنوی

نام سراج الحسن، سراج تخلص۔ ۲۷ر جولائی ۱۸۹۴ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں دسویں درجے تک تعلیم چرچ مشن ہائی اسکول لکھنؤ میں پائی۔ اس کے بعد محکمہ امداد باہمی (کوآپریٹو سوسائیٹز) میں ملازم ہو گئے۔ ساری عمر اس محکمے میں ملازم رہے اور یہیں سے ۱۹۴۶ء میں پنشن پائی۔ تنخواہ قلیل تھی اور پنشن اس سے بھی قلیل تر۔ کنبہ خاصا بڑا تھا لہٰذا تمام عمر تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۰۸ء میں شعر کہنا شروع کیا، پیارے صاحب رشید اور ان کے بھائی باقر رضا حمید سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کی تندرستی کبھی تسلی بخش نہ رہی۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۶۸ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ غزلیات کا انتخاب ''شعلۂ آواز'' کے عنوان سے ۱۹۶۰ء کے قریب شائع ہوا تھا۔ بہت سا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔

منتخب اشعار

یہ مرے عالمِ وحشت کی نشانی ہے سراجؔ
ایک ٹوٹی ہوئی زنجیر لیے بیٹھا ہوں

کہیں قرار سے اب بیٹھنے نہیں پاتا
نہ جانے کس کا اُڑایا ہوا غبار ہوں میں

عاشقی کچھ کھیل بچّوں کا نہیں
جو بھی چھو آئیں جا کر ڈھائیاں

خوشا وہ دور کہ جب مرکزِ نگاہ تھے ہم
پڑا جو وقت تو اب کوئی روشناس نہیں

میں وجہِ سکوت کیا بتاؤں	یہ بھی ہے نوائے عاشقانہ
آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے	اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
آ دیکھ دل کے خون سے جلتے ہوئے چراغ	پھوٹی ہے اک شفق نگہِ انتظار سے
ابھی مجھے نہ سناؤ بہارِ نو کا پیام	ابھی نگاہ میں بربادیٔ گلستاں ہے
قفس کا دَور سہی، موسمِ بہار تو ہے	اسیر آؤ ذرا ذکرِ آشیاں ہو جائے
یہ مقامِ عشق ہے کون سا، یہ ہیں کیسی صبر کی منزلیں	نہ تڑپ ہے دل میں نہ درد ہے، نہ سکون ہے نہ قرار ہے
یہ صدا تو ہے وہی دکھ بھری، مرے کان جس سے ہیں آشنا	ذرا چپ رہو، مجھے سننے دو، یہ تو میرے دل کی پکار ہے

رسا جالندھری

نام محمد کبیر خاں، رسا تخلّص۔ ۶؍اکتوبر ۱۸۹۴ء کو بستی غزاں، ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ گھریلو اور اسکول کی تعلیم کے بعد علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ شاعری اسکول کے زمانے ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ بعض دوستوں سے مشورے کے بعد صفی لکھنوی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ چناں چہ ان کی خانگی ذمّے داریاں بڑھ گئیں اور انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے وطن واپس آنا پڑا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور لاہور میں سکونت اختیار کی۔ ۴؍اپریل ۱۹۷۷ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کے کلام کا مجموعہ ''فکرِ رسا'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔

منتخب اشعار

ایسی ہوا چلی کہ زمانہ بدل گیا	ہم پوچھتے ہی رہ گئے، کیا بات ہوگئی
خوش نصیبی میں ہے یہی اک عیب	بدنصیبوں کے گھر نہیں آتی
کیا یہ لازم ہے کہ پہنچیں کشتیاں ساحل پہ سب	ناخدا انسان ہوتے ہیں، خدا ہوتے نہیں
زخمی ہیں جن سے پاؤں، بیاباں کے ہیں وہ خار	جو دل میں چبھ رہے ہیں، یہ کانٹے کہاں کے ہیں؟

سالک، عبدالمجید

نام عبدالمجید، سالک تخلّص۔ ۱۳؍دسمبر ۱۸۹۴ء کو بٹالہ، ضلع گورداس پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بٹالہ اور پٹھان کوٹ میں ہوئی۔ بی اے لاہور میں کیا۔ ۱۹۱۴ء میں پٹھان کوٹ سے رسالہ ''فانوسِ خیال'' نکالا جو ایک سال جاری رہا۔ ۱۹۱۵ء کے اواخر میں ''تہذیبِ نسواں'' اور ''پھول'' کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں ''زمیندار'' کی

ادارت سنبھالی۔ ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی بنا پر ایک سال کی قید ہوئی۔ رہائی کے بعد پھر ''زمیندار'' کے اڈیٹر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں قطع تعلق کر کے مولانا مہر کی معیت میں ''انقلاب'' کا اجرا کیا جو تیس سال تک جاری رہا۔ شعر گوئی، ادب، تنقید اور صحافت مشاغل رہے۔ حیات بخش رسا سے تلمذ حاصل تھا۔ ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۹ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ سالک کا لگاو نظم کی طرف زیادہ تھا۔ ان کے شعری مجموعہ کا نام ''رہ و رسم منزلہا'' ہے۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں: ''ذکرِ اقبال''، ''سرگذشت'' (خود نوشت)، ''یارانِ کہن''، ''مسلم ثقافت ہندوستان میں''۔

منتخب اشعار

شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں
سحر نے دامنِ مشرق کو لالہ زار کیا

وداعِ عشق ہے اب رخصت اے غمِ جاناں
کہ پھر مجھے غمِ دوراں نے بے قرار کیا

الٰہی جاؤں کہاں میں کہ کارواں کا سراغ
فضا میں بانگِ درا کے سوا کچھ اور نہیں

یہ قید و صید کے اندیشہ ہائے بیجا کیا
چمن کی فکر کرو، آشیاں کی بات کرو

حالِ دل سن کے وہ آزردہ ہیں شاید ان کو
اس حکایت پہ شکایت کا گماں گزرا ہے

تجھے کچھ عشق و الفت کے سوا بھی یاد ہے اے دل
سنائے جا رہا ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

دشتِ جنوں میں ہو گئی منزلِ یار بے سراغ
قافلہ کس طرف گیا، بانگِ درا کو کیا ہوا

نالۂ شب ہے نارسا، آہِ سحر ہے بے اثر
میرا خدا کہاں گیا، میرے خدا کو کیا ہوا

افسر میرٹھی

نام حامد اللہ، تخلص افسر۔ ۲۹ر نومبر ۱۸۹۵ء کو میرٹھ میں مفتیوں کے مشہور خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان انھی مفتیِ اعظم کی اولاد میں ہے جنھوں نے شہنشاہ جہانگیر کی چہیتی بیگم نور جہاں پر قتل کے الزام میں قصاص کا فیصلہ صادر کیا تھا۔ افسر ابتدائی تعلیم کے بعد کافی عرصے تک عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ عالیہ، میرٹھ میں پاتے رہے۔ بعد ازاں میرٹھ کالج سے بی اے کیا۔ ۱۹۲۷ء میں وہ گورنمنٹ کالج، لکھنؤ میں اردو کے ٹیچر ہو گئے، پھر وائس پرنسپل کے عہدے پر تقرر ہوا۔ اس کے کچھ عرصے بعد پرنسپل کی حیثیت سے تبادلہ ہو گیا تو انھوں نے استعفا دے دیا۔ شعر و شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ طرح پر شعر کہنے سے ہمیشہ اُلجھن ہوتی تھی۔ غزل کہنے کا طرز ہمیشہ یہ رہا کہ کسی واقعے سے متأثر کر ایک شعر کہا پھر اُسی زمین میں اور شعر کہہ کر غزل پوری کر لی۔ افسر نے بچّوں

کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ ۱۹؍اپریل ۱۹۷۴ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ ''پیامِ روح'' اور ''جوئے رواں'' ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ انھوں نے افسانے، ڈرامے، تنقیدی مضامین، اور بچوں کے نصاب کی متعدد کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ''نقدالادب'' (اردو تنقید کی تاریخ) ان کی اہم کتاب ہے۔

منتخب اشعار

یہ جی چاہتا ہے مرا آج افسرؔ
ابھی اور تم سے کیے جاؤں باتیں

ہم جس کو موت سمجھتے ہیں پیغامِ حیات جدید ہے وہ
یہ پھول چمن میں جتنے ہیں سب کھلنے کو مرجھاتے ہیں

موت ہے وہ راز جو آخر کھلے گا ایک دن
زندگی ہے وہ معما کوئی جس کا حل نہیں

رکھ کر نظر کے سامنے تصویر خواب ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ یہ سمجھتے ہیں
کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں

تجھ کو پالینے میں یہ بیتاب کیفیت کہاں
زندگی وہ ہے جو تیری جستجو میں کٹ گئی

صدائیں آتی ہیں دھیمے سروں میں گانے کی
اب آج پھر نہیں امید نیند آنے کی

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے
چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے

سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بے کار
دکھ میں اللہ یاد آتا ہے

ہائے انجامِ تجسس کی عجائب کاریاں
تم ملے اور ڈھونڈنے والے تمھارے کھو گئے

مجھے فردا کی فکر کیوں کر ہو
غمِ امروز کھائے جاتا ہے

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے
کاروانِ بہار دیکھا ہے

بھٹکتی ہیں نظریں مری ہر طرف
خدا جانے کس بھیس میں تُو ملے

مجھے اے چاند تیری منزلوں پر رشک آتا ہے
مسافر وہ نہیں ہے جو سفر کا مدّعا سمجھے

رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کوئل نے
نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

حیات و موت دو کڑیاں ہیں اک زنجیر کی افسرؔ
کوئی کیا ابتدا سمجھے، کوئی کیا انتہا سمجھے

آغاز ہوا ہے الفت کا اب دیکھیے کیا کیا ہوتا ہے
یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رونا ہے

انوکھے خیالوں کی محفل جمائے
پڑے رہتے ہیں گھر میں افسرؔ اکیلے

ہزار نیرنگیوں کے مالک مجھے بتادے یہ کیا ستم ہے
کہ تیرے کعبے میں رہنے والا، کبھی خدا ہے، کبھی صنم ہے

جب سفر افسر کبھی کرتے نہیں — دیکھتے پھر کیوں ہو تم منزل کے خواب

کیا شکر ہو الٰہی! سب کچھ عطا کیا ہے — میرے وطن کو تو نے جنّت بنا دیا ہے

ہے تیرے لیے سارا جہاں حُسن سے خالی — خود حُسن اگر تیری نگاہوں میں نہیں ہے

رضا، سیّد آلِ رضا

نام سیّد آلِ رضا، تخلص رضا۔ ۱۰؍جون ۱۸۹۶ء کو نیوتنی، ضلع اناو (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ گھر پر مکتب کی معمولی تعلیم کے بعد ۱۹۱۲ء میں سیتا پور اسکول سے انٹرنس، ۱۹۱۶ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے اور ۱۹۲۰ء میں لا کالج، الہ آباد سے ایل ایل بی کیا۔ ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ اور پھر پرتاب گڑھ (اودھ) میں وکالت شروع کی۔ تلمیذ آرزو لکھنوی۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آ گئے۔ غزل کے علاوہ مرثیہ بھی اچھی کہتے تھے۔ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ان کا لکھنوی لب ولہجہ ہے۔ یکم مارچ ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ رئیس امروہوی نے ''سیّد آلِ رضا عالی مقام'' (۱۳۹۸ھ) سے ان کی تاریخ وفات نکالی۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''شہادت سے پہلے، شہادت کے بعد'' (مرثیہ) ''نوائے رضا، ''غزلِ معلیٰ'' (شعری مجموعے)۔

> آلِ رضا دبستانِ لکھنؤ کے آخری ممتاز نمائندہ تھے۔ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا زیادہ تر اظہار مرثیے کی صنف میں کیا ہے، لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت میں ان کی غزل گوئی کو بھی یکساں حاصل تھا۔ (نظیر صدیقی)

منتخب اشعار

بیٹھے تھے گھنی چھاؤں میں اس کی نہ خبر تھی — بڑھ جائے گی دھوپ اور یہ سایہ نہ رہے گا

نہ رکھا کہیں کا نہ اپنا بنایا — وہ کیا چاہتے ہیں سمجھ میں نہ آیا

یہ میرا حال جس پہ ہنسی آ گئی تمھیں — اکثر اسی نے ہنستے ہوؤں کو رُلا دیا

ہم اک اشارے پر کتنے سوال کر بیٹھے — کسی سوال کا، لیکن کوئی جواب نہ تھا

کھلتے پھولوں کی یہ کہانی دل کو نہ کیوں تڑپائے بہت — شاخوں پہ کم رہنے پائے ہاتھوں میں کمھلائے بہت

قسمت کا یہ پھیر بھی دیکھا بجھنے والی پیاس بڑھی — مٹی ترسی، بوند نہ برسی، بادل گھر گھر آئے بہت

کچی کلیاں توڑ کے رکھ دیں پانی میں کھِل اُٹھنے کو — یوں جو تمناؤں سے کھیلے، کھیل کے ہم پچھتائے بہت

ہم نے بے انتہا وفا کر کے — بے وفاؤں سے انتقام لیا

تم رضاؔ بن کے مسلمان جو کافر ہی رہے — تم سے بہتر ہے وہ کافر جو مسلماں نہ ہوا

رکیں تو پاؤں پکڑ لے یہیں زمیں نہ کہیں — چلے چلو کہ وہ مل جائیں گے کہیں نہ کہیں

بچا کے سجدے سے تم نے جو پاؤں کھینچ لیے — اسی نشان پہ رکھ دے کوئی جبیں نہ کہیں

ہمارے مُنہ پہ رضاؔ تذکرے محبت کے — کہ جیسے ہم نے یہ باتیں کبھی سُنیں نہ کہیں

قسم لے لو جو شکوہ ہو تمھاری بے وفائی کا — کیے کو اپنے روتا ہوں، مجھے جی بھر کے رونے دو

رضاؔ کے سامنے تصویرِ دوست رہنے دو — ہے زیرِ غور کہ شاید یہ لب ہلے ہیں ابھی

چلے تھے ایک نظر تیری بزم دیکھ آئیں — یہاں جو آئے تو بے اختیار بیٹھ گئے

طے ہو چکیں شکستِ تمنّا کی منزلیں — اب اس کے بعد گریۂ بے اختیار ہے

سامنا ہو گیا رستے میں ہمارا ان کا — یہ بھی پُرلطف رہا کون کدھر سے گزرے

کیفیت پھول کے کھلنے کی ذرا سوچی تھی — اور تم ہنستے ہوئے میری نظر سے گزرے

جس میں کچھ لکھ نہ سکے حشمتِ القاب کے بعد — یہ عریضہ تو یوں ہی ان کی نظر سے گزرے

دل آنے کی، دل جانے کی، دل مٹنے کی حالت — ہاں یاد ہے، کچھ یاد ہے، کچھ یاد نہیں ہے

رضاؔ کتنی حسیں اور مختصر شرحِ محبت ہے — نہ راس آئے تو دوزخ ہے، جو راس آئے تو جنت ہے

اُن کو دیکھا تو محبت بھی سمجھ میں آئی — ورنہ اِس لفظ کی تعریف سُنا کرتے تھے

کیا اِس لیے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے — بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے — اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

فراق گورکھپوری

رگھو پتی سہائے نام، فراق تخلّص۔ ۲۸ راگست ۱۸۹۶ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر شروع ہوئی۔ اردو کی دو تین کتابیں ختم کرنے کے بعد باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ان کے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور غم روزگار سر پر آن پڑا۔ ڈپٹی کلکٹری اور یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی تھی اور آئی سی ایس کے لیے گورنر نے نامزد بھی کر دیا تھا، مگر ازدواجی زندگی کی تلخی نے اتنا بددل کر دیا تھا کہ تمام ملازمتوں سے انکار کر کے کانگریس میں شامل ہو گئے۔ جنگ آزادی کی تحریک میں حصّہ لینے کی وجہ سے جیل بھی کاٹی۔ رہائی کے بعد لکھنؤ

کرسچین کالج پھر کان پور سناتن دھرم کالج میں ملازم ہو گئے۔ اسی دوران ایم اے (انگریزی) پاس کر لیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ وہیں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں دو چار غزلیں ناصری نے دیکھیں۔ اس کے بعد کچھ غزلیں وسیم خیر آبادی کو دکھائیں۔ پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ۳؍مارچ ۱۹۸۲ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ لاش الہ آباد لائی گئی اور کریا کرم سنگم پر ہوا۔ فراق کا شمار اس دور کے بہترین غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ایک اچھے نقاد بھی تھے۔ ''رمزو کنایات''، ''مشعل'' (انتخاب کلام)، ''شعلۂ ساز''، ''روح کائنات''، ''شبنمستاں'' اور ''گل نغمہ'' ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ تنقید پر ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ''اردو کی عشقیہ شاعری''، ''اندازے''۔ ''روپ'' ان کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔

فراق ایک نقاد شاعر ہیں اور اس خصوصیت میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ شعر نہیں کہتا زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتا ہے اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علاحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ (نیاز فتح پوری)

منتخب اشعار

باغِ جنّت پہ گھٹا جیسے برس کر کھل جائے
سوندھی سوندھی تری خوشبوے بدن، کیا کہنا

ہر آواز جرس پر اک صداے بازگشت آئی
بہت ہے اس قدر بھی خیر یادِ رفتگاں ہونا

وہ صبحِ وصل اوّل تو نہ اُٹھنا اُن نگاہوں کا
مگر جس وقت اُٹھ جانا تو پھر اک داستاں ہونا

تری یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں
محبت ہے شاید تجھے بھول جانا

منزلیں گرد کے مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں
دل وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے
آج تو کوئی آیا ہوتا

میں ہوں، دل ہے، تنہائی ہے
تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی
سوالِ عشق ہے ابھی یہ کیا کیا یہ کیا ہوا

نہ اور کھول ابھی نیم باز آنکھوں کو
ترے نثار یہ جادو ابھی جگائے جا

قفس سے چھوٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا
وہ رنگِ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

محبت میں مری تنہائیوں کے ہیں کئی عنواں
ترا آنا، ترا ملنا، ترا اُٹھنا، ترا جانا

تُو تھا یا کوئی تجھ سا تھا
میری راہ میں کون کھڑا تھا

اور بھی کام ہیں دنیا میں غمِ الفت کو
اس کی یاد اچھی نہیں اے دلِ ناکام بہت

جہاں میں تھی فقط افواہ تیرے جلووں کی
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

ابھی سنبھلے رہو کہ دن ہے فراقؔ
رات پھر بے قرار ہو لینا

تھی یوں تو شامِ ہجر، مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

کون بتائے عشق میں تیرے
دکھ کتنا تھا، سکھ کتنا تھا

میں بھی تھا سچا، تم بھی تھے سچّے
عشق میں سچ ہی کا رونا تھا

کبھی پابندیوں سے چھٹ کے بھی جی گھٹنے لگتا ہے
در و دیوار ہوں جس میں وہی زنداں نہیں ہوتا

غم کی فرصت کہاں زمانے میں
آج رو لیں ترے لیے دم بھر

سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں
دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

ویرانیاں جہان کی آباد ہو چکیں
جز اِک دیارِ عشق کہ سُونا ہے آج تک

کیا ہے رفتارِ انقلاب فراق!
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

دلوں کو تیرے تبسّم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اُٹھیں جس طرح مندروں کے چراغ

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

حُسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق!
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

پیدا ہوتے رہیں گے دل والے
تا قیامت رہے گی جاری غزل

قافلے یا مٹ گئے یا بڑھ گئے
اب غبارِ راہ بھی اُٹھتا نہیں

چپکے چپکے اُٹھ رہا ہے مدھ بھرے سینوں میں درد
دھیمے دھیمے چل رہی ہیں عشق کی پُروائیاں

زندگی ہے یا کوئی دشتِ جنوں
ہر طرف تنہائیاں تنہائیاں

جن کو ہم اک عمر تک بھولے رہے
آج وہ باتیں بہت یاد آئیاں

جو بھولتی بھی نہیں، یاد بھی نہیں آتیں
تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

تم مخاطب بھی ہو، قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

شام بھی تھی دھواں دھواں، حُسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کر رہ گئیں

دنیا سے اے دل اپنی طبیعت بھری نہیں
تیرے لیے اُٹھائی ندامت کہاں کہاں

یوں ہی سا تھا کوئی جس نے ہمیں مٹا ڈالا
نہ کوئی چاند کا ٹکڑا، نہ کوئی زہرہ جبیں

کچھ آدمی کی ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مر جائیں

سبب کچھ اور ہیں پیارے مرے اُداسی کے
نہ میں جفاؤں کا شاکی، نہ تُو وفا دشمن

اس کائناتِ غم کی فسردہ فضاؤں میں
بکھرا گئے ہیں آ کے وہ کچھ مسکراہٹیں

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمّت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہے بستیاں

میں یہ بھی کہہ نہیں سکتا بدل گئی وہ نگاہ
وہی ہے لطف و کرم، مگر وہ بات کہاں

کوئی آیا نہ آئے گا، لیکن
کیا کریں گر نہ انتظار کریں

نیند آ چلی ہے انجمِ شامِ ابد کو بھی
آنکھ اہلِ انتظار کی اب تک لگی نہیں

بے حقیقت ہیں آبِ گنگ و جمن
آنسوؤں سے ترے قدم دھوؤں

یوں ہی فراقؔ نے عمر بسر کی
کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں

ترا فراق تو اُس دن ترا فراق ہوا
جب اُن کو پیار کیا میں نے جن سے پیار نہیں

گھر رہوں یا کہیں نکل جاؤں
کیا کروں تجھ سے چھٹ کے، کیا نہ کروں

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

جو تیرے گیسوئے پُرخم سے کھیل بھی نہ سکیں
ان انگلیوں سے ستاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

کیا ہے سیر گہہ زندگی میں رُخ جس سمت
ترے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہوں میں

کہاں کا وصل، تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آ جانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنّا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

مدّتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست!
آہ، اب مجھ سے تجھے رنجشِ بے جا بھی نہیں

یہ سر سے تا بقدم محویت کا عالم ہے
کسی خیال میں ڈوبا ہوا ہو جیسے بدن

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تُو نے
یہ اور بات کہ تجھ سے بھی کچھ امیدیں تھیں

وہ ایک رات گزر بھی گئی، مگر اب تک
وصالِ یار کی لذّت سے ٹوٹتا ہے بدن

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

خوش بھی ہو لیتے ہیں تیرے بے قرار
غم ہی غم ہو عشق میں ایسا نہیں

وہ عالم اور ہی ہے جس میں گہری نیند آتی ہے
خوشی اور غم میں سونے کے لیے راتیں نہیں ہوتیں

چھلک کے کم نہ ہو ایسی کوئی شراب نہیں
نگاہِ نرگسِ رعنا ترا جواب نہیں

دکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے
خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں

ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے، تم کیا کرو، ہم کیا کریں

ارے خود اپنا فریبِ نگاہ کیا کم ہے
یہ کیا ضرور کہ اس کی نظر کے دھوکے کھاؤ

موت کا اُف وہ پیامِ زندگی
ایک دنیا نے جسے سمجھا نہیں

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

فرصت ضروری کاموں سے پاؤ تو رو بھی لو
اے اہلِ دل! یہ کارِ عبث بھی کیے چلو

نہ اختلاط ہے اُس کو نہ احتراز پسند
ابھی سمجھتے نہیں تم مزاجِ دنیا کو

رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی
وہ پَو پھٹی، وہ نئی زندگی نظر آئی

شبِ فراق اُٹھے دل میں اور بھی کئی درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست!
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اُٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا
اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اُسے بیگانہ

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی
زندگی اُچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

یہ زندگی کے کڑے کوس، یاد آتا ہے
تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر، پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب، مگر، پھر بھی

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر، پھر بھی

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے
اُتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر، پھر بھی

ہزار غم ہو نہیں چاہتا کوئی، لیکن
کہ اس کے بدلے کوئی اور زندگی ہوتی

تجھے پا کر نہ جانے کس لیے آنسو نکل آئے
محبت میں خوشی بھی کس قدر اندوہ گیں نکلی

اِس پُرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تُو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی؟

حیات راز سکوں پا گئی اجل ٹھہری
اجل میں تھوڑی سی لرزش ہوئی حیات ہوئی

دیارِ عشق پہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں
حریمِ عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی

تمھیں نے باعثِ غم بارہا کیا دریافت
کہا تو روٹھ گئے یہ بھی کوئی بات ہوئی

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تُو نے تو خیر بے وفائی کی

دل تو فراق سنجی ہے تیرا — آنکھ، مگر للچائی ہوئی سی

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے — انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری

وجہِ ملال بھی تو ہو، حُسن بھی کس طرح منائے — اُف یہ مزاجِ عشق جو بیٹھے بٹھائے روٹھ جائے

دل دکھ کے رہ گیا، یہ الگ بات ہے، مگر — ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے

اب حُسن بھی رہینِ غمِ روزگار ہے — کیا انقلاب اے دلِ رنجور ہو گئے

ایک وہ ملنا، ایک یہ ملنا — کیا تُو مجھ کو چھوڑ رہا ہے؟

سن رہے تھے فسانۂ عالم — کیوں تری یاد دل کو آنے لگی

کیسی خوشی، کہاں کا الم، یہ کوئی بتائے — دنیا میں زندگی بھی کہیں دستیاب ہے؟

اسی سے نظمِ دو عالم بدل گئی اکثر — وہ سعیِ عشق جسے بخت نارسا کہیے

جو کچھ بھی کہیں تری محبت — انساں بنا کے چھوڑتی ہے

ستارے ابھی لے چکے ہیں بسیرے — کہاں آ گئے تم سویرے سویرے

یہ کس مہر و مہ کے قدم اُٹھ رہے ہیں — اُجالے اُجالے، اندھیرے اندھیرے

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل — کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں، دراز بھی ہے

کیا کریں ہم بھی، کیا کرو تم بھی — آدمی آدمی کا دشمن ہے

سچ ہے ٹھنڈا کون کرے، تیرے سوا گرمائے کون — جلتے جلتے اشکوں کو، بھیگی بھیگی راتوں کو

اے شورِ جہاں! نہ چھیڑ اس کو — دیوانے کو نیند آ گئی ہے

اب دل کی مجھ سے ہوں گی نہ تیمار داریاں — کم بخت دُکھ رہا ہے اگر تو دُکھا کرے

اب وہ اس درجہ یاد آنے لگے — ہم زمانے کو بھول جانے لگے

اک فسوں سامان نگاہِ آشنا کی دیر تھی — اِس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

قید کیا رہائی کیا، ہے ہمیں میں ہر عالم — چل پڑے تو صحرا ہے، رک گئے تو زنداں ہے

حاصلِ حُسن و عشق بس ہے یہی — آدمی آدمی کو پہچانے

ہم عشق و محبت کو تو بھول چکے، لیکن — جب نام ترا لیجے تب آنکھ بھر آئے ہے

اِس دَور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے

کیا محبت کی ہے یہی تصویر؟ — میرے آنسو ہیں، تیرا دامن ہے

شعورِ عشق کی تکمیل ہو چکی شاید — نہ بھولتا ہے کوئی اب نہ یاد آتا ہے

میرے سینے سے لگ کے سو جاؤ — پلکیں بھاری ہیں، رات بھی کم ہے

یہ رنگِ رُخ تھا، اُٹھائی ہے جب نگہ اُس نے — شراب جیسے چھلکتے چھلکتے رہ جائے

یہ رنگ و بُوئے بدن ہے کہ جیسے رہ رہ کر — قبائے ناز سے کچھ شعلہ سا لپک جائے

آج آغوش میں تھا اَور کوئی — دیر تک ہم تجھے نہ بھول سکے

ہر عقدۂ تقدیرِ بشر کھول رہی ہے — ہاں دھیان سے سننا، یہ صدی بول رہی ہے

نہ پوچھ عرصۂ ہستی کی وسعت و تنگی — جو چل پڑے تو بیاباں، رُکے تو زنداں ہے

شکوہ کیا ستم کا تو نم دیدہ ہو گئے — تم تو ذرا سی بات میں رنجیدہ ہو گئے

اے ساکنانِ دہر یہ کیا اضطراب ہے — اتنا کہاں خراب جہانِ خراب ہے

اب دَورِ آسماں ہے نہ دَورِ حیات ہے — اے دردِ ہجر! تُو ہی بتا کتنی رات ہے

خدا کو اہلِ جہاں جب بنا چکے تو فراق — پکار اُٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے

نگاہِ یار کچھ ایسی پھری ہجراں نصیبوں سے — کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غم خوار ہو جائے

ہری بھری رگوں میں وہ چمکتا بولتا لہو — وہ سوچتا ہوا بدن خود اک جہاں لیے ہوئے

منوّر لکھنوی

نام منشی بشیشور پرشاد، تخلّص منوّر۔ ۸؍جولائی ۱۸۹۷ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان ہمیشہ علم و فضل کے لیے مشہور رہا ہے۔ منوّر صاحب کے خسر جناب صدر آنجہانی کو فنِ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ آپ کے والد اور چچا نے بھی اردو اب کی تمام عمر خدمت کی۔ منوّر صاحب نے شعر و سخن کے گہوارے میں پرورش پائی۔ نظر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ منوّر صاحب کا کلام ''زمانہ'' اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ''نسیم عرفاں'' کے نام سے ''شری بھگوت گیتا'' کو اردو نظم میں منتقل کر چکے ہیں۔ انھوں نے ''کائناتِ دل'' میں اپنی سب نظمیں یکجا کر دیں ہیں۔ ''نوائے کفر'' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ ۲۴؍مئی ۱۹۷۰ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

ہم اپنے دل کو مقامِ خدا سمجھتے ہیں — یہی ہے دَیر اب اپنا، یہی حرم اپنا

تاثرات کی رادھا کا عکس پڑنے سے — تخیلات کی جمنا حسین ہے کتنی

عمرِ رواں کو تھا مری روداد سے گریز — ظالم سنا کے اپنی کہانی چلی گئی

جھلس کر دَورِ نو کی روشنی سے کھوؤں کیوں آنکھیں — ہے اک نعمت منوّر میرے حق میں تیرگی میری

از خود مرا وجود میں آنا محال تھا — کس کی خطا تھی اور سزا پا رہا ہوں میں

مری روش سے سمجھ لے نہ کوئی غیر مجھے — سنبھل کے پاؤں خود اپنے ہی گھر میں رکھتا ہوں

ابر احسنی گنوری

نام احمد بخش اور تخلص ابر تھا۔ مئی ۱۸۹۸ء میں یو پی کے پرانے تاریخی قصبے گنور (ضلع بدایوں) میں پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کی کم سنی میں ہو گیا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت کا بار ان کی والدہ کے کندھوں پر آ پڑا۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق تعلیم مکتب سے شروع ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں گنور کے مڈل اسکول سے آٹھویں درجے میں کامیاب ہوئے۔ گھر کے ناسازگار حالات کے باعث مزید تعلیم ممکن نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے ملازمت کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور کان پور کے مشہور جوتوں کے سرکاری کارخانے میں ملازم ہو گئے۔

اس زمانے میں منشی سخاوت حسین سخا شاہجہان پوری بھی اُسی کارخانے میں ملازم تھے۔ ابر صاحب نے اگرچہ شعر گوئی ۱۹۱۵ء میں اپنے قیام گنور کے زمانے ہی میں شروع کر دی تھی، لیکن اب تک کسی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ کان پور میں ان کی سخا سے ملاقات ہوئی تو یہ ان سے مشورہ کرنے لگے۔ بعد ازاں ابر صاحب نے احسن مارہروی کا تلمذ اختیار کیا۔ تلمذ کا یہی تعلّق ان کے اپنے تخلّص کے ساتھ احسنی کی نسبت کے مستقل اضافے کی بنیاد ہے۔

تقریباً چار سال کی ملازمت کے بعد ابر صاحب کان پور سے گنور واپس آ گئے۔ انھوں نے یہاں جوتوں کی دکان کر لی۔ تجارت کا تجربہ نہ ہونے کے باعث سال بھر میں ساری پونجی کھو بیٹھے۔

اب انھوں نے اپنی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ فارسی اور عربی پڑھنے لگے۔ تیاری کے بعد اردو اور فارسی کے امتحانات پاس کیے۔ انھیں ڈسٹرکٹ بورڈ میں نوکری مل گئی۔ چناں چہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ ضلع بدایوں کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ابر صاحب اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہوکر رام پور چلے گئے جہاں ان کے بڑے صاحبزادے پہلے سے موجود تھے۔ رام پور میں مدرسہ عالیہ (اورینٹل کالج) میں ۷۵ روپیہ مشاہرے پر ملازم ہوگئے۔ رام پور میں پانچ برس رہے اور وہاں سے ۱۹۵۳ء میں سبک دوش ہوکر گنور واپس آگئے۔

جب احسن مارہروی کا اگست ۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا تو ابر صاحب نے گنور میں استاد کے نام پر ''بزمِ احسن'' قائم کی۔ وہ خود اس کے صدر تھے۔ اس بزم کے زیرِ اہتمام وہ مشاعرے وغیرہ کرتے رہتے تھے۔

رام پور سے آنے کے بعد انھوں نے بسر اوقات کے لیے آبائی پیشہ کاشت کاری اختیار کیا۔ ساتھ ہی اعلان کردیا کہ آیندہ شاگردوں کو اپنے کلام پر اصلاح کے لیے کچھ نہ کچھ پیش کرنا ہوگی۔ مزید برآں یوپی حکومت نے ان کا چھ سو روپیہ سالانہ ادبی وظیفہ مقرر کردیا۔

گنور میں وہ اپنی دو خردسال پوتیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ۷ نومبر ۱۹۷۳ء شب کے کھانے کے بعد وہ حسبِ معمول اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اگلی صبح (۸ر نومبر) وہ دیر تک باہر نہیں آئے تو تقریباً ۸ر بجے ان کی بڑی پوتی ان کے کمرے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ خون میں لت پت مردہ پڑے ہیں۔ رات میں انھیں کسی نے قتل کردیا تھا۔ قتل کا سبب معلوم نہ ہوسکا اور نہ ہی قاتل کا کوئی سراغ ملا۔

اردو زبان کی ترقّی وترویج میں ابر احسنی کی خدمات قابلِ قدر رہی ہیں۔ ان کے سیکڑوں شاگرد ملک کے دور دراز خطوں میں ملتے ہیں۔ ابر مدّتوں مشہور تعلیمی ماہ نامے ''رہنمائے تعلیم'' کے ادارۂ تحریر میں شامل رہے۔ ان کی فنّی اور لسانی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اس سلسلے میں سیماب اکبرآبادی سے چپقلش اور نیاز فتح پوری سے مناقشہ قابلِ ذکر ہیں۔

ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ان کی تبدیلیٔ مذہب ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شروع میں قرآن پڑھا اور مدّتوں نعت اور منقبت لکھتے رہے۔ جن دنوں ابرؔ صاحب گنور میں مقیم تھے، ایک صاحب بلاک ڈیولپمنٹ کے محکمے میں ملازم ہوکر جناونی (تحصیل گنور) آئے۔ ابر کا ان کے ہاں آنا جانا ہوگیا۔ وہاں ان کے والد ارتضٰی حسین عابدی سے ملاقات ہوئی۔ عابدی صاحب پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ مذہباً بہائی تھے۔ ابر صاحب کا ان سے ملنا جلنا ہوگیا۔ لامحالہ مذہب پر بھی گفتگو ہوتی ہوگی۔ انھی کی ترغیب وتشویق پر اور انھی کے اثر کے تحت ابرؔ نے بھی بہائی مذہب اختیار کیا۔

ان کی مطبوعہ تصانیف کے نام یہ ہیں: ''اصلاح الاصلاح''، ''سفینے'' (نظمیں)، ''نگینے'' (غزلیات)، ''میری

اصلاحیں'' (دو حصّے)، ''قرینے'' (غزلیات)، ''شیشے'' (حمد، نعت وسلام)، ''خزینے'' (غزلیات، نظمیں، متفرقات)۔ بہت سا کلام زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس میں غزلیات ومنظومات کے علاوہ ایک پورا مجموعہ بہائیت سے متعلق بھی ہے (ماخذ ''ابراحسنی گنوری'' از مالک رام، مشمولہ ''تذکرہ معاصرین'' (جلد دوم)، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی)

منتخب اشعار

هم سے تو اپنا قصۂ غم، غیر کی طرح | عنواں بدل بدل کے سنایا نہ جائے گا

جامہ دوزی مری وحشت میں کوئی کیا کرتا | آستیں سِل نہ چکی تھی کہ گریباں نکلا

لکھ رہا ہوں نامۂ شوق ان کو یوں | جیسے آ ہی جائے گا اس کا جواب

غالباً آ گئے دن فصلِ بہاراں کے قریب | ہاتھ رک جاتے ہیں آ آ کے گریباں کے قریب

مرے نالوں کا کیوں چرچا کریں کہ میں تو ایک انساں ہوں | پڑی چوٹیں تو اُڑتے ہیں شرارے سنگ و آہن سے

فسانہ میرا سُن لو آج، ورنہ | سنو گے کل یہ دنیا کی زباں سے

بادل میں بجلی لہرائی | کس کافر نے لی انگڑائی

دُکھنے لگا دل سرد آہوں سے | اُبھری چوٹ، چلی پُروائی

اُن کی نظریں جدھر، اُدھر دُنیا | میری جانب نگاہ کون کرے

سب مسرّت طلب ہیں دنیا میں | ابر! غم سے نباہ کون کرے

اہلِ خرد کی وحشت دیکھو | دیوانہ تو پھر دیوانہ

رزمی صدیقی

نام غیور احمد، پروفیسر اور تخلص رزمی تھا۔ ۱۸۹۸ء میں قصبہ شکار پور، ضلع مظفر نگر (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ (میٹرک کی سند میں تاریخ پیدائش ۳ مارچ ۱۹۰۱ء درج ہے) آٹھ سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی سرپرستی ان کے چچا علی اصغر صاحب نے کی۔ رزمی صدیقی نے ۱۹۲۱ء میں میٹرک امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ رزمی صاحب خاندان کے پہلے فرد تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اس لیے ان کو ''بابو جی'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

رزمی صاحب نے کئی جگہ ملازمت کی، مگر کہیں نہ بن سکی۔ ۱۹۲۶ء میں رزمی صاحب نے ''امین'' اور اس کے

اگلے سال "مختار عام عدالت" کے امتحانات پاس کیے اور وکالت شروع کی، مگر یہ پیشہ ان کی طبیعت کے موافق نہیں تھا، اس لیے اسے چھوڑ دیا۔

رزمی صاحب کو شاعری کا شوق لڑکپن سے تھا۔ دہلی کی ملازمت کے دوران سائل دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے صحافت میں قدم رکھا اور دہلی کے اخبار "فاران"، رسالہ "تجلّی" اور اخبار "الامان" سے منسلک رہے۔ بعدازاں میرٹھ کے مشہور فیض عام ہائی اسکول میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ یہ ذریعہ معاش ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ دورانِ تدریس وہ اپنی علمی استعداد بڑھاتے رہے۔ بی اے کیا اور پھر فارسی میں ایم اے کیا۔

رزمی صاحب ۱۹۴۸ء میں پاکستان آ گئے۔ یہاں انھیں وزارتِ امور کشمیر میں ملازمت مل گئی اور وہ اسی وزارت کے محکمہ تعلّقات عامہ میں ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو گئے۔ اس عارضی ملازمت کے بعد ریڈیو پاکستان اور آزاد کشمیر ریڈیو سے منسلک ہو گئے اور پھر معلّمی کے شعبے میں واپس آ گئے۔ محکمۂ تعلیم پنجاب کی طرف سے ان کا تقرر گورنمنٹ کالج، کیمبل پور میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۹۵۷ء میں وہ ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔

رزمی صاحب نے سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی کی ہے۔ وہ ایک سرگرم اور فعال زندگی گزار کر ۳۱ دسمبر ۱۹۶۰ء کو راولپنڈی میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادوں اختر عالم صدیقی، انور عالم صدیقی اور اطہر عالم صدیقی نے ۱۹۹۱ء میں "کُلّیات رزمی" شائع کی جس کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے ہے:

بلاشبہ یہ کُلّیات فکر وفن کا ایک اعلا نمونہ ہے۔

منتخب اشعار

سُن! ترے سامنے خود تیری جفا کی روداد
ہم بہ عنوانِ حدیثِ دگراں کہتے ہیں

ہوئی نہ میری رسائی وہاں جہاں تُو تھا
جہاں تلاش کیا میں نے تُو وہاں نہ ملا

التجا، وعدہ، انتظار، آنسو
لیجیے کٹ گئی جوانی بھی

ان کے وعدے اگر وفا ہوتے
ہم خدا جانے کیا سے کیا ہوتے

وعدہ کرتے ہو مہربانی کا
کیا بھروسا ہے زندگانی کا

وہ خوش نصیب ہے جہدِ تلاش سے فارغ
جس آدمی کو مقدر سے آدمی مل جائے

آبلہ پائی، راہبر، دھوکا
اور بھی آئیں گے مراحل کیا؟

پتیوں پر ہیں اوس کی بوندیں
کیا کلی رو کے مسکرائی ہے؟

مجھ کو ایسے حوصلہ مندوں کی صحبت ہے عزیز ۔۔۔ رہ کے جو غاروں میں بھی کرتے ہیں کہساروں کی بات

طنزیہ ومزاحیہ اشعار

ولایت جاؤ تو اک صاحبِ روئے نکو لانا ۔۔۔ خیال یار حاجت مند رکھنا، بلکہ دولانا

رواں رشوت کا دریا ہے، گھڑا بھرنے میں ہے خطرہ ۔۔۔ اگر موقع ملے تو تم بھی اک لٹیا ڈبو لانا

بے مساوات ہیچ ہے کالج ۔۔۔ جتنے طالب ہیں، طالبات نہیں

عارفی، عبدالحیٔ

نام عبدالحیٔ، ڈاکٹر تخلص عارفی۔ ۳۰ مئی ۱۸۹۸ء کو کدورہ باونی، ضلع جھانسی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد عربی کی صرف ونحو اور فارسی درسیات کی تکمیل مولوی کاظم حسین (دادا) کی نگرانی میں ہوئی۔ اِس کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف توجہ ہوئی۔ کان پور میں اسکول میں داخل ہوئے۔ پھر ایم اے او کالج، علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ قانون کی سند لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ دس سال تک ضلع ہردوئی میں وکالت کی۔ ۱۹۳۵ء میں وکالت ترک کر کے ذریعہ معاش کے لیے ہومیو پیتھک طریق علاج اختیار کیا اور بحیثیت ہومیو پیتھک ڈاکٹر جونپور میں پریکٹس کرنے لگے۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا اشرف تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں ترک وکالت کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی نے خلعتِ خلافت اور اجازت بیعت سے سرفراز کیا۔ تقسیم ہند کے بعد عارفی کراچی آ گئے۔ ۲۷ مارچ ۱۹۸۶ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ''صہبائے سخن'' کے نام سے ان کا کلام مئی ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں: اسوۂ رسولؐ، ''مآثرِ حکیم الامّت''، ''بصائرِ حکیم الامّت''، ''معارفِ حکیم الامّت''، ''اصلاح المسلمین''۔

منتخب اشعار

کچھ سکوں کے ساتھ ان سے کہہ تو لیتے حالِ دل ۔۔۔ اے ہجومِ شوق! یہ کیا حشر برپا کر دیا

توڑنا توبہ کا سو بار بھی آساں تھا مجھے ۔۔۔ جامِ مے مجھ سے تو اک بار بھی توڑا نہ گیا

اے خیالِ دوست! رہنے دے یوں ہی بے خود مجھے ۔۔۔ جانے کیا عالم ہو میرا ہوش میں آنے کے بعد

عارفؔی اتنی خبر ہے اپنی ہستی کی ہمیں ۔۔۔ سن رہے ہوں جیسے کوئی دُور کی آواز ہم

دل کی تنہائیوں کا کیا کہنا ۔۔۔ آپ ہی آپ تھے جہاں تھے ہم

پتا چلتا نہیں کچھ بے خودی میں ۔۔۔ کہ اُن کے پاس ہیں یا دُور ہیں ہم

نہ کریں آپ مرے دل کا مداوا نہ کریں — پُرسشِ غم سے، مگر حشر تو برپا نہ کریں

تم آ گئے ہو یا ہے تصوّر نظر فریب — یا جان پڑ گئی ہے مرے انتظار میں

ذرا اے جوشِ غم! رہنے دے قابو میں زباں میری — وہ سننا چاہتے ہیں خود مجھی سے داستاں میری

اُس نے دیکھا دل کی جانب ایسے کچھ انداز سے — کائناتِ آرزو زیر و زبر ہونے لگی

آشفتہ دلی ہے نہ وہ شوریدہ سری ہے — پھر بھی، مگر اِک آگ سی سینے میں دبی ہے

جوش ملیح آبادی

نام شبیر احمد خاں، تبدیل شدہ نام شبیر حسن خاں، تخلّص جوش۔ ۵ردسمبر ۱۸۹۸ء کو ضلع ملیح آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جدّ امجد نواب فقیر محمد خان، آپ کے دادا نواب محمد احمد خان اور آپ کے والد نواب بشیر احمد خان سب شاعر تھے۔ اِس لحاظ سے جوش نے شعری فضا میں آنکھ کھولی۔ جوش کی شاعری تیرہ سال سے شروع ہوگئی تھی۔ ابتدا میں عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح لی، مگر بعد میں اپنے وجدان و ذوق کو رہبر بنایا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسکول میں داخل ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد جوش سینیئر کیمبرج سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ جوش جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد، دکن کے دارالترجمہ میں کافی عرصہ ملازم رہے۔ اس کے بعد دہلی سے اپنا رسالہ ''کلیم'' جاری کیا۔ بعدازاں حکومت ہند کے رسالہ ''آج کل'' کے مدیر اعلا منتخب ہوئے۔ آزادی کے بعد بھی جوش کچھ عرصہ ہندوستان میں رہے۔ اس کے بعد پاکستان آ گئے اور اردو ترقّیاتی بورڈ، کراچی کے مشیر خاص مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد ملازمت کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ جوش نقل مکانی کر کے اسلام آباد چلے گئے اور وہیں ۲۲رفروری ۱۹۹۲ء کو انتقال کر گئے۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ ''روحِ ادب''، ''نقش و نگار''، ''شعلہ و شبنم''، ''فکر و نشاط''، ''جنون و حکمت''، ''فرش و عرش''، ''سیف و سبو''، ''الہام و افکار''، ''رامش و رنگ''، ''آیات و نغمات''، ''سرود و خروش''، ''سموم و صبا۔'' ان کا کچھ کلام غیر مطبوعہ بھی ہے۔ وہ ایک قادرالکلام اور عہد آفریں شاعر تھے۔ اقبال کے بعد جوش نظم کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

الفاظ کا اتنا بڑا جادوگر اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا۔ (سردار جعفری)

سچ تو یہ ہے کہ جوش ایسا قادرالکلام شاعر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ (کرشن چندر)

منتخب اشعار

اب اے خدا! عنایتِ بے جا سے فائدہ — مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

ہاں آسمان! اپنی بلندی سے ہوشیار
اب سر اُٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلالِ روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عذاب تیرا

ہزار شاخیں ادا سے لچکیں، ہوا نہ تیرا سا لوچ پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے، ملا نہ رنگِ شباب تیرا

حرم ہو، مدرسہ ہو، دَیر ہو، مسجد کہ مَے خانہ
یہاں تو صرف جلوے کی تمنا ہے کہیں آ جا

فغاں! کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو، مگر فریب کھائے جا

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو مرغزار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

مجھ کو وہ بخشتے تھے دو عالم کی نعمتیں
میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

دنیا نے ہر فسانہ حقیقت بنا دیا
ہم نے حقیقتوں کو بھی افسانہ کر دیا

مرے خدا نے مرے سب گناہ بخش دیے
کسی کا رات کو یوں میں نے انتظار کیا

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

کام ہے میرا تغیّر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں
مشورے دے کے ہٹ گئے احباب

ہاں خود و زِرہ بھی تو ہے اسلام کا زیور
باندھے گا فقط جامۂ احرام کہاں تک؟

سمجھے گا اُس کا درد کون شورشِ کائنات میں
تم نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

غضب ہے یہ ادا اُن کی دمِ آرائشِ گیسو
جھکی جاتی ہیں آنکھیں، خود بخود شرمائے جاتے ہیں

کوئی حد ہی نہیں اِس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں! کل جوشؔ سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے کی ضرور
کچھ بھی ہو جائے، جوانی گنگنائے گی ضرور

ہر چیز کائنات کی لب ریزِ یاس ہے
دل کیا اُداس ہے کہ زمانہ اُداس ہے

مئے رنگیں تھا سادہ پانی بھی
ہائے، کیا چیز تھی جوانی بھی

کبھی سن لے ارے او سازِ عشرت چھیڑنے والے!
عجب آواز آتی ہے مرے ٹوٹے ہوئے دل سے

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

کتنی حقیقتوں سے فزوں تر ہے وہ فریب
دل کی زباں میں وعدۂ فردا کہیں جسے

سن لیجیے، فرصت ہے، پھر کیا ہو خدا جانے
کب سے ہیں مرے دل میں بے تاب کچھ افسانے

دل بجھ گیا ہے، سینہ خالی سا ہو گیا ہے
بیٹھا ہوا ہوں حیراں، کچھ جیسے کھو گیا ہے

نظمِ عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسی لحن میں
ہنس کے رباب اُٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے

حد ہے، اپنی طرف نہیں میں بھی
اور اُن کی طرف خدائی ہے

مرے غرور کے ماتھے پہ آ چکی ہے شکن
بدل رہی ہے تو بدلے ہوا زمانے کی

ہزار بار ہوئی گو مآلِ گل سے دوچار
کلی کی خو نہ گئی پھر بھی مسکرانے کی

خلافت ارض کی بخشی ہے جس نے
وہ آدم کا گناہِ اوّلیں ہے

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی! ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر، غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

دیوانہ، ڈاکٹر موہن سنگھ

نام سردار موہن سنگھ، تخلّص دیوانہ۔ ۱۸۹۹ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد ''جدید اردو شاعری کے رجحانات'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر کلکتہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا اور ''تاریخ ادبِ پنجابی'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی مؤقر ڈگری حاصل کی۔ اورینٹل کالج، لاہور میں تقریباً بیس سال تک انگریزی اور پنجابی کی تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۴۷ء میں بھارت چلے گئے۔ یہ اردو اور پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں انھوں نے نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں وفات پا گئے۔

منتخب اشعار

آنکھیں لڑانا، دل کو لٹانا، چوٹیں سہنا، چپ رہنا
باتیں ہیں دو چار ہی، لیکن، ہائے محبت کیا کہنا

تماشا دیکھنا مقصود تھا اپنی تباہی کا
وگرنہ چار تنکوں کے ہیں کیا معنی گلستاں میں

تھا کبھی دیوانہ سے کچھ ارتباط
تم کو شاید وہ زمانہ یاد ہو

میں پہنچ جاتا کسی دن کعبے تک
لیکن آدھی راہ پر بت خانہ تھا

صادق، سیّد صادق حسین

نام سیّد صادق حسین، تخلص صادق۔ یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوئے۔ شکر گڑھ، سیالکوٹ میں ایڈوکیٹ تھے۔ ۴؍مئی ۱۹۸۹ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔ ان کا یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے:

تُندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب!

یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

رمزی ترمزی بھوپالی

نام محمد اسماعیل۔ وطن بھوپال۔ ۱۸۹۹ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ منیر بھوپالی سے تلمذ حاصل تھا۔ کہنہ مشق شاعر تھے۔ غزل گوئی کے علاوہ نثر پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا۔

منتخب اشعار

آ گیا آنکھوں میں آنسو ایک دم　　بیٹھے بیٹھے جانے کیا یاد آ گیا

سمجھ کر رازِ جاں جس کو چھپا رکھا تھا سینے میں　　نہ جانے دل سے وہ کیوں کر زباں تک بات جا پہنچی

تسکین قریشی

نام محمد یاسین، تخلص تسکین۔ جنوری ۱۸۹۹ء میں سوروں، قصبہ کاسگنج، ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول، آگرہ میں زیرِ تعلیم رہے۔ بعدازاں گورکھ پور میں مزید تعلیم کے لیے چلے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں محکمہ پولیس میں بحیثیت سب انسپکٹر تقرر ہو گیا۔ تقریباً ۳۰؍سال فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۵۲ء میں نوکری سے سبک دوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت کورٹ انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ دو سال شفق عماد پوری سے اصلاح لی۔ ۱۹۲۰ء میں عزیز لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔ شروع میں نظمیں کہتے تھے۔ بعد میں غزل گوئی کی طرف رجحان ہوا۔ ملازمت کا زیادہ زمانہ سہارن پور میں بسر ہوا۔ پنشن کے بعد مستقل طور پر میرٹھ میں رہے۔ جگر مراد آبادی سے ان کے انتہائی اخلاص ومحبت کے روابط تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے عاشق تھے۔ تسکین قریشی نے ''مکاتیبِ جگر'' کے عنوان سے جگر کے وہ تمام خطوط شائع کیے جو ان کے پاس محفوظ تھے۔ تسکین قریشی ۲۴؍جون ۱۹۷۱ء کو آگرہ میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''سرمایۂ تسکین'' (اوّل ودوم)، ''گلگونہ''

“متاعِ تسکین۔”

منتخب اشعار

کھوئے ہوئے رہتے ہیں، نہ دنیا ہے نہ دیں یاد — اے دوست! تری یاد میں کچھ ہم کو نہیں یاد
کہتے تھے کہ تسکیںؔ کو نہ بھولیں گے کبھی ہم — سنتا ہوں مرا نام بھی اب ان کو نہیں یاد

جبر میں اختیار ہے تو، مگر — جیسے کوئی قفس میں ہو آزاد

وہ چھپے جب تک، جہاں قائم رہا — وہ نکل آئے، قیامت ہو گئی

دردِ محبت دل میں چھپایا — آنکھ کے آنسو کیسے چھپائیں

کچھ اَور پوچھیے، یہ حقیقت نہ پوچھیے — کیوں مجھ کو آپ سے ہے محبت نہ پوچھیے

کفر نے بخشا ہے تسکیںؔ! میرے ایماں کو فروغ — بت کدے ہیں بیٹھ کر رازِ حرم سمجھا ہوں میں

ہستیٔ انساں بس اک قطرہ ہے، لیکن مضطرب — وقت اک دریائے بے پایاں ہے اور خاموش ہے

اُٹھ سکا کب حجاب جلوہ گری — وہ بھی پردہ تھا جو نظر آیا

کوئی ہنستا ہے، کوئی رو رہا ہے — یہ آخر کیا تماشا ہو رہا ہے

سکوں گمرہی ہے رہِ عشق میں — قدم جب رُکے، ڈگمگانے لگے

اُن سے کہنے گئے تھے غمِ دل، مگر — جتنے شکوے تھے سب التجا ہو گئے

کفر و ایماں جادۂ اُلفت کی ہیں دو منزلیں — ایک ہے کعبے سے پہلے، ایک بت خانے کے بعد

کوئی کنارہ، کوئی سہارا، کیا جانے کب مل جائے — یہ طوفاں کی ماری کشتی، بہتی ہے تو بہنے دو

تبسّم، صوفی غلام مصطفٰی

نام صوفی، غلام مصطفٰی، تخلّص تبسّم (پہلا تخلّص صوفی)۔ ۴/اگست ۱۸۹۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ امرتسر سے میٹرک کیا۔ بی اے اور بی ٹی لاہور سے کیا اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ پھر فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور میں علوم مشرقیہ کے پروفیسر ہو گئے۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج، لاہور کے شعبہ فارسی کے صدر مقرر ہوئے اور یہیں سے ۱۹۵۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں ہفت روزہ ”لیل ونہار“ کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ لاہور کے ایرانی ثقافتی ادارے اور ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے۔ فارسی، اردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں۔ ”انجمن“ کے نام سے ان کلام چھپ گیا ہے۔ ۷/فروری ۱۹۷۸ء کو لاہور

میں انتقال کر گئے۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ۱۹۶۲ء میں ''ستارۂ خدمت'' اور ۱۹۶۷ء میں ''ستارۂ امتیاز'' کے اعزازات سے نوازا گیا۔

منتخب اشعار

رخشندہ ترے حُسن سے رُخسارِ یقیں ہے
تابندہ ترے عشق سے ایماں کی جبیں ہے

چمکی تھی کبھی جو ترے نقشِ کفِ پا سے
اب تک وہ زمیں چاند ستاروں کی زمیں ہے

چمکا ہے تری ذات سے انساں کا مقدّر
تُو خاتمِ دوراں کا درخشندہ نگیں ہے

دردمندوں کو کسی نے تو پکارا ہو گا؟
اِس بھری بزم میں کوئی تو ہمارا ہو گا؟

فغانِ حق وصداقت کا مرحلہ ہے عجیب
دبے تو بند و سلاسل، اُٹھے تو دار نصیب

اب کس مپرسیٔ غمِ جاناں نہ پوچھیے
اب ہو گئے ہیں ہم غمِ دوراں سے آشنا

ایسے بھی تھے کچھ حالات
دل سے چھپائی دل کی بات

ہزار گردشِ شام وسحر سے گزرے ہیں
وہ قافلے جو تری رہگذر سے گزرے ہیں

ہر ایک نقش پہ تھا، تیرے نقشِ پا کا گماں
قدم قدم پہ تری رہگذر سے گزرے ہیں

یہ رات کی خاموشی، یہ عالمِ تنہائی
پھر درد اُٹھا دل میں، پھر یاد تری آئی

دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبت کے
آغاز بھی رسوائی، انجام بھی رسوائی

اُن مدھ بھری آنکھوں میں کیا سحر تبسم تھا
نظروں میں محبت کی دُنیا ہی سمٹ آئی

موت کی دھمکیاں نہ دو ہم کو
موت کیا زندگی نہیں ہوتی؟

وہ ہاتھ جن سے تھا کل چاک دامنِ ادراک
وہ ہاتھ آج اُٹھانے پڑے دعا کے لیے

وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیرِ شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

شاکی بھوپالی

نام احمد اللہ خاں، شاکی تخلّص۔ بھوپال کے رہنے والے اور دورِ حاضرہ کے کہنہ مشق شاعر تھے۔

منتخب اشعار

اے باغ بان! غنچۂ پژمردہ کو نہ پھینک
خوش بُو نہیں تو خونِ تمنّا کی بُو تو ہے

حیات موت کی پابندیاں، ارے توبہ!
یہ کس عذابِ دو عالم میں مبتلا ہوں میں

اختر، پنڈت ہری چند

نام پنڈت ہری چند، تخلص اختر۔ ۱۵؍اپریل ۱۹۰۰ء کو صاحبا گاؤں، ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ حفیظ جالندھری سے تلمذ حاصل تھا۔ سرکاری ملازم رہے۔ اخبار نویسی کی۔ آل انڈیا ریڈیو میں بھی ملازم رہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان چلے گئے۔ سنجیدہ کلام کے ساتھ ساتھ مذاحیہ اشعار بھی کہتے تھے۔ یکم؍جنوری ۱۹۵۸ء کو نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔

منتخب مزاحیہ اشعار

کہا ہم چین کو جائیں، کہا تم چین کو جاؤ — کہا جاپان کا ڈر ہے، کہا جاپان تو ہوگا

کہا کابل چلے جائیں، کہا کابل چلے جاؤ — کہا افغان کا ڈر ہے، کہا افغان تو ہوگا

کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں، کہا تم اونٹ پر بیٹھو — کہا کوہان کا ڈر ہے، کہا کوہان تو ہوگا

منتخب سنجیدہ اشعار

شباب آیا کسی بت پر فدا ہونے کا وقت آیا — مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی — ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

جنھیں حاصل ہے تیرا قرب، خوش قسمت سہی، لیکن — تری حسرت لیے مر جانے والے اور ہوتے ہیں

خودی کی ابتدا یہ تھی کہ اپنے آپ میں گم تھا — خودی کی انتہا یہ ہے، خدا کو یاد کرتا ہوں

حامد بھوپالی

نام حامد سعید خاں، تخلص حامد۔ بھوپال وطن تھا۔ شہید ٹونکی اور ذکی وارثی سے تلمذ حاصل تھا۔ بھوپال کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ وہ قدیم وجدید شاعری کے دَور کی درمیانی کڑی تھے۔ ۲۷؍فروری ۱۹۶۰ء کو ۶۰ سال کی عمر سے زیادہ متجاوز ہو کر انتقال ہوا۔

منتخب اشعار

اسی طرح سے بارہا اُٹھی ہے سُرمگیں نظر — مگر یہ آج دفعتاً سکونِ دل کو کیا ہوا

جہاں تھے عشق کے سجدے نہ حُسن کی نخوت — میں اُس مقام سے بھی آپ کو پکار آیا

اسے تلاش کی معراج جانتا ہوں میں — کہ ان کو ڈھونڈ لیا اور کھو گیا ہوں میں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا محبت نے
جہاں وصال بھی ہونے لگا گراں مجھ کو

ضبط کی تلخیوں کے ساتھ ہلکی سی آہ بھی سہی
آ وُ جنونِ شوق میں ایک گناہ بھی سہی

سن کر کوئی تعبیر نہ دے دے کہیں، ورنہ
پاکیزگیٔ خوابِ زلیخا نہ رہے گی

ہر حسرتِ نگاہ تری جلوہ گاہ میں
اپنی جگہ پر ایک مکمّل سوال ہے

یہ بھی آدابِ محبت ہیں کہ حامدؔ عشق میں
زخم کھاتے جائیے اور مسکراتے جائیے

دنیا کی وسعتیں بھی دیتی نہیں پناہیں
کیا سوچ کر اُٹھا تھا اِس بت کے آستاں سے

خدا ہی خیر کرے رازِ کائنات کی اب
تمام عمر میں دیوانہ مسکرایا ہے

حفیظ جالندھری

نام محمد حفیظ، ابوالاثر کنیت، حفیظؔ تخلّص۔ ۱۴؍ جنوری ۱۹۰۰ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ مروّجہ دینی تعلیم کے بعد اسکول میں داخل ہوئے۔ چند جماعتیں پاس کی تھیں کہ اسکول سے بھاگ گئے اور اس طرح تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حفیظ کو بچپن ہی سے شعر وسخن سے دلچسپی تھی۔ مولانا غلام قادر گرامی جو ان کے ہم وطن تھے، اُن کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ والدین نے ان کی شادی کم عمری میں کر دی تھی۔ کسبِ معاش کے لیے عطر فروشی، کلاہ سازی، خیاطی، فوج کی ٹھیکیداری، خطوط نویسی، مزدوری، سنگر سیونگ مشین کمپنی کی مینیجری، سب کچھ کر ڈالا۔ ۱۹۲۱ء میں سنگر کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی اور وطن واپس آ گئے۔ وہاں سے اردو زبان میں ایک ماہانہ رسالہ ''اعجاز'' جاری کیا جو پانچ ماہ بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۲۲ء میں لاہور آئے۔ ان کا شروع سے اُس وقت تک شعر وادب اوڑھنا بچھونا تھا۔ رسالہ ''شباب'' میں ملازمت کر لی۔ اس کے بعد ''نونہال'' اور ''ہزار داستان'' کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ پھر ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' سے منسلک رہے۔ کچھ عرصہ ریاست خیر پور کے درباری شاعر رہے۔ نظم ''رقاصہ'' وہیں کی یادگار ہے۔ ''قومی ترانہ'' کے خالق کی حیثیت سے حفیظ کو بہت شہرت ملی۔ ۲۱؍ دسمبر ۱۹۸۲ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ اوّلاً ماڈل ٹاؤن لاہور میں تدفین ہوئی، بعد میں ۲۷؍ ستمبر ۱۹۹۱ء کو جسدِ خاکی مقبرۂ خاص نزد مینارِ پاکستان، لاہور میں منتقل کیا گیا۔ حفیظ جالندھری کی چند تصانیف یہ ہیں۔ ''نغمۂ زار''، ''سوز وساز''، ''تلخابۂ شیریں''، ''چراغِ سحر''۔ ''شاہنامۂ اسلام'' (چار جلدوں میں)۔ ''شاہنامۂ اسلام'' سے ان کی شہرت میں بہت اضافہ ہوا۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے۔ بچوں کے لیے گیت اور نظمیں بھی لکھیں۔

''شاہنامہ اسلام'' زندہ رہنے والی کتاب ہے۔ (سر عبدالقادر)

منتخب اشعار

بت کدے سے چلے ہو کعبے کو — کیا ملے گا تمھیں خدا کے سوا

یہ زندگی فریبِ مسلسل نہ ہو کہیں — شاید اسیرِ دام بلا ہو گیا ہوں میں

سپردِ خاک ہی کرنا ہے مجھ کو — تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں؟

جس نے اس دَور کے انسان کیے ہیں پیدا — وہی میرا بھی خدا ہو، مجھے منظور نہیں

کسی نے بھی نہ پہچانا وطن میں — میں سمجھا تھا بہت شہور ہوں میں

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصّہ ہے — نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

ناکامیٔ عشق یا کامیابی — دونوں کا حاصل خانہ خرابی

آنکھیں سیہ مست، چہرہ کتابی — بادہ شبانہ، جام آفتابی

اُن کا بہانہ برجستہ گوئی — میرا تبسّم حاضر جوابی

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف — اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

جدھر دیکھو ہجومِ رہبراں ہے — کہاں ڈھونڈوں مرا رہزن کہاں ہے

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے — مجھ کو نہ لے چلو مری نیّت خراب ہے

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے — تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمھیں بھلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمیٔ مزاجِ دوست — اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

رہزنوں سے تو بھاگ نکلا تھا — اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

برہمن نالۂ ناقوس مسجد تک تو پہنچا دے — بُرا کیا ہے مؤذّن بھی اگر بیدار ہو جائے

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں — کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

معصوم اُمنگیں جھول رہی ہیں دل داری کے جھولوں میں — یہ کچی کلیاں کیا جانیں، کب کھلنا، کب مرجھانا ہے

بہزاد لکھنوی

نام سردار احمد خاں، تخلّص بہزاد۔ یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وطن لکھنؤ۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد ریلوے میں عرصے تک ٹی ٹی آئی رہے۔ اختلاج قلب کی شکایت کی وجہ سے نوکری چھوڑ دی۔ قدرے سکون جب ہوا

تو آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۳ء تک پنچولی فلم کمپنی، لاہور میں بطور مکالمہ نویس رہے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ میں ملازم رہے۔ ۱۹۴۶ء میں گیت نگار کی حیثیت سے راج کمل کلا مندر، بمبئی میں ملازم رہے اور ۱۹۵۱ء تک فلمی دنیا سے منسلک رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور ریڈیو پاکستان، کراچی سے ۱۹۶۳ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۶۵ء میں صدرِ پاکستان نے دو سو روپیہ ماہانہ وظیفہ جاری کیا۔ بہزادؔ لکھنوی کا تعلق خانقاہِ نیازیہ بریلی سے ہے۔ یہ نعت گو کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ شاعری کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''نغمۂ نور''، ''کیف و سرور''، ''موجِ طہور'' اور ''چراغِ طور'' وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

مرا بخت، مجھ کو بڑا غم رہے گا — اگر زندگی میں نہ دیکھا مدینہ

یہی مجھ کو بہزادؔ بس ایک دُھن ہے — مدینہ، مدینہ، مدینہ، مدینہ

کدھر سے یہ بادِ صبا آ رہی ہے — مدینے کی یاد آج تڑپا رہی ہے

گدا نواز نے سب کے تو ہاتھ تھام لیے — ہمارا دستِ طلب مسکرا کے چھوڑ دیا

ہاں مجھے آج تک تو تھا رنگِ جہاں پہ اعتبار — تُو نے نگاہ پھیر کے رنگ جہاں بتا دیا

آ مری کائناتِ دل، میری بہارِ زندگی — آ کہ میں یہ نہ کہہ سکوں، مجھ کو خدا نہ مل سکا

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے — منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے

اے دل کی خلش گر یوں ہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں — اُس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آ جائے

آتا ہے جو طوفاں آنے دے، کشتی کا خدا خود حافظ ہے — مشکل تو نہیں ان موجوں میں بہتا ہوا ساحل آ جائے

آدمی تو ملے زندگی میں بہت — دل تڑپتا رہا آدمی کے لیے

اک آہ کر کے تُو نے اللہ رے قلبِ سوزاں — دنیا ہلا کے رکھ دی، فریادِ مختصر سے

اِرمؔ لکھنوی

نام شہنشاہ حسین، اِرمؔ تخلص۔ انگریزی اور فارسی میں ایم اے تھے۔ ریڈیو پاکستان، کراچی سے منسلک رہے۔ وہ مغربی اور مشرقی علوم سے اچھی طرح واقف تھے اور اِسی وجہ سے شعر و ادب کا نہایت ستھرا ذوق اور گہرا شعور رکھتے تھے۔ آرزوؔ لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۵؍ فروری ۱۹۶۷ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

رات بھر قائم رہا ہے انتظار　آنے والا صبح تک آتا رہا
دونوں دیوانوں میں اچھی کٹ گئی　دل مجھے، میں دل کو سمجھاتا رہا
ایک نغمہ تھی محبت کی صدا　دل وہی آواز دُہراتا رہا
آپ نے اپنوں کو پوچھا بھی تو غیروں کی طرح　اک نئی طرزِ ستم ایجاد ہو کر رہ گئی
وہ یہ کہتے ہیں کہ جا اب رُست گاری ہو گئی　اے جنوں! زنجیر یہ تو اور بھاری ہو گئی
آئینے میں اپنی صورت دیکھتا جاتا تھا میں　دفعتاً پیش نظر صورت تمھاری ہو گئی
ہم باغِ تمنا میں دن اپنے گزار آئے　آئی نہ بہار اب تک، شاید نہ بہار آئے
ٹکرایا ترے در سے اک نعرۂ مستانہ　بے نام لیے تیرا ہم تجھ کو پکار آئے
گِلہ نہیں ہے اندھیرے کا اس کی حسرت ہے　کوئی چراغ اندھیرے میں ہم جلا نہ سکے
اب آؤ مِل کے اُسی ربط ہی پہ غور کریں　جو تم بڑھا نہ سکے اور ہم گھٹا نہ سکے

شاد عارفی

نام احمد علی خاں، عرفیت لڈن خاں، تخلّص شاد۔ ۱۹۰۰ء میں لوہارو میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع میں شفق رام پوری اور جلیل مانک پوری سے اصلاح لی۔ ان کی غزل کا لب ولہجہ اپنے معاصر شعرا سے بہت مختلف ہے۔ دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ مختلف فیکٹریوں میں چھوٹی موٹی ملازمت، ایڈیٹری، ٹیوشن، پروف ریڈنگ، شاگردوں کی اصلاح کا معاوضہ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اتنے مفلوک الحال تھے کہ اپنے شاگرد مظفر حنفی کو منع کر دیا کہ وہ ان کے گھر نہ آئیں کیوں کہ ان کے گھر میں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست نہیں ہے۔ ایک طویل علالت کے بعد ۸؍جنوری ۱۹۶۴ء کو رام پور میں وفات پا گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''اندھیر نگری''، ''سفینہ چاہیے''، ''کلّیات شاد عارفی''۔

منتخب اشعار

چور کی داڑھی میں تنکے کا منظر اکثر دیکھا　میرے رہزن کے فقرے پر راہ نمانے مڑ کر دیکھا
جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی　چوم لوں مُنہ آپ کی تلوار کا

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو | گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں
یہی ہے شادؔ میں سب سے بڑا عیب | وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے
ہمسایوں کو ذہن میں رکھ کر | اپنے گھر کو آگ لگا دی
رنگ کو دھوپ کھا گئی، بُو کو ہوا اُڑا گئی | کہیے اِس اعتبار سے آئی بہار یا گئی؟
چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اُٹھا لا ساقی | شیخ صاحب! میں سمجھتا تھا مسلماں ہے کوئی
اپنی حالت کے بدلنے پر اگر آ جائے | کوئی مشکل نہیں انسان بدل سکتا ہے
جس باغباں کے ساتھ لڑے تھے خزاں سے ہم | حیرت یہ ہے وہ آج ہمیں پہچانتا نہیں
ہجومِ غم میں نہیں عشرتوں کی تاب مجھے | نہ مسکرا کے عطا ہو کوئی جواب مجھے
شریکِ بزمِ سیاست ہیں کچھ 'بڑے چہرے' | ذرا قریب تو لاؤ کہ روشنی کم ہے

حیرت شملوی

عبدالمجید خاں نام، حیرتؔ تخلص۔ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ وطن شملہ (بھارت) تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ میٹرک شملہ سے کیا۔ علی گڑھ سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کیا۔ اس کے بعد جب حیرتؔ ایم اے میں داخلہ لینے والے تھے کہ ان کے والد کو کسی ذریعہ سے خبر ملی کہ حیرتؔ خلافت تحریک سے متاثر ہیں اور بہت ممکن ہے کہ کہیں وہ اس تحریک میں عملی حصّہ نہ لیں۔ حیرتؔ کو ان کے والد نے علی گڑھ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا حیرتؔ ایم اے نہ کر سکے۔ بعد میں خاندانی حالات کی وجہ سے حیرتؔ نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ حیرتؔ ۱۹۲۲ء سے شاعری کر رہے تھے، مگر کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ انھوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ فوجی اخبار کے پروف ریڈر رہے۔ آخر میں مرکزی اسمبلی ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۴ء میں ان پر فالج کا اثر ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں قبل از وقت ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ ۹ر ستمبر ۱۹۶۴ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

آسماں کے جَور کا بھی ذکر ہم کرتے نہیں | کیا خبر چل کر کہاں سے بات جا پہنچے کہاں
کیا کہیے، کون کہے، کس سے کہے، حالتِ دل | تم نے رکھا بھی ہے کچھ کہنے کے قابل مجھ کو
ابھی سے ساز نہ چھیڑو کوئی طرب انگیز | ابھی کچھ اور مجھے سوگوار رہنے دو

کاٹنا جس کا سخت مشکل تھا	وہ بھی آخر گھڑی گزر ہی گئی
اس شب و روز کی مصیبت سے	دیکھیے کب نجات ہوتی ہے
دلدادگانِ بادہ و ساغر کو کیا خبر	ہم کو پیے بغیر ہی کتنا سرور ہے
جس کے آغوشِ وفا میں پرورش پاتی رہی	موجِ مضطر نے اُسی ساحل کے ٹکڑے کر دیے

انور صابری

نام رونق علی شاہ، علاّمہ، انور تخلّص۔ ۱۰ر مئی ۱۹۰۱ء کو پاک پٹن میں پیدا ہوئے۔ دیو بند، ضلع سہارن پوران کا وطن تھا۔ جیب حسن وحشی دیو بندی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۳ر اگست ۱۹۸۵ء کو دیو بند میں انتقال کر گئے۔ ان کا محض ایک ہی شعر ملا جو پیش خدمت ہے:

روز آپس میں لڑا کرتے ہیں اربابِ خرد
کوئی دیوانہ الجھتا نہیں دیوانے سے

متّل، گوپال

نام گوپال متّل، تخلّص متّل۔ ۱۱ر جون ۱۹۰۱ء کو مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ بی اے سناتن دھرم کالج، لاہور سے کیا۔ ۱۹۴۸ء میں لاہور سے دہلی منتقل ہو گئے۔ ماہ نامہ ''تحریک'' کے مارچ ۱۹۵۳ء سے جون ۱۹۸۱ء تک اڈیٹر رہے۔ انھیں شاعری، اور تنقید کے علاوہ صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۹۷۷ء میں انھیں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بہار اردو اکادمی نے ان کی مجموعی خدمات پر انعام دیا۔ انھوں نے متعدّد بیرونی ممالک کا سفر کیا۔ گوپال متّل ۱۵ر مارچ ۱۹۹۳ء کو نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔ ان کی چند تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''دوراہا''، ''شرارِ نغمہ''، ''صحرا میں اذان'' (شعری مجموعے)، ''پھول اور کانٹے'' (افسانے)، ''گاندھی'' (سوانح)، ''ادب میں ترقی پسند تحریک'' (اصلاً انگریزی)، ''چین میں اسلام کا ماضی اور حال''، ''لاہور کا جو ذکر کیا'' (یادداشتیں)۔

منتخب اشعار

مجھے زندگی کی دعا دینے والے	ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر
خدا گواہ کہ دونوں ہیں دشمنِ پرواز	غمِ قفس ہو کہ راحت ہو آشیانے کی
ہے دھوپ مرے سر پہ، مگر تُو بھی مری جاں	گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں کھڑا ہے

مفلسی اور عاشقانہ مزاج — دینے والے یہ کیا دیا تُو نے
گئے وہ دن کہ تھا غیروں سے شکوہ — اب اپنے آپ سے شرمندگی ہے

دُعا ڈبائیوی

نام سیّد مرتضیٰ حسین، دُعا تخلّص۔ ۱۳ر جون ۱۹۰۱ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد کا وطن ڈبائی، ضلع بلند شہر تھا۔ ابتدا میں ریاض بدایونی اور پھر نوح ناروی سے تلمذ رہا۔ ۱۹۵۵ء میں ہندوستان میں سپرنٹنڈنٹ ریلوے کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ بعدازاں پاکستان آ گئے۔ جنوری ۱۹۸۲ء میں کراچی میں وفات پا گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''تاثیرِ دعا''، ''تصویرِ دعا''، ''تنویرِ دعا''

منتخب اشعار

آپ کے انکار نے برپا تلاطم کر دیا — آ گئی تھی کشتیٔ امید ساحل کے قریب
سوتی رہی خدا کی خدائی تمام رات — اک ہم تھے ہم کو نیند نہ آئی تمام رات
کائناتِ دہر میں ہم پر ہی طاری ہے جمود — ورنہ ہر ذرّے کو سرگرمِ عمل پاتا ہوں میں
آپ مسرور اور ہم رنجور — کیا محبت اِسی کو کہتے ہیں؟
اِن مدبھری آنکھوں کی تعریف ہو کیا زاہد — دیکھو تو ہیں دو ساغر سمجھو تو ہیں مے خانہ
تمھیں ازبر ہے رودادِ محبت ساری دنیا کی — کسی بربادِ غم کی بھی کہانی یاد آتی ہے؟
دُنیا ابھی آگاہ نہیں عظمتِ دل سے — قبلہ بھی یہی اور یہی قبلہ نما ہے
اعتمادِ دوست دے جائے نہ دھوکا دیکھیے — آپ نے دنیا کہاں دیکھی ہے، دنیا دیکھیے
ذرا سا وقت، لاتعداد صورت کے تماشائی — یہ کیا سوجھی کہ وعدے کر لیے سب سے قیامت کے
اسیر کر کے قفس میں یہ کہہ گیا صیّاد — بس اب تو خواب ہی دیکھو گے آشیانے کے
کبھی چمن کی ہمیں بھی فضا میسّر تھی — مگر یہ قصّے ہیں گزرے ہوئے زمانے کے
بہ الفاظ دگر تقدیر اسی کو لوگ کہتے ہیں — جب اپنی کوششوں سے آدمی مجبور ہو جائے
وائے قسمت جن کی خاطر میں نے دنیا چھوڑ دی — وہ یہ فرماتے ہیں تم نے کیا کیا میرے لیے؟

نیّر واسطی

نام سیّد علی احمد، حکیم، نیّر تخلص۔ ۱۹۰۱ء میں نہٹور، ضلع بجنور (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں فارغ التحصیل ہو کر لاہور آ گئے اور طبابت شروع کی۔ برصغیر کے مشہور حاذق طبیب تھے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی، فرنچ اور ترکی زبانوں کے فاضل تھے۔ ۲۶ رمئی ۱۹۸۲ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ رکن وفاقی مجلسِ شوریٰ (۸۲۔۱۹۸۱ء)، چیئر مین آیورویدک بورڈ، حکومتِ پاکستان۔ اعزاز: ستارۂ خدمت (۱۹۶۱ء)۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''مے کدہ''، ''شعر و حکمت''، ''اختر و سلمیٰ''، ''طبِ یونانی''، ''طبّ العرب'' (انگریزی سے ترجمہ)۔

منتخب اشعار

اب بھی اک کوچے سے وابستہ ہے اک تلخ سی یاد
اب بھی اک راہ سے بھولے سے گزر جاتا ہوں

مجھ کو اللہ کے بندوں نے دیے ہیں وہ فریب
نام سنتا ہوں جب اللہ کا، ڈر جاتا ہوں

آ جاؤ کہ ایک بار ہنس لیں
رونے کو تو زندگی پڑی ہے

نہال سیوہاروی

نام منشی عبدالخالق، نہال تخلص۔ ۲۷ راگست ۱۹۰۱ء کو سیوہارہ، تحصیل دھام پور، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ کم سنی سے شعر کہتے تھے۔ سائل دہلوی اور بیباک شاہ جہاں پوری کے شاگرد تھے۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ نوجوانی میں تلاش روزگار کے سلسلے میں دہلی آئے۔ انھیں ڈویژنل اکاؤنٹس آفس، نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ملازمت مِل گئی۔ تقسیم ہند تک اور قیام پاکستان کے بعد اسی ادارے میں کام کرتے رہے۔ ۲۹ ردسمبر ۱۹۵۱ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ''گلبانگِ آزادی''، ''نہالستان'' اور ''شباب و انقلاب'' ان کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

منتخب اشعار

ترے خیال میں ہر چیز سے اُٹھایا ہاتھ
ترے خیال سے اب ہاتھ میں اُٹھاؤں کیا

کچھ اور اس سے سوا وسعتِ نظر یارب
تجلیات مہ و کہکشاں سے کھیل چکا

حق کو آنے دے زمانے کی زباں پر پھر دیکھ
کتنے منصور سرِ دار نظر آتے ہیں

اندھیری رات، تھکی ہمتیں، گراں منزل
سلامتی کی دعا مانگ کارواں کے لیے

زمینِ کوچۂ جاناں سے آ رہی ہے صدا
بلندیاں نہیں مخصوص آسماں کے لیے

مُلّا، آنند نرائن

نام پنڈت آنند نرائن، تخلص ملّا۔ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں انٹرنس پاس کیا۔ کیننگ کالج، لکھنؤ سے ۱۹۱۹ء میں ایف اے، ۱۹۲۱ء میں بی اے، ۱۹۲۳ء میں ایم اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل ایل بی پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھے، مگر اردو میں کم نمبر ملنے کی وجہ سے فیل ہو گئے جس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے تمام جوابات انگریزی میں لکھے۔ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ پہلے انگریزی بعد میں اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ ترقّی کر کے الہ آباد ہائی کورٹ میں جج کے عہدے تک پہنچے۔ انجمن ترقیٔ اردو ہند کے صدر بھی رہے۔ انھوں نے اعلان کیا تھا کہ میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں، لیکن اردو کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ۱۲؍جون ۱۹۹۷ء کو نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''جوئے شیر''، ''کربِ آگہی''، ''کچھ ذرّے کچھ تارے''، ''میری حدیثِ عمر گریزاں''۔

منتخب اشعار

تری اُجڑی ہوئی جنّت کو بسانے والا
وہی غصّے میں نکالا ہوا انساں نکلا

اب اور اس سے سوا چاہتے ہو کیا ملّاؔ
یہ کم ہے اُس نے تمھیں مسکرا کے دیکھ لیا

عرش بریں پہ چمکا آج اور اک ستارہ
کس نے خلوص دل سے سر رکھ دیا زمیں پر

یہ کہہ کے آخر شب شمع ہو گئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

ابھی شباب ہے کرلوں خطائیں جی بھر کے
پھر اس مقام پر عمرِ رواں ملی نہ ملی

ہاں ایک بار اور اُلٹ دو نقابِ رُخ
لو پھر سے اپنے ہوش میں ہم آئے جاتے ہیں

شیخ جی! ملّاؔ پہ لعنت بھیجیے، کافر ہے وہ
آئیے ہم آپ کچھ اسلام کی باتیں کریں

ہاں، دوسرے کا درد ہے پھر دوسرے کا درد
لینے کو اپنے دل پہ اثر ہم ہزار لیں

بھرم حُسنِ حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا
نظر جب سامنے آئی، تجلّی درمیاں کر دی

یہ دل کیا ہے، کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا
تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف
پھر خوں کو یوں نہ دیکھا رگوں میں رواں کبھی

ملاّ بنا دیا ہے اِسے بھی محاذِ جنگ ۔۔۔ اک صلح کا پیام تھی اردو زباں کبھی

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مِل گئی فرصت ۔۔۔ یہاں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

تری ہستی سے منکر ہوتے جاتے ہیں جہاں والے ۔۔۔ سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے!

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا رُوئے ہستی سے ۔۔۔ ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

گم کتنے کارواں ہوئے ایماں کے نور میں ۔۔۔ اچھے رہے جو سایۂ الفت میں آ گئے

الم مظفرنگری

نام محمد اسحاق، الم تخلص۔ تقریباً ۱۹۰۱ء میں موضع پڑانہ، ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے۔ دینیات، قرآن شریف، فقہ، حدیث، تفسیر اور عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علم نجوم کی طرف راغب ہوئے۔ السنہ شرقیہ کے اعلا امتحانات الہ آباد اور پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے اور تدریس کا پیشہ اپنایا۔ شروع میں ایڈورڈ کالج میں استاد رہے۔ بعد ازاں ۱۹۴۳ء میں استعفیٰ دے کر اسلامیہ کالج، مظفرنگر میں اردو اور فارسی کے لکچرر ہو گئے۔ ۱۹۶۳ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ علم نجوم پر بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اس موضوع پر ان کے مضامین اخبارات اور رسائل میں تواتر سے چھپتے رہے۔ الم مظفرنگری کو شعر و ادب سے فطری طور پر لگاؤ تھا۔ انھیں سیماب اکبرآبادی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء کو مظفرنگر میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''سلسبیل''، ''کوثر و تسنیم''، ''سدرہ وطوبیٰ''، ''آہنگ سرمدی'' (گیتا کا منظوم ترجمہ)، ''حجلۂ گل''، ''معرکۂ کربلا''، ''تاریخ و ادب''، ''آہنگ سرمدی'' پر اترپردیش گورنمنٹ کی طرف سے انھیں ۱۵۰؍روپیہ ماہانہ آخر وقت تک ملتا رہا۔ ''گیتا منظوم'' پر یوپی گورنمنٹ کی طرف سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔

منتخب اشعار

شورشِ ہستی کے ضامن، حُسن کے جلوے بھی تھے ۔۔۔ عشق تنہا باعثِ ہنگامۂ محفل نہ تھا

کسی نے بھی نہ دیکھا اے زلیخا! چاک دل تیرا ۔۔۔ بڑے بے درد تھے سب چاکِ داماں دیکھنے والے

ازل کے دن سے بیاں کر رہا ہوں میں پھر بھی ۔۔۔ فسانۂ غمِ ہستی تمام ہو نہ سکا

وہ کیا سمجھے گا شمع بزم کے سوزِ مسلسل کو ۔۔۔ جو پروانہ ہلاکِ مرگِ آساں ہوتا جاتا ہے

کسی بہارِ گذشتہ کی یادگار تو ہے ۔۔۔ ہمارا باغِ تمنّا خزاں رسیدہ سہی

اثر صہبائی

نام خواجہ عبدالسمیع پال، اثرؔ تخلّص۔ ۲۸ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی جہاں سے ۱۹۱۸ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں اسلامیہ کالج، لاہور سے بی اے پاس کرنے کے بعد وکالت کرنے لگے۔ چند سال اسی طرح گزار کر ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ کچھ عرصہ اپنے وطن سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے رہے، پھر جموں چلے گئے۔ وہاں ۱۹۴۶ء میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ چند ماہ بعد جموں وکشمیر ہائی کورٹ میں اسسٹنٹ ایڈوکیٹ ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد سیالکوٹ واپس آ گئے۔ ۱۹۴۸ء میں کچھ عرصہ اسسٹنٹ کسٹوڈین کے فرائض انجام دینے کے بعد سرکاری وکیل ہو گئے۔

اثر صہبائی نے اپنا کلام اپنے بڑے بھائی امین حزیں کو دکھایا۔ کچھ غزلیں تاجور نجیب آبادی کو دکھائیں۔ اس کے علاوہ برجموہن کیفی اور اثر لکھنوی نے بھی ان کے کلام کا کافی حصہ دیکھ کر اپنے مشوروں سے نوازا۔ ۲۶ر جون ۱۹۶۳ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''جامِ صہبائی''، ''خمستان''، ''جامِ طہور''، ''نور و نکہت''، ''روحِ صہبائی''، ''راحت کدہ۔'' رباعی آثر کی کامیاب ترین صنفِ سخن ہے۔

منتخب اشعار

سرحدِ عقل سے پرے، رفعتِ عرش سے بلند — جانے کہاں نکل گیا میں تجھے ڈھونڈتا ہوا

یہ حُسن دل فریب، یہ عالم شباب کا — گویا چھلک رہا ہے پیالہ شراب کا

پھر مطربِ بہار نے چھیڑا ربابِ عشق — پھر دل میں تیری یاد سے محشر بپا ہوا

چھوڑ کر دیر و حرم آئے تھے مے خانے میں ہم — اب خدا جانے کہاں جائیں گے مے خانے کے بعد

میرے لیے تو عشق ہے ایک سرودِ جاوداں — میں نہ کبھی سمجھ سکا، جَور ہے کیا، ستم ہے کیا

تیرے شباب نے کیا مجھ کو جنوں سے آشنا — میرے جنوں نے بھر دیے رنگ ترے شباب میں

شبنم کے آنسوؤں سے ہیں پھولوں کے گال تر — فطرت رُلا رہی ہے ہنسانے کے ساتھ ساتھ

آنکھ اگر ہو حق شناس، آتا ہے تُو ہی تُو نظر — ورنہ تمام کائنات بت کدۂ نمود ہے

دو جہاں لے کے بھی تمھارے بغیر — زندگی میں کمی سی رہتی ہے

اب تمنا تو کوئی دل میں نہیں — مگر اک اضطراب باقی ہے

تاثیر، محمد دین

نام محمد دین ڈاکٹر، تاثیر تخلص۔ ۲۸رفروری ۱۹۰۲ء کو قصبہ اجنالہ، ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں ان کے والدین کا انتقال ہوگیا۔ اپنے خالو نظام الدین کے گھر لاہور میں پرورش پائی۔ میٹرک لاہور سے کیا اور وہیں سے ۱۹۲۶ء میں انگریزی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۲۲ء میں ''نیرنگِ خیال'' کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں اسلامیہ کالج، لاہور میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں وہ ولایت چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں وہ واپس آئے اور ایم اے۔ او کالج امرتسر میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ بعدازاں ۱۹۴۰ء میں سری پرتاب کالج، سری نگر کے پرنسپل ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران تعلیمی زندگی سے الگ ہو کر مختلف محکموں میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ دوبارہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۳۰رنومبر ۱۹۵۰ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''آتش کدہ''، ''مقالاتِ تاثیر''، ''کنول'' (ناول)، "Iqbal, the Universal Poet" (انگریزی مقالات، مرتبہ: افضل حق قریشی)

منتخب اشعار

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

جنابِ شیخ! وضو کے لیے سہی، لیکن
کسی بہانے لبِ جُو نکل ہی آتے ہیں

ہزار ہم سخنی ہو، ہزار ہم نظری
مقام جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں

داورِ حشر! مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

تم کیا گئے کہ سارا زمانہ چلا گیا
وہ رات دن نہیں ہیں، وہ شام وسحر نہیں

زلف آوارہ، گریباں چاک، اومستِ شباب!
تیری صورت سے تجھے دردآشنا سمجھا تھا میں

یہ ڈر ہے قافلے والو، کہیں نہ گُم کردے
مرا ہی اپنا اُٹھایا ہوا غبار مجھے

دل نے آنکھوں سے کہی، آنکھوں نے ان سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقیں سے واصل
انتہا عقل کی یہ ہے کہ گماں تک پہنچے

میکش اکبرآبادی

نام سیّد محمد علی شاہ، تخلص میکش۔ ۳رمارچ ۱۹۰۲ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ درسِ نظامیہ کی تکمیل مدرسہ عالیہ

آ گرہ سے کی۔ ان کا مشغلہ تصنیف و تالیف رہا۔ ۲۵ راپریل ۱۹۹۱ء کو آ گرہ میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف اور تالیفات کے نام یہ ہیں۔ ''مے کدہ''، ''حرفِ تمنّا'' (شعری مجموعے)، ''نغمہ اور اسلام'' (جوازِ سمع)، ''نقدِ اقبال'' (تنقید)، ''شرک و توحید'' (مذہب)، ''حضرت غوث الاعظم'' (مذہب)، ''مسائل تصوف'' (ادب)۔ ''حرفِ تمنّا'' ''نقدِ اقبال'' اور ''مسائل تصوف'' پر اتر پردیش اردو اکادمی کی طرف سے انعامات ملے۔ وہ شاعر کے علاوہ نقاد اور ماہر اقبالیات و تصوّف تھے۔

منتخب اشعار

یہ حال کیا ہے کہ آغوش میں تجھے لے کر ——— تمام عمر ترا انتظار میں نے کیا

پہنچ ہی جائے گا یہ ہاتھ تیری زلفوں تک ——— یوں ہی جنوں کا یہ سلسلہ اگر دراز رہا

بت کدے والوں کو تھی ہم سے شکایت کیا کیا ——— اب پڑی سر پہ جو اپنے تو خدا یاد آیا

ہر بار ملے ہم اُن سے ایسے ——— جیسے نہ کبھی ملیں گے اب ہم

آپ کی میری کہانی ایک ہے ——— کہیے، اب میں کیا سناؤں، کیا سنوں

یہ مانا زندگی میں غم بہت ہیں ——— ہنسے بھی زندگی میں ہم بہت ہیں

ایمان ہے مرا تری جنّت پہ اے خدا! ——— لیکن یہ میرے خونِ جگر کا صلہ نہیں

نہ بت کدے میں برہمن، نہ شیخ کعبے میں ——— مگر ہے معرکۂ شیخ و برہمن باقی

یہ جہاں تجھ کو فقط وہم و گماں لگتا ہے ——— مجھ کو ہر ذرّہ یہاں ایک جہاں لگتا ہے

روز آ جاتی ہے شبِ وعدۂ فردا لے کر ——— کتنا اچھا یہ جہانِ گزراں لگتا ہے

چراغ کشتہ لے کر ہم تری محفل میں کیا آتے ——— جو دن تھے زندگی کے وہ تو رستے میں گزار آئے

کیا تھا بادِ حوادث نے منتشر جن کو ——— سمٹ سمٹ کے وہی ذرّے کوہسار بنے

محسن اعظم گڑھی

نام سیّد محمد محسن رضوی، تخلّص محسن۔ ۱۹۰۲ء میں تحصیل پھول پور، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ مروّجہ تعلیم گھر پر حاصل کی۔ دینی تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے۔ مشہور درس گاہ سلطان المدارس میں داخلہ لے کر فلسفہ، منطق، ادب، ہیئت اور فقہ وغیرہ کی تکمیل کر کے صدر الفاضل کی سند لی۔ طب کی تعلیم حکیم عبدالحلیم صاحب سے حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقّی ہند کے شعبہ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہوئے۔ تقریباً دو سال دہلی میں قیام رہا۔ والد کے انتقال کی

وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا اور وطن لوٹ آئے۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۲ء میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ لکھنؤ کے زمانہ قیام میں عزیز لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ شاعری کے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ۱۱؍دسمبر ۱۹۷۵ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کے دو مجموعے ''پیامِ محسن'' اور ''محسن العزا'' ہندوستان میں چھپے تھے اور دو مجموعے ''آئینۂ فکر'' اور ''جمالِ فکر'' کراچی میں شائع ہوئے۔

منتخب اشعار

آنکھ سے آنکھ لڑی شیشۂ دل چور ہوا — کس نے ٹکرا دیا پیمانے سے پیمانے کو

کیا شہر خموشاں ہے کس شان کی دنیا ہے — ویرانہ میں بستی ہے بستی میں ہے ویرانہ

کیجیے کیجیے زلفوں کو پریشاں، لیکن — دیکھیے دیکھیے عالم نہ پریشاں ہو جائے

وہی شیشہ، وہی ساغر، وہی ساقی، وہی محفل — مگر کیوں شانِ محفل دم بدم کم ہوتی جاتی ہے

وہ کانٹا کہیں تم سے اچھا ہے محسن — رہا پہلوئے گل میں جو خار بن کر

ذہین شاہ تاجی

نام محمد طاسین فاروقی، ذہین تخلص۔ ۱۹۰۲ء میں شیخاواٹی، ریاست جے پور میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، ہندی اور سنسکرت زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ تاج الاولیا بابا تاج الدّین ناگپوری کے خلیفہ حضرت مولانا عبدالکریم شاہ قادری المعروف بہ حضرت بابا یوسف شاہ تاجی سے بیعت کی اور خلافت پائی۔ ذہین شاہ تاجی کے مریدوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ ماہ نامہ ''تاج'' بہت باقاعدگی سے شائع کرتے تھے۔ ۲۳؍جولائی ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''آیاتِ جمال'' (اردو غزل)، ''جمالِ آیات'' (فارسی کلام)، ''اجمال جمال'' (رباعیات وقطعات)۔

منتخب اشعار

تم ہی تم ہوتے ہو میرے سامنے — سوچتا ہوں جب کبھی میں کون ہوں

یہ حُسن و محبت کی سرشاریاں ہیں — نہ وہ ہیں شرابی نہ میں ہوں شرابی

یہ شیشہ، یہ ساغر، یہ دل اور آنکھیں — ترے روئے گلگوں سے ہر شے گلابی

ہم میں تم اور تم میں ہم گم ہو گئے — ہوتے ہوتے ایک ہم تم ہو گئے

کیا کوئی بزمِ حسیں زیرِ زمیں اور بھی ہے — پھول کیوں چاک جگر چاک گریباں نکلے

خوش رہیں تیرے دیکھنے والے | ورنہ کس نے خدا کو دیکھا ہے
بن گئے وہ منزلِ مقصود آپ | جو تلاش یار ہیں گم ہو گئے
خدا سے بے وفائی کر رہا ہے | وہی کافر خدائی کر رہا ہے

بسمل سعیدی ٹونکی

نام سیّد عیسیٰ میاں، تخلص بسمل۔ ۶ر جنوری ۱۹۰۲ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ اُردو اور فارسی گھر پر پڑھی۔ اس کے بعد دربار ہائی اسکول، ٹونک میں چھٹے درجے تک تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں اسکول کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ پھر مدرسہ عالیہ میں فارسی اور عربی پڑھی۔ ۱۹۲۰ء میں بسمل علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں انھوں نے انگریزی میں کچھ شدبد حاصل کی اور بعض فارسی کی کتابیں مولانا اسلم جے راج پوری سے پڑھیں۔ بسمل سعیدی ریاست ٹونک میں اہلکار رہے۔ بسمل صاحب اپنی آزادانہ روش اور شاعرانہ بے نیازی کے سبب ریاست ٹونک کے کئی بار زیرعتاب آئے۔ دوسال بعد بسمل گوالیار چلے گئے۔ یہاں انھوں نے طب کی کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ وہ ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں جے پور گئے۔ یہاں ممتاز الدّولہ نواب مکرم علی خاں رئیس کے ہاں حاضری کا موقع ملا۔ مراسم اتنے بڑھے کہ بسمل ان کے مصاحب بن گئے۔ یہاں چھ سات برس قیام رہا۔ یہ زمانہ آرام وآسائش اور بے فکری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں بسمل مستقل طور پر دہلی میں قیام پذیر ہوگئے۔ انھیں جام ٹونکی اور سیماب اکبرآبادی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۲۶ر اگست ۱۹۷۷ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ حکومت ہند سے انھیں ڈیڑھ دوسو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا، مگر ان کے مشاغل کے لیے چند سو روپے بالکل ناکافی تھے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے ''نشاطِ غم''، ''کیف الم''، ''مشاہدات'' اور ''اوراقِ زندگی'' شائع ہوگئے ہیں۔

منتخب اشعار

حق ہو اور تلخ نہ معلوم ہو اللہ اللہ | اُف ری شیرینیٔ گفتارِ رسولِ عربی
وعدہ خلاف، وعدۂ فردا کب آئے گا | یارب وہ میرا بھولنے والا کب آئے گا
ہزار حُسن عبادت گناہ سے پہلے | اور ایک لطف عبادت، مگر گناہ کے بعد
دو دن میں ہوگیا ہے یہ عالم کہ جس طرح | تیرے ہی اختیار میں ہیں عمر بھر سے ہم
دہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق | کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم
الٰہی دنیا میں اور کچھ دن ابھی قیامت نہ آنے پائے | ترے بنائے ہوئے بشر کو ابھی میں انساں بنا رہا ہوں

جب اپنے دشمنوں کا ذکر کرتا ہے کوئی بسمل
تو اپنے دوست اور احباب مجھ کو یاد آتے ہیں

تمھاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا
تمھاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

اب میں ہوں اور نہ وہ ہیں، نظارہ ہے نہ جلوہ
یا پاس آ گیا ہوں یا دور ہو گیا ہوں

اندازِ جنوں عشق کے اب جا نہیں سکتے
تم بھی دلِ بے تاب کو سمجھا نہیں سکتے

ٹھوکر کسی پتھر سے اگر کھائی ہے میں نے
منزل کا نشاں بھی اُسی پتھر سے ملا ہے

کانٹے تو خشک ہو کے کھٹکتے ہیں اور بھی
وہ پھول تھے جو باغ میں مرجھا کے رہ گئے

چمن سے بے تعلّق رہ کے بھی دل پر گری بجلی
چمن کی سمت دیکھی برق جب گرتی ہوئی میں نے

زمانہ ہنس رہا ہے آج بسمل میرے رونے پر
نہ جانے کس کے رونے کی اُڑائی تھی ہنسی میں نے

کعبے میں مسلمان کو کہہ دیتے ہیں کافر
بت خانے میں کافر کو بھی کافر نہیں کہتے

اسد ملتانی

نام محمد اسد خاں، تخلّص اسد۔ ۱۳؍دسمبر ۱۹۰۲ء کو کڑی افغاناں، ملتان شہر میں پیدا ہوئے۔ مشن اسکول، ملتان اور گورنمنٹ کالج، لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۲ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا سکریٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ ترقّی کر کے ڈپٹی سکریٹری، وزارتِ خارجہ سے ریٹائر ہوئے۔

شاعری کا آغاز کم سنی سے ہو گیا تھا۔ باقاعدہ اصلاح کسی سے نہیں لی، البتہ ایک نظم پر علاّمہ اقبال نے ازخود اصلاح فرما دی۔ ان کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسالوں میں تواتر سے چھپتا رہا۔ ۷؍نومبر ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔ تدفین ملتان میں ہوئی۔

منتخب اشعار

کچھ اس طرح سے مرے دل میں ان کی یاد آئی
کہ جیسے پھر مجھے گزرا ہوا زمانہ ملا

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار
خود اپنے لیے اور زمانے کے لیے اور

زاہد شعورِ حُسن سے بے گانہ ہی رہا
حُسنِ نظر نہیں ہے تو حُسنِ عمل کہاں

اے کم نظر اسے کسی قیمت پہ بھی نہ بیچ
دل ایک ہی تو چیز ہے، اس کا بدل کہاں

رہیں نہ رند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے، دو چار دس کی بات نہیں

زمانے نے ہمیں اتنا بدل ڈالا کہ اب ہم کو خود اپنی سرگذشت اک داستاں معلوم ہوتی ہے

بشیر درّانی

نام منشی بشیر حسن خاں، بشیر تخلّص۔ ۱۹۰۲ء میں جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ بشیر کے والد فیاض درّانی جہانگیر آباد سے ترک سکونت کر کے اچھاری، قصبہ حسن پور، ضلع مراد آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ بشیر کی طبیعت بچپن ہی سے کھیل کود اور سیر و تفریح کی طرف مائل تھی۔ موسیقی سے بھی شغف تھا۔ کتے پالنا، گھوڑا سواری کرنا، شکار کھیلنا ان کا معمول تھا۔ پٹا اور بنوٹ سے بھی شغف تھا۔ آخر میں سب مشغلے ختم ہو گئے اور شعر و سخن سے دلچسپی رہ گئی۔ ان کا جگر مراد آبادی سے بچپن سے یارانہ تھا۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں جگر کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ تقسیم ہند کے وقت بشیر رام پور میں مقیم تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بشیر ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور نواب شاہ کے قصبہ ''تھا'' میں سکونت اختیار کی۔ وہ وفات پا چکے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''جذب و گریز'' اور ''نادرات'' کے نام سے ۱۹۶۰ء میں کراچی سے شائع ہوئے۔ بشیر کی شاعری کے متعلق حامد حسن قادری، ماہر القادری اور رئیس امروہوی نے اپنی گراں قدر رائے کا اظہار کیا۔

منتخب اشعار

دشمنِ دل ہی نہیں دشمنِ جاں ہوتا ہے اُف وہ احساس جو پیری میں جواں ہوتا ہے

کوئی گریاں قریبِ تربت ہے زندگی پھر تری ضرورت ہے

جُرم محمد آبادی

نام ابوالحسن، تخلّص جُرم۔ ۴؍ فروری ۱۹۰۳ء کو قصبہ محمد آباد، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فارسی اور عربی کی ہوئی۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ تلاش معاش میں کلکتہ گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ اردو، فارسی، عربی کے علاوہ انگریزی، بنگلہ اور ہندی سے بھی وہ واقف تھے۔ ان کے پاس یونیورسٹی کی کوئی سند نہیں تھی، مگر معراجِ شاعری کے لیے درسگاہی سند کی کوئی اہمیت نہیں۔ جُرم محمد آبادی لڑکپن سے شعر کہتے تھے۔ انھیں آرزو لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ وہ ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے اکثر علمی و ادبی مضامین، افسانے اور ڈرامے معیاری جرائد و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہفتے وار ''عبرت''، ''شعلہ'' اور دیگر کئی اخبارات و رسائل ان کی سرپرستی اور نگرانی میں جاری ہوئے۔ علاّمہ آرزو کی زندگی میں انھوں نے دبستان آرزو کی داغ بیل ڈالی اور اس

کے صدر رہے۔ ۱۵؍ جنوری ۱۹۸۰ء کو محمد آباد میں وفات پا گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''شعلۂ رنگیں،'' ''بہارِ عجم،'' ''تیرِ نظر'' ''فردوسِ سخن۔''

منتخب اشعار

وہ جاتے جاتے ان کا مڑ کے یہ کہنا خدا حافظ
وہ گھبرا کے پھٹے دامن سے آنسو پونچھنا میرا

دیوانہ مجھ کو کہتے ہیں اہلِ خرد، مگر
دیوانہ کیوں ہوا یہ کوئی پوچھتا نہیں

روندے گئے ہیں پھول بھی کانٹوں کے ساتھ ساتھ
گلشن میں انقلاب سے کوئی بچا نہیں

اے مُجرِم! زندگی تو بہر حال کٹ گئی
کچھ مقصدِ حیات نہ، لیکن عیاں ہوا

چمن کی دنیا میں خار و خس کو ملے گا جب تک نہ حقِ فطرت
ہمیشہ بجلی گرا کرے گی، ہمیشہ فتنے اُٹھا کریں گے

تیری گلی کی دُھن میں جو نکلے، ان کو اتنا ہوش کہاں
راہ میں کتنے کانٹے ہیں، پاؤں میں کتنے چھالے ہیں

شفیق جون پوری

نام ولی الدّین، تخلّص شفیق۔ ۲۷/ ۲۶ مئی ۱۹۰۳ء کو جون پور میں پیدا ہوئے۔ حفیظ جون پوری، نوح ناروی اور حسرت موہانی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۹۵۵ء سے دائم المرض کے شکار تھے۔ ضروری اخراجات کے لیے ضعف و کمزوری میں بھی مشاعرے کی شرکت ضروری تھی۔ ان کو فراغت کی زندگی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ مشاعرے میں جون پور سے باہر جاتے تو بوتلوں میں پانی بھر کر ضرور لے جاتے۔ اس کا سبب نزلہ اور کھانسی تھی۔ ان کا آخری زمانہ بہت آزمائش اور بے سروسامانی میں گزرا۔ ۵؍ مارچ ۱۹۶۳ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد تقریباً چالیس ہے جن میں دو سفرنامے ''حجاز نامہ'' اور ''خاتم'' شامل ہیں۔ شعری مجموعوں میں ''تجلّیات،'' ''بانگِ جرس،'' ''حرمتِ عشق،'' ''شفق،'' ''طوبیٰ،'' ''سفینہ،'' ''فانوس'' قابل ذکر ہیں۔ اقبال احمد سہیل نے لکھنؤ اور اعظم گڑھ کے کل ہند مشاعرے میں ''فخرِ مشرق'' کا خطاب دیا۔

منتخب اشعار

نہ دردِ دل کا فسانہ کہنا، نہ چشمِ تر کا پیام کہنا
ملیں تو اے بادِ صبحگاہی انھیں ہمارا سلام کہنا

اے فصلِ گل کبھی تو کانٹوں پہ بھی نظر ہو
آراستہ کرے گی پھولوں کا گھر کہاں تک

یہی تو اک دلیل ہے اس کے وجود پر
جب تک نہ مانیے اُسے، دل مانتا نہیں

تری آنکھوں کی مستی دشمنِ ایماں سہی، لیکن
یہی کافر کبھی انساں بنا دیتی ہے انساں کو

پرستارانِ گلشن میں خزاں بدنام تھی پہلے — بہاریں آج کل خود لوٹ لیتی ہیں گلستاں کو

جہاں گزرا تھا عہدِ نوجوانی — یہی دنیا تھی یا وہ دوسری تھی

آہ جس گھر میں تھی سحر ہی سحر — اب وہاں شام بھی نہیں ہوتی

ہر شے پہ ہے شباب تمھارے شباب سے — تم کیا حسیں ہوئے کہ خدائی حسیں ہوئی

خدا کچھ بھی نہ دے پھر بھی یہ سَو دینے کا دینا ہے — اگر انسان کے پہلو میں تُو انسان کا دل دے

گنگناتا ہوں تری تصویر رکھ کر سامنے — اس نے بخشا ہے عجب ذوقِ سخن گوئی مجھے

کہنا ہی پڑا ان کو یہ خط پڑھ کے ہمارا — کم بخت کی ہر بات محبت سے بھری ہے

تاریک ہوئی جاتی ہے دنیائے محبت — آ جاؤ کہ بیمار چراغِ سحری ہے

ہر ذرّے کو آمادۂ فریاد کیا ہے — کس درد بھرے دل سے انھیں یاد کیا ہے

شفیق کوٹی

نام شفیق اللہ خاں، تخلّص شفیق۔ ۱۴راگست ۱۹۰۳ء کوکوٹ، ضلع فتح پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ مختلف اسکولوں اور شہروں میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ ٹکنیکل اسکول میں داخل ہوئے۔ تین سال بعد ڈپلوما لے کر محکمۂ زراعت کے انجینیرنگ لائن میں ملازمت کرلی۔ اس لائن میں ترقی کر کے محکمہ سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ، لاہور میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر انسپکشن کے عہدے پر فائز ہوئے۔ شعروسخن میں سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ ۱۱رفروری ۱۹۷۶ء کو لاہور میں انتقال کرگئے۔ ''دیارِغزل'' کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں لاہور سے ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا۔

منتخب اشعار

ہم نے کانٹوں کو بھی نرمی سے چھوا ہے اکثر — لوگ بے درد ہیں پھولوں کو مسل دیتے ہیں

اب ہے تری رضا پہ مرا کاروبارِ شوق — لے جا رہا ہوں تیری گلی سے خفا نہ ہو

اُن کی انگڑائی ادھوری رہ گئی — دیکھتے ہی مجھ کو وہ شرما گئے

سراپا جہنم ہے یہ زندگانی — مگر پھر بھی جینے کو جی چاہتا ہے

دل کی دنیا بھی ہے عجب دُنیا — کبھی اپنی کبھی پرائی سے

رگ رگ کا لہو دے کر ہم نے سینچا تھا گلستاں کو اپنے — جب وقت پڑا ہم پر تو ہمیں سب اہلِ گلستاں بھول گئے

خلش تو سوزِ محبت کی زندگی ہے شفیقؔ — یہ پھانس دل میں چبھی ہی رہے تو اچھا ہے

۴ جامؔ نوائی بدایونی

نام ظفریاب حسین (تاریخی نام)، جامؔ تخلّص۔ ۱۶؍اکتوبر ۱۹۰۳ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اپنے نام کے ساتھ 'نوائی' انھوں نے اپنے جدِ امجد نواب ظہور اللہ خاں نوا کی نسبت سے لکھنا شروع کیا جن کی جرأت کے ساتھ نوک جھونک کا ذکر ''آبِ حیات'' اور ''گلشنِ بے خار'' میں موجود ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور بدایوں کے دینی مدارس میں ہوئی۔ ۱۹۲۱ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور ۲۰ سال تک بدایوں میں وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان آ گئے۔ علم حاصل کرنے کی لگن انھیں اخیر عمر تک رہی۔ چناں چہ انھوں نے ۱۹۷۴ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اُس وقت ان کی عمر ۷۱ سال تھی۔ انھیں حضرت جگر مراد آبادی اور حضرت جوش ملیح آبادی سے خصوصیت کے ساتھ بڑا قرب حاصل رہا ہے۔ انھیں نہ صرف دوسروں کے اشعار بڑی تعداد میں یاد تھے بلکہ اپنا تمام کلام از بر تھا۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی بیاض تھی جس میں انھوں نے اپنے اشعار کے اشارے لکھ رکھے تھے۔ وہ یہ بیاض سامنے رکھ کر اپنے اشعار سناتے اور بعض اشارات (جنھیں انگریزی میں catch word کہتے ہیں) کے سہارے پوری پوری غزلیں بے تکان سناتے چلے جاتے تھے۔ بقول شخصے ''اتنا خوبصورت ضعیف آدمی نظر سے نہیں گزرا۔'' ۱۲؍ستمبر ۱۹۸۱ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔ ۱۹۸۲ء میں ان کے صاحبزادے مہتاب ظفر نے ''متاعِ رفتہ'' کے نام سے ان کا منتخب کلام شائع کیا۔ اس کتاب میں جام نوائی کے متعلق مختلف لوگوں کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

منتخب اشعار

ہو کے شامل کلمۂ طیب میں ان کا اسمِ پاک — وجہِ ایماں، جزوِ ایماں، عینِ ایماں ہو گیا

رہ گیا طوفانِ غم میں ڈبکیاں کھاتا ہوا — کاش میں بھی ڈوب ہی جاتا تو بیڑا پار تھا

نہ اپنے ساغر، نہ اپنے مینا، یہاں وہاں سے منگا کے پینا — ہے میکشی کا یہی قرینہ، یہ مستیِ مستعار کب تک

یارانِ عصرِ حاضر، توبہ ہے یا الٰہی! — رو رو کے حال پوچھیں، سُن سُن کے مسکرائیں

اب اس کو کر رہا ہے برباد کیوں زمانہ — یہ آشیاں نہیں ہے، ہے خاکِ آشیانہ

صد پارہ ہائے دل سے، پھر دل بنا رہا ہوں — صرف اس لیے کہ اس کو پھر توڑ دے زمانہ

اے جامؔ! بڑی بے اثری دیکھ چکا ہوں — اب میں تو نہ مانگوں کبھی مرنے کی دعا بھی

زباں ساکت، نظر محوِ فغاں ہے — یہ اپنا اپنا اندازِ بیاں ہے

کٹی ہو خیر سے زندانیوں پہ شب یارب — سحر اُداس یقیناً کسی سبب سے ہے

نظر ہے اپنی اپنی شیخ نے دیکھا نہ کعبے میں — مگر ہم نے خدا کو جام بت خانے میں دیکھا ہے

کتنا بڑا فریب حیاتِ بشر میں ہے — ہر شخص کو گمان یہی ہے کہ گھر میں ہے

یاد ہے مسجد گئے تھے دے کے پیمانہ مجھے — میں وہی ہوں قبلۂ عالم نے پہچانا مجھے

نظر محروم نظارہ ہے، جلوہ عالم آرا ہے — بتا اے خامشی ذوقِ طلب یہ ماجرا کیا ہے؟

جلیل قدوائی

نام جلیل احمد، جلیل تخلّص۔ ۱۶/ مارچ ۱۹۰۴ء کو اناو (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا۔ ۱۹۳۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کی ڈگری اوّل درجے میں حاصل کی اور علی گڑھ میں شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے۔ احسن مارہروی سے تلمذ حاصل تھا۔ علی گڑھ کے زمانے کا سارا کلام ''نقش و نگار'' کے نام سے ۱۹۴۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ جلیل قدوائی نے حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب بھی کیا ہے۔

۱۹۴۰ء میں سابق گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ وزارت اطلاعات ونشریات، پاکستان گورنمنٹ میں اعلا عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ یکم فروری ۱۹۹۶ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔ راولپنڈی میں دفن ہوئے۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں: ''نوائے سینہ تاب،'' ''خاکسترِ پروانہ،'' ''قطراتِ شبنم'' (شعری مجموعے)، ''سیرِ گل،'' ''اصنامِ خیالی'' (افسانوں کے مجموعے)، ''دیوان میر محمدی بیدار'' (مرتب)، ''تذکرے اور تبصرے،'' ''انتخاب شعرائے بدنام۔''

منتخب اشعار

زندگی جن کی یوں گزرتی ہے — شاید اُن کا خدا نہیں ہوتا

اللہ ری تری شوخیِ رفتار کا عالم — انداز ہے کل موجِ نسیمِ سحری کا

ہوں وہ خوددار کہ باوصف کشاکش میں نے — تیرا شکوہ نہ کبھی گردشِ ایّام کیا

خندۂ گل جو ہوا ختم تو میں نے دیکھا — باغ میں کچھ بھی نہ تھا گریۂ شبنم کے سوا

حُسن مختار ہے جو چاہے ستم ایجاد کرے | شیوۂ عشق بجز صبر و رضا کچھ بھی نہیں
ہر طرف جلوۂ محبوب عیاں ہے پھر بھی | کون ایسا ہے جسے حسرتِ دیدار نہ ہو
مجھ کو معلوم ہے جو کچھ ہے تمھارے دل میں | سُرمگیں آنکھ سے بے کار چھپاتے کیوں ہو
اک زندگی عمل کے لیے بھی نصیب ہو | یہ زندگی تو نیک ارادوں میں کٹ گئی
زندگی میں بہت غنیمت ہے | جو گھڑی لطف سے گزر جائے
پوچھا جو اُس نے حالِ دلِ زار اے جلیلؔ! | بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے

جمیل مظہری

نام سیّد کاظم علی، جمیل تخلّص۔ ۲رستمبر ۱۹۰۴ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ وطن حسن پورہ، ضلع سارن (بہار) تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۱ء میں فارسی میں ایم اے کیا اور روزنامہ ''عصرِ جدید''، کلکتہ میں کالم لکھ کر ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ وحشت کلکتوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۹۴۶ء میں صوبہ بہار کے افسر اطلاعات کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں اردو اور فارسی کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سیاست میں حصّہ لینے پر ۱۹۴۲ء میں جیل گئے۔ آپ کے مورث اعلا غازی پور (مشرقی یوپی کا ایک مردم خیز خطہ) کے بانی تھے۔ اپنی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند سے ''غالب ادبی ایوارڈ'' حاصل کیا۔ ۲۳رجولائی ۱۹۷۹ء کو بھیکن پور، ضلع سارن (بہار) میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''عرفانِ جمیل''، ''فکرِ جمیل''، ''نقشِ جمیل''، ''وجدانِ جمیل''۔ نظم، غزل، گیت، رباعیات، قطعات اور مراثی میں طبع آزمائی کی۔ شاد عظیم آبادی اور یگانہ چنگیزی کے بعد بہار کے ممتاز ترین شعرا میں جمیل مظہری کا شمار ہوتا ہے۔ غزل کے علاوہ انھوں نے مرثیے میں بھی طبع آزمائی کی۔

منتخب اشعار

دُنیا تلاش کرتی ہے ساحل نجات کا | دکھلا دے اُس کو کوئی کنارہ فرات کا
نہ ہم جس سے جیتے نہ تم جس سے جیتے | وہ دل زندگی کے تقاضوں سے ہارا
وہیں تک خودی ہے، وہیں سے خدا ہے | جہاں بے کسی ڈھونڈتی ہے سہارا
بقدر پیمانۂ تخیّل سرور ہر دل میں ہے خودی کا | اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغ منزل | کہیں سر راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

بنا کے اک جنتِ تخیل سرور باندھا تھا رنگ و بو کا
لگائی دنیا نے ایسی ٹھوکر اُچٹ گیا خواب آرزو کا

جب خاک ہی ہونا تھا مجھ کو تو خاکِ رہِ صحرا ہوتا
اک کوشش پیہم تو ہوتی، اُٹھتا ہوتا، گرتا ہوتا

موتی بننے سے کیا حاصل جب اپنی حقیقت ہی کھو دی
قطرے کے لیے بہتر تھا یہی، قلزم بنتا، دریا ہوتا

ہم لوگ ہیں تیرگی کے مارے
کھانے دو فریب زندگی کا

دیتے ہی کہا تھا ساقی نے اس جام میں ہے تلخیٔ عمل
پر مانگ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا، پینا ہی پڑا

حرم کو بھی بت کدہ سمجھنا ہے، دوسری منزل ارتقا کی
وہ پہلا زینہ شعور کا تھا کہ بت کدے کو حرم بنایا

کسی آستانۂ ناز پر بڑی ذلتوں سے ادا ہوا
وہ جو قرض تھا تری بندگی کا مری جبینِ نیاز پر

محبت جن کے دل کی دھڑکنوں کو تیز رکھتی ہے
وہ اکثر وقت کی رفتار سے آگے بھی چلتے ہیں

ستم ہے اے روشنی ستم ہے کہ وہ بھی اب دھوپ کی ہے زد میں
ذرا سا سایہ جو رہ گیا تھا گھنے درختوں کی تیرگی میں

یہی تو انجامِ جستجو ہے کہ ٹھوکریں کھا کے بت کدوں کی
جبینِ رُسوا کو رکھ کے اپنی حرم کی چوکھٹ پہ سو گیا ہوں

یہ میرا مڑ مڑ کے دیکھ لینا بھی ہے مری شانِ رہبرانہ
قدم میں کس طرح تیز کر دوں کہ میرے پیچھے ہے اک زمانہ

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی

دنیا کے معاشی فکروں میں یاد اس کے روئے زیبا کی
اک بجلی تھی جو رہ رہ کر تاریک گھٹا میں چمکا کی

کسی کی ناؤ کو طوفاں نے غرقِ آب کیا
کسی کی ناؤ کنارے اسی بہانے لگی

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغِ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

کفر کیا ہے حرم و دیر میں تفریق جمیلؔ
سخت کافر ہے وہ ہندو جو مسلماں ہو جائے

اب تو دھوپ آ پہنچی جھاڑیوں کے اندر بھی
اب پناہ لینے کو تیرگی کہاں جائے

بھولا ہے نہ بھولے گا تیرا پنگھٹ پر پہنچ کر یہ کہنا
کیا پیاس لگے گی اس کو بجن جو آنسو پی کر جیتی ہے

رندھی ہوئی ہیں نشیلی آنکھیں، گلابی چہرہ اُترا ہوا ہے
پپیہا بولا، ڈھل آئے آنسو، کنواری رادھا کو کیا ہوا ہے

ستم ہے یہ ذوقِ پرفشانی، کہیں نہ بجھ جائے شمعِ محفل
کوئی پتنگوں سے جا کے کہہ دے کہ یہ ہوس ہے، وفا نہیں ہے

جمیلؔ اس دل کی بانسری میں بہت سے نغمے بھرے ہیں، لیکن
جسے سنانے کی تھی تمنا اُسی نے اب تک سُنا نہیں ہے

بت و بت خانہ توڑنے والو!
اِسی زد میں خدا نہ آ جائے

حسرت، چراغ حسن

نام چراغ حسن، حسرت تخلّص۔ ۱۹۰۴ء میں پونچھ (آزاد کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ فارسی، اردو اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پونچھ میں میٹرک کیا۔ ۱۹۲۴ء میں لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ مختلف مدراس میں فارسی کے مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بعدازاں کلکتہ میں اخبار نویسی شروع کی اور مختلف جرائد سے منسلک رہے۔ ۱۹۲۸ء میں لاہور آ گئے اور ''زمیندار''، ''انصاف''، ''احسان'' وغیرہ اخبارات سے متعلق رہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت بھی کی۔ ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو حسرت ''فوجی اخبار'' کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اِس ملازمت کے سلسلے میں آپ برما اور ملایا بھی رہے۔ فوجی ملازمت سے سبک دوش ہوکر روزنامہ ''امروز'' میں ''سند باد جہازی'' کے نام سے مذاحیہ کالم لکھتے رہے۔ جولائی ۱۹۵۱ء میں کراچی آ کر ریڈیو پاکستان میں ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصے بعد اس ملازمت سے الگ ہو گئے۔ ایک شاعر کے علاوہ اچھے مزاح نویس اور طنز نگار تھے۔ ۲۶ر جون ۱۹۵۵ء کو لاہور میں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ ان کی چند تصانیف کے نام یہ ہیں: ''سرگذشتِ اسلام''، ''مطائبات'' (فکاہی مضامین)، ''جدید جغرافیۂ پنجاب''، ''کیلے کا چھلکا اور دوسرے مضامین''، ''مضامینِ حسرت''، ''حرف وحکایت'' (منتخب کالم)۔

منتخب اشعار

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی — وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سُنا تم نے — کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

قبول اِس بارگاہ میں التجا کوئی نہیں ہوتی — الٰہی یا مجھی کو التجا کرنا نہیں آتا

آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں — زلف کی رُخسار کی باتیں کریں

امیدِ وصل نے دھوکے دیے ہیں اس قدر حسرت — کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

حسرت کو لے تو آئیں تری بزمِ ناز میں — کم بخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

قہر تو بار بار ہوتا ہے — لطف بھی ایک بار ہو جائے

ثاقب کان پوری

نام شاہ ابو محمد، ثاقب تخلص۔ ۱۹۰۰ء میں کان پور میں پیدا ہوئے۔ وطن بھی کان پور تھا۔ ابتدائی درس اپنے والد سے لیا۔ بعد ازاں مولانا آزاد سبحانی کے مدرسۃ الٰہیات میں داخل ہوئے جہاں درس نظامی کے ساتھ ساتھ السنہ شرقیہ، منطق اور فن مناظرہ کی تعلیم حاصل کی۔ ثاقب صاحب نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ ان کے ادبی مضامین معروف ادبی رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ ایک ادبی ماہ نامہ ''نظارہ'' کے نام سے ۱۹۲۶ء میں جاری کیا تھا جو دو سال تک جاری رہنے کے بعد اکثر ادبی پرچوں کی طرح بند ہو گیا۔ احسن اللہ خاں احسن سے تلمذ حاصل تھا۔ ۷ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو کان پور میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''روحِ جاوداں''، ''متاعِ درد''، ''نقشِ جاوداں''۔ سودا کے کلام کا انتخاب ''انتخاب سودا'' کے نام سے بھی کیا۔

منتخب اشعار

اپنے دلِ بے تاب سے میں خود ہوں پریشاں — کیا دوں انھیں الزام میں خود سوچ رہا ہوں

ہاتھ سینے پہ جو رکھا تُو نے — درد ہوتا تھا کہاں، یاد نہیں

سمجھ رہے ہیں اسے سب نشاط کی باتیں — کہا صبا نے جو غنچوں سے کوئی کیا جانے

عقل تہی مایہ سے بدلی ہے کہیں دُنیا — رُخ عالم ہستی کا دیوانے بدلتے ہیں

نکلا ہے اگر کام تو کچھ اہلِ جنوں سے — اربابِ خرد عشق میں کچھ کام نہ آئے

سننے والا غم کدے میں کون تھا؟ کوئی نہیں — آپ ہی ہم اپنے دل سے گفتگو کرتے رہے

وقار انبالوی

نام ناظم علی، وقار تخلص۔ ۲۲ر جون ۱۸۹۶ء کو چنار تھل، ضلع انبالہ میں پیدا ہوئے۔ وقار صاحب نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال پشاور میں گزارے جہاں آپ کے دادا جیلر کے عہدے پر فائز تھے۔ دادا کے انتقال کے بعد وہ اپنے وطن ملانہ آ گئے۔ ان کی دوسری والدہ اہلِ زبان ہونے کے علاوہ شاعرہ بھی تھیں۔ چناں چہ ان کی صحبت میں وقار صاحب نے زبان میں اچھی خاصی دستگاہ حاصل کی اور شعر و شاعری کا جو ذوق ان کے وجدان میں پہلے سے تھا وہ نکھرنا شروع ہوا۔ ان کی صحافت کی ابتدا ''پرتاب''، ''ملاپ'' کانگریسی اخبارات کے فکاہی کالم لکھنے سے ہوئی۔

۱۹۳۹ء میں روزنامہ ''احسان'' سے منسلک ہوئے۔ تقسیم ہند تک اس کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں مشرق وسطیٰ اور ۱۹۴۱ء میں ملایا کا سفر بھی کیا۔ تقسیم ہند کے بعد اپنا اخبار ''سفینہ'' نکالا جو ۱۹۵۱ء میں بند ہو گیا۔ بعد ازاں مختلف اخبارات سے منسلک رہے۔ ''بیانِ حال''، ''زبانِ حال''، ''آہنگ'' اور ''دیہاتی افسانے'' ان کی تصانیف ہیں۔ تاجور نجیب آبادی کے شاگرد تھے۔ وفات ۲۶/جون ۱۹۸۸ء گاؤں سجووال (شرق پور)۔ اعزاز: تمغۂ امتیاز۔ ان کا مشہور شعر سنیے:

اسلام کے دامن میں اَور اس کے سوا کیا ہے
اک ضرب یداللّٰہی، اک سجدۂ شبیری

بخاری، سیّد ذوالفقار علی

نام سیّد ذوالفقار علی بخاری۔ جون ۱۹۰۴ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں حاصل کی اور اس کے بعد لاہور اور لندن جا کر اس کی تکمیل کی۔ تقسیم سے پہلے ریڈیو اسٹیشن، بمبئی کے ڈائرکٹر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ شاعری میں حسرت موہانی، علامہ اقبال، یگانہ، وحشت کلکتوی وغیرہ سے استفادہ کیا، مگر کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ریڈیو پاکستان کے قیام اور استحکام میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ بخاری صاحب کو کھانے میں ہر وہ چیز پسند تھی جس میں گھی اور مرچیں کم ہوں۔ ۱۲/جولائی ۱۹۷۵ء کو حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے کراچی میں انتقال کر گئے۔ وہ شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ نامور براڈ کاسٹر، فن کار اور موسیقار بھی تھے۔ اُن کی تصانیف کے نام یہ ہیں:

''سرگذشت'' (آپ بیتی) ''راگ دریا'' (موسیقی)۔ ان کا مجموعہ کلام ''میں نے جو کچھ بھی کہا'' کے عنوان سے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شائع ہو گیا ہے۔

منتخب اشعار

بیشتر خدا پایا اور برملا پایا — ہم نے تیرے بندوں کو تجھ سے بھی سوا پایا

خواب امید کی تعبیر نظر آتی ہے — یہ بھی ثابت ہوا گر خواب تو پھر کیا ہوگا

شوق بڑھتا ہی گیا دوریٔ منزل کی طرح — وقت اُڑتا ہی گیا گردِ سفر کی صورت

آبادیٔ دل کی ہے فقط ایک ہی صورت — بربادیٔ دل کے لیے سامان ہزاروں

ہیں طائرانِ چمن قید آشیانے میں — مگر یہ بات کہے کون اس زمانے میں

اُڑوں کہاں کہ ہوا میں بھی جال پھیلے ہیں
میں پر سمیٹ کے بیٹھا ہوں آشیانے میں

بزم میں تو ہم دونوں اجنبی سے رہتے ہیں
کوئی تم کو کیا جانے، کوئی ہم کو کیا جانے

اس توقع پر رہے کانٹے عزیز
دیکھ لوں دو گل کہیں مہکے ہوئے

مے کدے کو کیوں بُرا کہتے ہیں لوگ
ہم ہوئے جو کچھ یہیں رہ کے ہوئے

یہ برہم ہونے والی محفل آپ ہی برہم ہو جاتی
ہم کہہ کے ہوئے بدنام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں توبہ!
دوست ہو کہ دشمن ہو، آدمی غنیمت ہے

ہم نے فرہاد کو موضوعِ سخن ٹھہرایا
ذکر اپنا بہ حدیثِ دگراں لازم ہے

یہ جو ہیں شہر کے واعظ، یہ خطیبانِ کرام
یہ بھی اللہ نے چاہا تو مسلماں ہوں گے

اس جہاں میں تو جہنم بھی ہے جنت بھی
کوئی فردوس یہاں بھی تو بنایا ہوتا

عندلیب شادانی

نام وجاہت حسین، ڈاکٹر، عندلیب تخلص۔ یکم مارچ ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے۔ وطن سنبھل، ضلع مرادآباد تھا۔ اپنے استاد شاداں بلگرامی کی نسبت سے اپنے آپ کو شادانی لکھنا شروع کیا۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم، منشی فاضل، میٹرک، انٹرمیڈیٹ، بی اے کے امتحانات پرائیوٹ طور پر پاس کیے۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں لندن یونیورسٹی سے ''ہندوستان کے مسلم مؤرخین'' پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصہ ہندو کالج، دہلی میں اردو اور فارسی کے لکچرر رہے۔ بعدازاں ڈھاکا یونیورسٹی میں سینیئر لکچرر مقرر ہوئے۔ ترقی کر کے پروفیسر اور پھر اردو، فارسی کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۲۹؍جولائی ۱۹۶۹ء کو ڈھاکا میں انتقال کر گئے۔ ''نشاطِ رفتہ'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں: ''نقش بدیع''، ''اردو غزل گوئی اور دورِ حاضرہ''، ''سرودِ رفتہ''، ''سچی کہانیاں''، ''شرحِ رباعیاتِ باباطاہر''، ''نوش ونیش''، ''تحقیق کی روشنی میں''، ''جدید فارسی زبان پر فرانسیسی کے اثرات'' (انگریزی)۔

منتخب اشعار

اُس نے شرما کر لیا مُنہ پر نقاب
چاند پر بادل کا ٹکڑا آ گیا

نہ پونچھو میرے آنسو بس مجھے یوں ہی تڑپنے دو
تم اتنے مہرباں ہوتے تو دل کا خون کیوں ہوتا

تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھیے
اک پھول اُس نے بھیج دیا ہے گلاب کا

تم آئینے میں اپنے لب چوم لینا
یہی دُور اُفتادہ کا پیار ہوگا

دل آج بے حد گھبرا رہا ہے
اے دوست ان کا کچھ تذکرہ کر

تری محبت کا بھی یقیں ہے، تری وفا کو بھی جانتا ہوں
مگر مرا دل لرز رہا ہے میں اپنی قسمت کو جانتا ہوں

بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں؟

رات کچھ ایسا تصور نے ترے بے خود کیا
ڈال کر اپنے گلے میں اپنی بانہیں چوم لیں

پڑتی ہے اپنے خونِ تمنا پہ جب نظر
ہوتا ہے دل میں شک کہ خدا ہے بھی یا نہیں

گناہ کا اپنے معترف ہوں، یہ التجا ہے کہ پاکبازو
کرو مجھے سنگسار، لیکن، گناہ کی داستاں تو سن لو

دیر لگی آنے میں تم کو، شکر ہے پھر بھی آئے تو
آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا، ویسے ہم گھبرائے تو

جھوٹ ہے سب تاریخ ہمیشہ اپنے کو دہراتی ہے
اچھا میرا خوابِ جوانی تھوڑا سا دہرائے تو

مجھے اور جس طرح چاہو مٹا دو
مرے ہاتھ سے اپنا دامن نہ کھینچو

سنا ہو تم نے شاید میرے ہمسایوں میں چرچا ہے
کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے

دل کا ہر گوشہ تمھاری یاد سے آباد ہے
مجھ کو سب کچھ بھول جانے پر بھی سب کچھ یاد ہے

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھیں کی یاد میری زندگی ہے

جو یہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں خوش ہیں ہم تو
ان کے دل میں بھی مقدر کا گلہ ہوتا ہے

تیز ہے رفتار دل کی، سست رفتارِ قدم
اب یقیناً منزلِ جاناں بہت نزدیک ہے

مٹا دیتی ہے دوری نقشِ الفت کو، مگر یہ کیا
کہ جب سے دور ہو تم اور بھی نزدیک ہو دل سے

چاندنی سے گلوں سے نغموں سے
دل بھر آتا ہے کیوں خدا جانے

بیٹھے بیٹھے اُڈنے لگتا ہے
دل کو کیا ہو گیا خدا جانے

زخمِ دل کو چھپا رہا ہوں میں
کوئی میری ہنسی کو کیا جانے

تم تو ہمیں کو کہتے تھے یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

ناداں سہی پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے

کہتے تھے تم سے چھوٹ کے کیوں کر جئیں گے ہم
جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے تقدیر جو دکھائے

اک ناتمام خواب مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

مجنوں گورکھ پوری

نام ابوالحسنات نورالدّین احمد صدیق، تخلّص مجنوں۔ ۱۰ر مئی ۱۹۰۴ء کو پلڈہ، ضلع بستی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن گورکھ پور تھا۔ درسِ نظامیہ اور بی اے تک کی تعلیم گورکھ پور اور علی گڑھ میں حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے اور ۱۹۳۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۳۲ء سے ستمبر ۱۹۵۸ء تک گورکھ پور اور علی گڑھ میں مختلف کالجوں میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ستمبر ۱۹۵۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء صدر شعبۂ اردو گورکھ پور یونیورسٹی رہے۔ نومبر ۱۹۵۸ء تا مئی ۱۹۶۸ء اسسٹنٹ ڈائرکٹر، علی گڑھ، تاریخ ادب اردو اور ریڈر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ رہے۔ مئی ۱۹۶۸ء میں پاکستان آگئے۔ ۱۹۷۸ء تک کراچی یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مجنوں گورکھ پوری نے شروع میں کچھ نظمیں اور غزلیں کہیں۔ بعد میں افسانے اور تنقید کی طرف مائل ہو گئے۔ وہ ایک بلند پایہ افسانہ نگار اور منفرد نقاد تھے۔ مجنوں صاحب نے ۱۹۳۰ء میں ''ایوانِ اشاعت'' کے نام سے ایک مکتبہ قائم کیا اور ''ایوان کے نام سے پرچہ نکالا۔ ۴ر جون ۱۹۸۸ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف اور تالیفات کی تعداد تیس سے زیادہ ہے۔ چند نام یہ ہیں:

افسانہ: ''خواب وخیال،'' ''سمن پوش،'' ''مجنوں کے افسانے،'' ''گردش،'' ''سراب،'' ''زیدی کا حشر۔''

تنقید وفلسفہ: ''شوپنہار،'' ''تاریخ جمالیات،'' ''ادب اور زندگی،'' ''تنقیدی حاشیے،'' ''نقوش وافکار،'' ''نکات مجنوں،'' ''غالب، شخص اور شاعر''

ترجمہ: ''سلومی (آسکر وائلڈ)، ''آغازِ ہستی'' (برنارڈ شا)، ''قابیل'' (بائرن)۔

جدید اردو ادب کی رہنمائی میں جن نقادوں نے اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں مجنوں صاحب کی حیثیت بہت ممتاز اور نمایاں ہے۔ (اختر حسین رائے پوری)

منتخب اشعار

اپنے سے آپ اجنبی ہوں — کیا جانے دل نے کیا کیا ہے

مری ضد میں چمن کو بجلیوں نے خاک کر ڈالا — کہاں سے کنج میں پھولوں کی طرح آشیاں رکھ دی

درد کا ماجرا تو سن لیتے — درد کی کچھ دوا نہیں، نہ سہی

مرے صیّادِ سرگرداں سے اتنا کوئی کہہ دیتا — جہاں رک جائے بجلی، ہے وہ شاخِ آشیاں میری

اے عقل و خرد والو! مجنوں کا گلہ کیسا — دیوانے کو کیا کہیے دیوانہ ہے دیوانہ
یہ گمراہی بہ خود نا آگہی اچھی نہیں غافل — کسی وادی میں کھو جا اور اپنی جستجو کر لے
جستجو زندگی کا حاصل ہے — اُٹھ گیا جو قدم وہ منزل ہے
حنائی ہاتھوں سے آنچل سنبھالے — یہ شرماتا ہوا کون آ رہا ہے؟
وہ فراق تھا کہ وصال تھا کوئی خواب تھا کہ خیال تھا — ہمیں کچھ بھی یاد نہیں رہا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
اے دلِ راحت طلب، اے عاقبت نا آشنا — کہتے ہیں راحت جسے وہ موت کا پیغام ہے
بھنور میں ڈوبنے والے بھی ساحل تک پہنچتے ہیں — بھنور کا بھی تو آخر سلسلہ ساحل سے ملتا ہے

ساغر نظامی

نام صمد یار خاں، ساغر تخلّص۔ ولادت ۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء، علی گڑھ۔ خواجہ حسن نظامی سے بیعت تھے اس لیے ساغر نظامی مشہور ہوئے۔ اردو اور فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انگریزی کی تعلیم گورنمنٹ اسکول علی گڑھ اور ایم اے او کالج علی گڑھ میں ہوئی۔ ساحر اکبر آبادی اور سیماب اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ ستمبر ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے ماہ نامہ ''مستقبل'' جاری کیا۔ ۱۹۲۸ء میں ایک نیم ادبی اخبار ''علی گڑھ پنچ'' نکالا۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں ہفتہ وار ''استقلال'' کی اشاعت شروع کی۔ ۱۹۳۲ء میں ساغر صاحب کے والد کا تبادلہ میرٹھ ہو جانے پر ساغر صاحب بھی میرٹھ آ گئے۔ یہاں انھوں نے ایک مکتبہ اور ایک اردو لیتھو پریس ''ساغر پریس'' کے نام سے قائم کیا۔ یہاں انھوں نے ماہ نامہ ''ایشیا'' بھی نکالا جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۳ء تک برابر نکلتا رہا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ پونا چلے گئے اور ''شالیمار پکچرز'' میں بحیثیت اسٹوری رائٹر مکالمہ نگار اور نغمہ نگار کام کرنے لگے۔ پونا کے دوران قیام ''ایشیا'' جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ بمبئی میں فلمی دُنیا سے متعلّق رہے۔ بھارت گورنمنٹ نے انھیں قومی اعزاز ''پدما بھوشن'' سے نوازا۔ ۲۷ فروری ۱۹۸۴ء کو نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''شہابیات'' (رباعیات)، ''صبوحی'' (غزلیات)، ''بادۂ مشرق'' (منظومات و غزلیات)، ''موجِ ساحل'' (قومی نظمیں، غزلیات)، ''رنگ محل'' (قومی نظمیں، غزلیات) ''شکنتلا'' کالی داس کے شہرہ آفاق ڈرامے کا منظوم اردو روپ، ''انارکلی'' (منظوم ڈراما)، ''نہرو داستان، (پنڈت جواہر لال نہرو سے متعلّق طویل نظم)''، ''مشعلِ آزادی'' (حصہ دوم۔ زیر طبع)، ''تہذیب کی سرگذشت'' (طویل افسانہ)، ''سمندر کی دیوی، (طویل افسانہ)، ''مشائخ مارہرہ،'' ''کہکشاں'' (افسانوں کا مجموعہ)۔

منتخب اشعار

محبت میں سود و زیاں کی نہ پوچھو
بہت ہم نے کھویا، بہت ہم نے پایا

بے حجابی کے سب شکار ہوئے
ہم کو تیرے حجاب نے لُوٹا

شمع بھی سنتی رہی پروانے بھی سنتے رہے
اور وہ سوتے رہے کہتے رہے افسانہ ہم

وہ محفل میں میری زباں بند کر دیں
نظر سے کہانی سناتا رہوں گا

شک نہ کر میری خشک آنکھوں پر
یوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

عشق تکمیلِ دو عالم ہے، مگر نقص یہ ہے
اِس کے انجام میں کیفیتِ آغاز نہیں

معطّر معطّر، خراماں خراماں
نسیم آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں

کرم کی یہ مجبوریاں اللّٰہ اللّٰہ
نظر سے دلاسے دیے جا رہے ہیں

یہ مے کدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ
یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

لاؤ اک سجدہ کروں عالمِ بدمستی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

نظر کی جولانیاں نہ پوچھو، نظر حقیقت میں وہ نظر ہے
اُٹھے تو بجلی پناہ مانگے، جھکے تو دنیا خراب کر دے

اے مغنّی! میں نہیں مرہون سازِ عارضی
خود مری ہستی رباب و چنگ ہے میرے لیے

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حُسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

یہ بھی کسی غریب کے گھر کا دیا ہے زندگی
شام ہوئی جلا دیا، رات ہوئی بجھا دیا

اختر شیرانی

نام محمد داؤد خاں، اختر تخلص۔ ۴ر مئی ۱۹۰۵ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ مشہور محقق پروفیسر محمود شیرانی کے فرزند تھے۔ ۱۹۱۹ء میں اپنے والد کے ہمراہ لاہور آ گئے۔ یہاں ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ اختر کا بیشتر زمانہ لاہور میں گزرا۔ شعر و سخن کا شوق اوائلِ عمر سے تھا۔ تاجور نجیب آبادی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ لاہور سے ''بہارستان''، ''خیالستان'' اور ''رومان'' رسائل نکالے۔ اردو کی مشہور لغت ''جامع الغات'' کی ادارت کی۔ وہ ایک رومانی شاعر تھے۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے کم عمری میں ۹ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ ''شعرستان''، ''اخترستان''، ''شہناز''، ''لالۂ طور''، ''طیور آوارہ''، ''صبح بہار'' اور ''شہرود''، ''اردو ترجمہ جامع الحکایات۔'' ''کلّیاتِ اختر شیرانی'' (مرتبہ ڈاکٹر یونس حسنی) بھی چھپ گئی ہے۔

منتخب اشعار

بھولنے کا خیال بھی ایک طرح کی یاد ہے
ہم نہ بھلائے جائیں گے لاکھ ہمیں بھلائے جا

اب نہ وہ راتیں، نہ وہ باتیں، نہ ملاقاتیں ہیں
محفلیں خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا

دشتِ غربت میں رلاتے ہیں ہمیں یاد آ کر
اے وطن! تیرے گل و سنبل و ریحاں کیا کیا

چٹکیاں لینے لگا، دل میں نشاطِ طفلی
آج یاد آ گئے بھولے ہوئے افسانے چند

غم خانۂ ہستی میں ہیں مہماں کوئی دن اور
کر لے ہمیں تقدیر پریشاں کوئی دن اور

ایک ہی بستی میں ہیں، آساں ہے ملنا آ ملو
کیا خبر لے جائے دورِ آسمانی پھر کہاں

فصلِ گل ہے یا کوئی دوشیزۂ رنگیں بدن
فرشِ گل سے صبحِ دم اُٹھی ہے شرماتی ہوئی

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی!
شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی

انھیں کوچوں میں کل اخترؔ کو رسوا ہوتے دیکھا تھا
وہ آنکھیں اشکبار اُس کی، وہ باتیں دلفگار اُس کی

اک محبت تھی مٹ چکی یارب
تیری دنیا میں اب دھرا کیا ہے؟

مجھے اپنی پستی کی شرم ہے، تری رفعتوں کا خیال ہے
مگر اپنے دل کو میں کیا کروں، اسے پھر بھی شوقِ وصال ہے

میں بتاؤں واعظِ خوش نوا! ہے جہان و خلد میں فرق کیا
یہ اگر فریبِ خیال ہے، وہ فریبِ حُسنِ خیال ہے

اٹھی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا
اندھیری رات کے پردوں میں دن کی روشنی بھی ہے

ان رس بھری آنکھوں میں حیا کھیل رہی ہے
دو زہر کے پیالوں پہ قضا کھیل رہی ہے

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے خدائی میں، حسیں معلوم ہوتی ہے

نظر رشیدی

نظر رشیدی کامٹوی (ناگپور)۔ دورِ حاضر کے ہندوستانی شاعر۔

منتخب اشعار

خدا جب بے نیازِ کیف و کم ہے اے جہاں والو
یہ قیدِ بندگی کیوں ہے، سمجھ میں کچھ نہیں آتا

نظرؔ اک دن خدا کی جستجو میں
پہنچنا ہے مقامِ گمراہی تک

مانا تمام عالمِ ہستی ہے اک فریب
لیکن یہی فریب حقیقت سے کم نہیں

پکارتے ہیں عبث شیخ و برہمن مجھ کو
حدودِ دیر و حرم سے گزر چکا ہوں میں

دیکھ کر تیری بے نیازی کو
ہم سے اب بندگی نہیں ہوتی

رزم ردولوی

نام جعفر مہدی، رزم تخلص۔ ۱۹۰۵ء میں قصبہ، ردولی (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ نجم آفندی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۹ر ستمبر ۱۹۸۷ء کو ردولی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

تھا مرا پہلا قدم باہر حدِ ادراک سے
کون کہتا ہے مجھے، اندازۂ منزل نہیں

سکوت میں ہے سکوں، خامشی میں لذّت ہے
یہ اضطراب مرے دل نے کیوں پسند کیا

جھلک یوں آس میں امید کی معلوم ہوتی ہے
کہ جیسے دور سے اک روشنی معلوم ہوتی ہے

یہی ہے صبا کی جو نکہت فروشی
قفس لے کے اب میں اُڑا چاہتا ہوں

ہم بے خودی و ہوش کی حد سے گزر کے بھی
اندازۂ جمالِ حقیقت نہ کر سکے

اسیری میں نشیمن کا زمانہ یاد کیا کرتے
قفس پر بھی جو پڑ جاتی کوئی افتاد کیا کرتے

ابھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے کارواں اپنا
ابھی لپٹی ہوئی دامن سے گردِ کارواں تک ہے

جہانِ عشق میں بے اختیاریاں مت پوچھ
بس ایک جبر پہ کچھ اختیار باقی ہے

ہم نفس یہ عالمِ گم گشتگی کے راز ہیں
پا گیا منزل کو میں یا پا گئی منزل مجھے

لطفی، محمد حسن

نام: محمد حسن، لطفی تخلص۔ قلمی نام: م حسن لطفی۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ بی اے کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی میں داخلہ لیا، لیکن ایم اے نہ کر سکے۔ انھوں نے آکسفورڈ میں جرنلزم میں ڈپلوما حاصل کیا۔ انھیں پنجابی، اردو، فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اطالوی، عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ لدھیانہ میں وہ ''شاطو'' پریس کے مالک تھے۔ مجلّہ ''خیالستان'' کے نائب مدیر تھے۔ ۲۳ر مئی ۱۹۵۹ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی چند تصانیف یہ ہیں۔ ''لطیفیات''، ''دخترانِ ہند''، ''نفت آویزاں''، ''عظمتِ آدم'' "The Legend of Heer Ranjah"۔ ان کا یہ شعر زباں زدِ خاص و عام ہے:

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

فضا جالندھری

نام سیّد دل محمد، تخلّص فضا۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۰۵ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۲۲ء میں جالندھر میں زمانہ طالبِ علمی ہی میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ چند سال ریاض خیر آبادی اور جلیل مانک پوری سے اصلاح لی، لیکن ۱۹۳۰ء سے مستقل دل شاہجہاں پوری کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۶ء تک قائم رہا۔ ان کا کلام برصغیر کے مؤقر رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ مشرقی پنجاب کے ہنگاموں میں ان کا ایک بڑا ذاتی کتب خانہ اور تین دیوان ضائع ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو خانیوال میں مقیم ہو گئے۔ ۱۷ر جون ۱۹۶۸ء کو خانیوال میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

وہ طور تھا جو برق تجلّی سے جل گیا
میری فضائے دل پہ یہ بجلی گرا کے دیکھ

سنے گا تری کون اے عندلیب!
صبا کان پھولوں کے بھر جائے گی

کبھی قافلے کے آگے، کبھی قافلے کے پیچھے
نہ میں کارواں میں شامل، نہ جدا ہوں کارواں سے

زندگی کی اُداس راہوں میں
بارہا تیری یاد آئی ہے

حیدر دہلوی

سیّد جلال الدّین حیدر نام، تخلّص حیدر۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۶ء کو گلی شاہ تارہ، اجمیری گیٹ، دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد عربی اور فارسی پڑھی۔ حیدر صاحب گھڑی سازی، بائنڈنگ، لیتھو پریس کی چھپائی اور پریس لائن سب میں دست رس رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ صفِ اوّل کے صحافی بھی تھے۔ حیدر صاحب کی نگرانی میں دلّی سے ''کہکشاں''، ''الہام''، ''فرمان''، ''تیغ''، ''چنگاری'' اخبارات اور رسائل کا اجرا ہوا جن کے وہ سرپرست تھے۔ وہ ۱۳ سال کی عمر میں مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔ انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اربابِ علم وفن نے انھیں ''خیام الہند'' کے لقب سے نوازا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ پہلے انھوں نے ڈھاکا میں قیام کیا پھر کراچی کو وطن ثانی بنایا۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۵۸ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد انور دہلوی نے ان کے کلام ''منظومات اور قطعات'' کا مجموعہ شائع کیا۔

منتخب اشعار

چمن والوں سے مجھ صحرانشیں کی بود و باش اچھی
بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

ابھی ماحول معیارِ سخن میں پست ہے حیدرؔ
یکا یک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

یہ کیا دستِ ازل کو کام سونپا ہے مشیّت نے
چمن سے توڑنا پھول اور ویرانے میں رکھ دینا

۶ فطرت، عبدالعزیز

نام عبدالعزیز، فطرت تخلّص۔ ۱۵؍فروری ۱۹۰۵ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ پہلے ڈاکٹر طاہر اور بعد میں عبدالمجید سالک سے اصلاح لیتے رہے۔ وہ شاعر کے علاوہ صحافی اور وقائع نگار بھی تھے۔ وہ ریڈیو کے لیے سکرپٹ رائٹر کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ محکمہ ڈاک کی ملازمت انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دی اور ریٹائرمنٹ کے بعد دس ہزار روپیہ انعام حاصل کیا۔ راولپنڈی اور علاقہ پوٹھوہار کی ادبی زندگی کو نکھارنے اور سنوارنے میں انھوں نے بڑا کام کیا۔ ۵؍اکتوبر ۱۹۶۷ء کو راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ''بزم علم وفن پاکستان، راولپنڈی'' کے تعاون سے ان کا شعری مجموعہ ''کلامِ فطرت'' (غزلیات) کے نام سے شائع ہوا۔ وہ دبستانِ راولپنڈی کے بانی اور بابائے پوٹھوہار اور شاعرِ پوٹھوہار تھے۔

منتخب اشعار

رفتہ رفتہ ترے چہرے سے سرکنا وہ نقاب
ہوتے ہوتے مہِ نو کا مہِ کامل ہونا

دلوں میں جن کے مرنے کی تڑپ ہے
الٰہی! زندگی اُن کو عطا کر

زمانے کے شدائد سہہ گئے ہم
کبھی ہنس کر کبھی آنسو بہا کر

شاید کوئی جمالِ ازل کی جھلک ملے
ہم پھر سوادِ شہرِ نگاراں میں آئے ہیں

فطرتؔ کے معائب پہ ہیں دنیا کی نگاہیں
دی خوب زمانے نے سزا بے ہنری کی

مرنا بھی نہیں ہے اپنے بس میں
جینا بھی عذاب ہو گیا ہے

۷ عابد، سیّد عابد علی

نام عابد علی، تخلّص عابد۔ ۷؍ستمبر ۱۹۰۶ء کو ڈیرہ اسماعیل خاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ڈیرہ اسماعیل خاں میں ہوئی جہاں ان کے والد فوج میں ملازم تھے۔ ان کے بعد لاہور میں تعلیم پائی اور وہیں سے ۱۹۲۳ء میں بی اے اور ۱۹۲۵ء میں

ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ چوں کہ آپ کو شعر و ادب سے لگاؤ تھا اس لیے وہ ''دلکش'' اور ''ہزار داستان'' رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں جناب عابد نے گجرات میں وکالت شروع کی، لیکن یہ مشغلہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا۔ علمی اور ادبی ذوق انھیں لاہور کھینچ لایا۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور دیال سنگھ کالج، لاہور میں فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ اس اسامی پر چار سال کام کرنے کے بعد آپ ایف۔ سی کالج، لاہور سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں پروفیسر عابد دیال سنگھ کالج سے دوبارہ متعلّق ہوئے اور قیام پاکستان کے بعد کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ انھیں کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں تھا۔ ۲۰ رجنوری ۱۹۷۱ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے چند نام یہ ہیں۔ ''اصولِ انتقاد،'' ''ادب کے اسلوب،'' ''شمع،'' ''ید بیضا،'' ''سہاگ،'' ''تلمیحاتِ اقبال،'' ''طلسمات،'' ''میں کبھی غزل نہ کہتا،'' ''بریشم عود۔''

منتخب اشعار

خبر نہ تھی کہ غمِ یار جس کو سمجھے تھے — اُسی کا روپ غمِ روزگار ٹھہرے گا

ایک ٹھنڈی آنچ سی محسوس ہوتی ہے مجھے — کس طرف ہے شعلۂ شہر نگاراں دیکھنا

دنیا ترے وجود کو کرتی رہی تلاش — ہم نے ترے خیال کو یزداں بنا دیا

دمِ رخصت وہ چُپ رہے عابدؔ — آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

لوگ تو دامن سی لیتے ہیں، جیسے ہو جی لیتے ہیں — عابدؔ ہم دیوانے ہیں جو بال بکھیرے پھرتے ہیں

کہتے تھے تجھی کو جان اپنی — اور تیرے بغیر بھی جیے ہیں

غمِ ہستی کے بیابانوں سے — کچھ ہمیں تھے کہ غزل خواں گزرے

رات بھر میں نے سجائے سرِ مژگاں تارے — مجھ کو تھا وہم کہ یوں رات گزر جائے گی

گلوں کی خوں شدگی سے سراغ ملتا ہے — کہیں چمن سے نسیمِ بہار گزری ہے

اے التفاتِ یار مجھے سوچنے تو دے — مرنے کا ہے مقام یا جینے کا ہے محل

۶ فضلی، فضل احمد کریم

نام فضل احمد کریم، فضلی تخلّص۔ ۴ رنومبر ۱۹۰۶ء کو بہرائچ، ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ وطن الہ آباد۔ بی اے تک الہ آباد میں تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہو کر ۱۹۲۶ء میں ٹریننگ کے لیے ولایت گئے۔ وہاں آکسفورڈ سے (بی لٹ) کی ڈگری حاصل کی۔ نومبر ۱۹۳۲ء میں واپس آ گئے اور بنگال میں

تقرر ہوا۔ مختلف عہدوں پر تعینات رہ کر بالآخر حکومت مشرقی پاکستان میں سکریٹری محکمۂ تعلیمات کے منصب پر فائز رہے۔ آپ کچھ عرصہ وزارتِ امورِ کشمیر کے سکریٹری بھی رہے۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت امریکا کی دعوت پر امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں میں مہمان لکچرر کی حیثیت سے لکچر دیے۔ فضلی نے ذوق شعری اپنے والد سے ورثے میں پایا۔ ''نغمۂ زندگی'' اور ''چشمِ غزال'' ان کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''خونِ جگر ہونے تک'' (ناول) اور ''سحر ہونے تک'' (ناول) آپ کی مطبوعہ تصانیف ہیں۔ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد کراچی میں ''چراغ جلتا رہا''، ''وقت کی پکار''، اور ''ایسا بھی ہوتا ہے'' نامی فلمیں تخلیق کیں۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو کراچی میں وفات پا گئے۔

منتخب اشعار

ان کی خوشبو نفس نفس میں ہے — سانس لینا بھی اب ہے کارِ ثواب

تم نے آخر بھلا دیا نہ ہمیں — سچ ہے، رکھتا ہے کون کس کو یاد

شیخ صاحب بڑے عذاب میں ہیں — کارہائے ثواب کی خاطر

ہم جو رہتے ہیں کھوئے کھوئے سے — ایسی ہی پڑ گئی ہے کچھ اُفتاد

غمِ دوراں میں کہاں بات غمِ جاناں کی — نظم ہے اپنی جگہ خوب، مگر ہائے غزل

ہمارے اُن کے تعلق کا اب یہ عالم ہے — کہ دوستی کا ہے کیا ذکر دشمنی بھی نہیں

بڑا ستم یہ نہیں ہے کہ ہم ہوئے بے حس — ستم تو یہ ہے کہ احساسِ بے حسی بھی نہیں

بات اپنی تمھیں نہ یاد رہی — خیر جانے دو کوئی بات نہیں

بند ہیں راہیں کہیں، حکمِ زباں بندی کہیں — بندہ پرور یوں بھی ہوتی ہے خداوندی کہیں

ہے سخت مشکل میں جانِ ساقی، پلائے آخر کدھر سے پہلے — سبھی کی آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں، اِدھر سے پہلے، اِدھر سے پہلے

یہ مانا اس سے خودداری ہماری ذبح ہوتی ہے — مگر رہزن کو میرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

گلشن میں عجب رنگِ بہاراں نظر آیا — ہر پھول یہاں چاکِ گریباں نظر آیا

ماہر القادری

نام منظور حسین، تخلّص ماہر۔ ۳۰ر جولائی ۱۹۰۶ء کو کیسر کلاں، ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ روزگار کی تلاش میں کچھ عرصہ ''مدینہ، بجنور'' کی ادارت میں شامل رہے۔ پھر ہفت روزہ ''غنچہ'' کے مدیر رہے۔ حیدرآباد (دکن) میں تقریباً سولہ سال قیام رہا۔

دکن میں سرکاری ملازمت سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ۱۹۴۳ء میں عراق کا سفر کیا اور وہاں کے علما اور مشاہیر کے علاوہ ہز میجسٹی غازی الاوّل شاہ سے بھی ملاقات کی۔ ۱۹۴۳ء میں دکن سے نقل مکانی کر کے دہلی آ گئے۔ بمبئی میں کچھ عرصہ فلموں کے لیے نغمے لکھے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور کراچی سے ماہ نامہ ''فاران'' جاری کیا۔ اچھا کھانا کھانے کے بہت شوقین تھے۔ لطائف انھیں بہت یاد تھے۔ ۱۲ رمئی ۱۹۷۸ء کو جدّہ میں مشاعرے کے دوران دل کا دورہ پڑا اور انتقال کر گئے۔ مکہ معظمہ میں دفن ہوئے۔ ان کی نظم ونثر کی تقریباً بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں: ''آتشِ خاموش،'' ''شیرازہ،'' ''محسوساتِ ماہر،'' ''نغماتِ ماہر،'' ''جذباتِ ماہر،'' ''کاروانِ حجاز،'' ''زخم ومرہم۔'' ''کلّیاتِ ماہر'' بھی چھپ گئی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی کتاب ''یادِ رفتگاں'' کے نام سے دو حصّوں میں شائع ہوئی۔ ماہر القادری نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔

منتخب اشعار

رسولِ مجتبیٰؐ کہیے، محمد مصطفیٰؐ کہیے
خدا کے بعد بس وہ ہیں، پھر ان کے بعد کیا کہیے

محمدؐ کی نبوت دائرہ ہے نورِ وحدت کا
اِسی کو اِبتدا کہیے، اِسی کو انتہا کہیے

اگر خموش رہوں میں تو تُو ہی سب کچھ ہے
جو کچھ کہا تو ترا حُسن ہو گیا محدود

جب کھلیں آنکھیں تو دیکھا، وہ سرِ بالیں نہ تھے
ہوش آنا تھا کہ پھر بیمار غافل ہو گیا

ترے خیال نے بے چین کر دیا جس کو
کوئی خیال اُسے مطمئن بنا نہ سکا

یہ بھی زمانہ دیکھ لیا
چور بنے ہیں چوکی دار

مرے حال پر اور اتنی نوازش
وہ کیوں مہرباں ہیں خدا کو خبر ہے

چُپ چُپ ہو آج آنکھ اُٹھاتے نہیں ہو تم
کوئی تو بات ہے کہ بتاتے نہیں ہو تم

پروانے آ ہی جائیں گے کھنچ کر بہ جبرِ عشق
محفل میں صرف شمع جلانے کی دیر ہے

وہ بھی تڑپ نہ جائیں تو اِس عاشقی پہ خاک
مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

جامِ شراب، مست گھٹا، مطرب و بہار
سب آ چکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے

یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں
غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں

شب وعدہ وہ اب تک آ رہے ہیں
ستارے ہیں کہ ڈوبے جا رہے ہیں

اے کراچی! تیرے نظاروں کا پیہم شکریہ
اس کو کیا کیجے کہ پھر بھی یاد آتا ہے وطن

مجھ کو ڈر ہے کہیں رحمت نہ پریشاں ہو جائے
لوگ اس درجہ گناہوں سے پشیماں کیوں ہیں

ابھی رودادِ محبت نہ سناؤ ماؔہر
درد کی سطح پر ہر چیز کو آ جانے دو

گزر رہی ہے کچھ اس ڈھب سے زندگی ماؔہر
کہ جیسے میری ضرورت نہیں زمانے کو

منزل میں محبت کی ہستی ہی رکاوٹ ہے
کل بزم میں کہتا تھا جلتا ہوا پروانہ

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سَو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی

کچھ اور بڑھ گئیں ہیں غلامی کی بندشیں
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ زنجیر کٹ گئی

قفس کیا اور قفس کی تیلیاں کیا
کسی میں جرأت پرواز بھی ہے

ذرا دریا کی تہہ تک تو پہنچ جانے کی ہمّت کر
تو پھر اے ڈوبنے والے کنارا ہی کنارا ہے

مصیبت کا بھی اک مقصد ہے دنیائے حوادث میں
کہ اک ٹھوکر لگے اور آدمی ہشیار ہو جائے

پھولوں کی ذرا روش تو دیکھو
کانٹوں سے نباہ کر لیا ہے

خدا کے واسطے دامن کا چاک سینے دو
کبھی کبھی تو جنوں ہوشیار ہوتا ہے

نگاہِ مست کو مصروف ناز رہنے دے
کچھ اور روز مجھے پاکباز رہنے دے

روکیے اپنی مست نظروں کو
ساری دنیا خراب ہوتی ہے

نقابِ رُخ اُٹھایا جا رہا ہے
وہ نکلی دھوپ، سایا جا رہا ہے

باسط بھوپالی

نام محمد باسط، تخلّص باسط۔ ان کا وطن بھوپال تھا۔ ذکی وارثی سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کا کلام ماہ نامہ ''نگار'' لکھنؤ میں شائع ہوتا تھا۔ نیاز فتح پوری ان کی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے۔ باسط بھوپالی ۳؍دسمبر ۱۹۶۱ء کو بھوپال میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

بارہا دیکھا ہے دل نے او مرے محشر خرام!
حشر اُٹھا اور ترے قدموں میں شامل ہو گیا

ترے نثار، یہ کیا کیفیات ہیں غم کی
ضرورتاً بھی کبھی مسکرا نہیں سکتے

اب کوئی آیا، اب کوئی آیا، اب دل ٹھہرا، اب دل ٹھہرا
شام سے وہ اک خواب کا عالم، خواب کی دنیا کیا کہیے

اوّلِ شب تو جیسی گزری، مرتے جیتے کٹ ہی گئی
لیکن آخر آخرِ شب وہ دل کا تڑپنا، کیا کہیے

انجم رضوانی

نام قاضی احمد دین، تخلّص انجم۔ ولادت ۲۵ر نومبر ۱۹۰۷ء، راولپنڈی۔ ۱۹۶۷ء میں اسسٹنٹ آرکیٹکٹ کی حیثیت سے نوکری سے سبک دوش ہوئے۔ انجم رضوانی نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی، مگر وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ۶ر مارچ ۱۹۹۶ء کو راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''انجمستان'' ''پارہ پارہ''۔

منتخب اشعار

نگاہ مضطر ولرزاں ہے، دل دھڑکتا ہے
کہ پردۂ رُخِ پُرنور پھر سرکتا ہے

مجھے اب ضرورت نہیں راہ بر کی
وہ کھائی ہے ٹھوکر کہ ہوش آ گیا ہے

میں فریبِ دَیر و کعبہ کھا گیا ہوتا، مگر
راہ پر لے آئی میری طبعِ رندانہ مجھے

ابھی حوصلے جواں ہیں، ہوئی ختم گو جوانی
کہ پڑی ہوئی ہیں دل کو وہی عادتیں پُرانی

طالب باغپتی

کنور لطافت علی خاں نام، طالب تخلّص۔ ۲۷ر نومبر ۱۹۰۳ء کو باغپت، ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم والد کے زیرِ سایہ ہوئی۔ پھر میرٹھ کالج میں ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد معاشی فکر لاحق ہوئی اور طالب صاحب سب رجسٹرار کے عہدے پر فائز ہوکر اپنے فرائض نہایت ذمّے داری سے ادا کرنے لگے۔ شعر وشاعری سے لگاولڑکپن سے تھا۔ ۱۹۲۶ء میں جب ملازمت کے سلسلے میں تعلیم ترک کی تو مضمون نگاری اور شعروادب کی طرف مائل ہو گئے۔ انھیں ندرت میرٹھی سے تلمذ حاصل تھا۔ ''کوئی'' کے فرضی نام سے رسالہ ''عالمگیر'' میں فکاہی مضامین لکھتے رہے۔ طالب صاحب کا مجموعۂ کلام ۱۹۳۶ء میں ''شاخِ نبات'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ ''قندِ مکرر'' کے نام سے تھا، لیکن وہ شائع نہ ہوسکا۔ آپ نے تقریباً ۸۲ر سال کی عمر میں ۲۶ر جولائی ۱۹۸۴ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

منتخب اشعار

بے خودی میں ہم تو تیرا در سمجھ کر جھک گئے
اب خدا معلوم، وہ کعبہ تھا یا بت خانہ تھا

روک دیتا ہے ترے موجِ تبسّم کو حجاب
یا کسی سر بند شیشے میں مچلتی ہے شراب

مری آہوں سے تارے ٹوٹتے ہیں، ٹوٹتے ہوں گے
تمھیں تو نیند آ جاتی ہے، پھر تم بدگماں کیوں ہو؟

ہم سے بھی پوچھ لو شبِ غم کس طرح کٹی — تم نے تو کہہ دیا کہ 'ہمیں نیند آ گئی'
اب ترے انتظار میں سمجھا — عمر کتنی دراز ہوتی ہے
ساون کی پُروائی نے کیا دکھتی چوٹ دکھائی ہے — کیسے آنسو اُمڈے ہیں، جب یاد تمھاری آئی ہے
صبح دَم آج اس انداز سے گزری ہے نسیم — تم نے کچھ کان میں چپکے سے کہا ہو جیسے

بیدل عظیم آبادی

نام عبدالمنّان، بیدل تخلّص۔ یکم جولائی ۱۹۰۷ء کو آرہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ موضع ڈیانواں ضلع پٹنہ آپ کا وطن مالوف ہے۔ آپ نے کلکتے میں ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے مدرسۂ عالیہ میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ پھر آپ کی خدمات حکومت بہار کو منتقل کر دی گئیں۔ ۱۹۶۹ء تک تعلیمی صیغے میں کام کرتے رہے۔ تین برس پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ اور سنڈیکیٹ کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ وحشت کلکتوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۹ر اپریل ۱۹۸۲ء کو پٹنہ میں انتقال کر گئے۔ ''نوائے بیدل'' کے نام سے آپ کا کلام شائع ہو گیا ہے۔

منتخب اشعار

میں تو الفت میں وفا کر کے پشیمان ہوا — دیکھنا تم نہ جفا کر کے پشیماں ہونا
یہ ہم نے کب کہا، وعدہ ہے آپ کا جھوٹا — یہ کیوں قسم پہ قسم آپ کھائے جاتے ہیں
ہمارا قصّہ ہمارا سمجھ کے کب سنتے — بدل کے نام ہم اُن کو سنائے جاتے ہیں
ہوتے جاتے ہیں بند دیدۂ قیس — ہٹتے جاتے ہیں پردے محمل کے
اَن جان تم بنے رہے یہ اَور بات ہے — ایسا تو کیا ہے، تم کو ہماری خبر نہ ہو
درد سینے میں کہاں اور کدھر ہوتا ہے — یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے ہیں، مگر ہوتا ہے
قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے، لذّتِ کوشش تو ملتی ہے — پٹک لینے دو سر کو، بال و پر سے کھیل لینے دو

رضوی، سیّد اجتبیٰ حسین

نام سیّد اجتبیٰ حسین رضوی، تخلّص رضوی (ابتدائی تخلّص متین)۔ ۱۹۰۸ء میں چھپرہ، صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں راجپوت ہائی اسکول، چھپرہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں میٹریکولیشن، ۱۹۲۷ء میں آئی اے، ۱۹۲۹ء میں بی اے اور ۱۹۳۸ء میں ایم اے (فارسی) پٹنہ یونیورسٹی سے کیا۔ ۱۹۳۸ء ہی میں

راجندر کالج میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں ملّت کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں ایل این متھلا یونیورسٹی میں پرووائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں یونیورسٹی کے عہدے سے سبک دوش ہوگئے۔ مطالعہ، تصویر کشی اور باغ بانی کا شوق رہا ہے۔ اپنے صاحب زادے کے ساتھ دربھنگہ میں ان کا قیام ہے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کا شعری مجموعہ ''شعلۂ ندا'' کے نام سے شائع ہوا۔

اجتبیٰ رضوی کا کلام تغزل اور تصوف دونوں کی ایسی مثالیں اپنے اندر رکھتا ہے جس کی انفرادیت اور حلاوت سے کوئی دیانت دار آدمی انکار نہیں کرسکتا۔ (نظیر صدیقی)

منتخب اشعار

ہم روتے ہیں اپنے پیاروں کو اور فطرت ہم سے کہتی ہے
اب اَور کھلونوں سے کھیلو جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

اے ساقیٔ بزمِ کیفِ حیات! اب مجھ کو پیاسا جانے دے
ئے جس میں مری تقدیر کی تھی وہ شیشہ تجھ سے ٹوٹ گیا

ہم تو آشفتہ سری سے نہ سنورنے پائے
آپ سے کیوں نہ سنوارا گیا گیسو اپنا

تمھاری گر جستجو نہ کرتے تو ہم جہاں تھے وہیں پہ تم تھے
ہم اپنی منزل سے بڑھ گئے ہیں، بُرا ہو اس ذوقِ جستجو کا

ہوش وخرد میں آگ لگا دی خرمنِ کیف وکم کو جلایا
شعلہ بنے اور سینے سے لپٹے، آپ جلے اور ہم کو جلایا

زباں سے دل کا فسانہ ادا کیا نہ گیا
یہ ترجماں تو بنی تھی، مگر بنا نہ گیا

غبار بن کے آرزو رواں دواں ہیں کُو بہ کُو
کہیں سے کچھ صدا تو دو، کہاں ہو تم، کہاں ہو تم

وجہِ گناہ و کفر و شر، وجہِ خرابیٔ نظر
تم کو گماں کہ تم نہیں، ہم کو یقیں کہ ہم نہیں

فتنے جگا کے دہر میں، آگ لگا کے شہر میں
جا کے الگ کھڑے ہوئے، کہنے لگے کہ ہم نہیں

جو ساری پونجی ہار چلا، وہ عشق کی بازی مار چلا
اس کھیل کی ریت انوکھی ہے، پاتے ہیں وہی جو کھوتے ہیں

یہ میرِ قافلۂ شب رواں سے پوچھ تو لو
کہ تیرہ بختوں کی آخر کہاں سحر ہوگی؟

ازل سے دل میں مشیّت کے چبھ رہا ہوگا
وہ راز جو ابھی تقدیرِ رازداں میں نہیں

دل دیا تھا تو تمنّا کو بھی بڑھنے دیتے
تم نے جلنے نہ دیا آگ لگا کر مجھ کو

اس حرص وہوس کے میلے میں ہم جنسِ محبت لائے ہیں
سب سستے مال کے گاہک ہیں یہ مہنگا سودا کون کرے

خوب تماشا ہم کو بنایا، آپ تماشا آپ ہوئے
ہم کو رسوا کرنے نکلے، کیسے رسوا آپ ہوئے

معنی وصورت، وحدت وکثرت، ذرّہ وصحرا آپ ہوئے
آپ تو کچھ ہوتے ہی نہیں تھے، کہیے کیا کیا آپ ہوئے

تہمتِ کعبہ آپ نے لی، بدنام کلیسا آپ ہوئے
طور پہ بجلی، قصر میں شیریں، نجد میں لیلا آپ ہوئے

خودی تو کعبے میں بھی پکاری، خدا نہیں ہے خدا نہیں ہے
شکستِ دل نے مگر صدا دی کہ آ، اِدھر منزلِ یقیں ہے

خدا پرستی کا بیج بو کر خودی کا دل میں فروغ دیکھو
یہیں سے جھوٹے خدا اُگے ہیں بڑی خطرناک یہ زمیں ہے

افسردگی بھی حُسن ہے تابندگی بھی حُسن
ہم کو خزاں نے تم کو سنوارا بہار نے

کچھ بات تو کرتا چل مانجھی بس تُو ہی ایک سہارا ہے
اب کتنی دور کنارا ہے، اب کتنی دور کنارا ہے

ہے شام جھما جھم تاروں سے، ہے صبح جھکا جھک کرنوں سے
یہ کس نے بال سنوارے ہیں؟ یہ کس نے روپ نکھارا ہے

جب تک نہ حریمِ ناز سے تم درویش کی کٹیا میں اُترو
ہم تم کو پکارے جائیں گے، جب ہم نے تم کو پکارا ہے

حبیب احمد صدیقی

نام حبیب احمد صدیقی، تخلّص حبیب۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۰۸ء کو سیوہارہ، ضلع بجنور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۲۹ء میں ایم اے انگریزی اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے۔ ملازمت کا آغاز ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے ہوا۔ ملازمت کے سلسلے میں گورکھپور، کان پور، لکھنؤ مختلف مقامات میں رہے۔ ترقی کر کے نینی تال کے کمشنر کے عہدے پر فائز رہے۔ یوپی پبلک سروس کمیشن کے ممبر بھی رہے۔ ۱۹۶۹ء میں پاکستان آ گئے۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے ''جلوۂ صد رنگ'' اور ''گلِ صد برگ'' شائع ہو چکے ہیں۔ آپ وفات پا چکے ہیں۔

آپ اُن چند گنے چنے غزل گویوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام سے غزل کو اس زمانے میں بے آبرو ہونے سے بچایا۔ (رشید احمد صدیقی)

منتخب اشعار

تنہا ابھی تھا میں ہی خطاوارِ جرمِ عشق
اچھا، حضور کو بھی یہ آزار ہو گیا؟

کیا جانے رہنما کو بُری کس لیے لگی
رہرو تو کر رہے تھے کسی راہزن کی بات

تخیّل کی قیاس آرائیاں بھی حیف کھو بیٹھے
بہت پچھتائے ہم تو محرمِ رازِ جہاں ہو کر

مجھ کو دماغِ شیون و آہ و فغاں نہیں
اک آتشِ خموش ہوں جس میں دھواں نہیں

اس وفورِ بے دلی پر بھی جیے جاتا ہوں میں
کیا خبر یہ زندگی کو آسرا دیتا ہے کون

وطن سے آنے والے یہ خدارا مجھ کو بتلا دے
وہی بھادوں کا موسم ہے، وہاں ہے کیا وہی ساون؟

تمھاری محبت، تمھاری عداوت
کسے یاد رکھیں، کسے بھول جائیں

ہر قدم پر ہے احتسابِ عمل
اک قیامت پہ انحصار نہیں

خیال میں بسا ہوا ہے آشنا کے روپ میں
وہ دل نواز اجنبی کہ جس سے گفتگو نہیں

جب راہِ محبت سے قدم ہٹنے لگے ہیں
دل نے وہیں آواز دی، 'میں دیکھ رہا ہوں'

تمام حرف و حکایات کہہ گئی، لیکن
نگاہِ ناز نے کہنے کو کچھ کہا بھی نہیں

جس کے واسطے برسوں سعیٔ رائگاں کی ہے
اب اسے بھلانے کی سعیٔ رائگاں کر لیں

اب تو جو شے ہے، مری نظروں میں ہے ناپائدار
یاد، ایامے کہ غم کو جاوداں سمجھا تھا میں

پڑے رہنے بھی دے پردے کہیں ایسا نہ ہو غافل!
کہ دنیا تو الگ، عقبیٰ سے دل بیزار ہو جائے

عشوہ و ناز و ادا کا بھی فسوں ہے تو حسیں
خود فریبی کا فسوں سب سے حسیں ہوتا ہے

دلِ فسردہ کو غم ہے اگر تو یہ غم ہے
کہ اب فریبِ تمنا میں دل کشی کم ہے

جو کام ہم نے بگاڑے خود اپنے ہاتھوں سے
اُنھیں مشیّتِ پروردگار سمجھے تھے

ہزار ضبط کرے کوئی، پر کبھی نہ کبھی
زباں پہ شکوۂ اہلِ جہاں بھی آتا ہے

گلوں سے اتنی بھی وابستگی نہیں اچھی
رہے خیال کہ عہدِ خزاں بھی آتا ہے

جو کام کرنے ہیں اس میں نہ چاہیے تاخیر
کبھی پیامِ اجل ناگہاں بھی آتا ہے

سوز شاہ جہاں پوری

نام سیّد جواد علی، سوز تخلّص۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۰۸ء کو شاہ آباد، شاہ جہاں پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف حفظ کرنے اور قرأت سیکھنے کے ساتھ ساتھ درسِ نظامی کی تعلیم تکمیل کی۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو اپنے خاندان میں علما، فضلا، صوفیہ شعرا کو دیکھا۔ انھیں شعر وسخن سے فطری دلچسپی تھی۔ چناں چہ ۱۳۔۱۴ سال کی عمر سے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ شروع کی چند غزلوں میں ان کا نام بطور تخلّص استعمال ہوا۔ اس کے بعد بعض حضرات نے فیض تخلّص تجویز کیا اور پھر بعض بزرگوں نے سوز تخلّص رکھ دیا۔ ابتدا میں چند غزلیں فرحت تلہری کو دکھائیں، پھر حضرت ازل شاہ جہان پوری سے کچھ غزلوں پر اصلاح لی۔ قیام دہلی کے زمانے میں چند غزلیں بیخود دہلوی کو دکھائیں۔

دہلی میں سہ روزہ ''الجمعیۃ''، ''الامان'' اور اخبار ''ریاست'' سے منسلک رہے۔ جب دہلی سے نکلے تو لکھنؤ پہنچے۔ وہاں مختلف اخبارات اور رسائل سے وابستہ رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں انڈیا گورنمنٹ نے یوپی کا اسسٹنٹ پبلی سٹی آفسر مقرر کیا۔ سوز ۱۹۵۱ء میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ اخباری مصروفیات اور شعر و شاعری کے

علاوہ انھوں نے افسانے، مختصر ڈرامے، ریڈیائی تقاریر اور ادبی مقالے لکھے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سوز صاحب نے مشاعروں میں شرکت ترک کر دی اور خانہ نشین ہو گئے۔ ''کلّیاتِ سوز'' (حصہ اوّل) ان کی زندگی میں چھپ گئی۔ ۲۳؍جنوری ۱۹۹۶ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

کون آتا ہے دبے پاؤں رگِ جاں کے قریب — گردشیں تلخیِ دوراں کی رکی جاتی ہیں

یہ نگاہ والہانہ، یہ شباب ساحرانہ — تری زد میں آ نہ جائے کہیں گردشِ زمانہ

چمن میں رہ کے گزرتے ہیں ایسے کچھ لمحے — کہ حسنِ گل بھی نگاہوں پہ بار ہوتا ہے

مرے اظہارِ وفا پر اُسے رہتا ہے سکوت — یہ غلط ہے تری تصویر میں گویائی ہے

صبا اکبر آبادی

نام خواجہ محمد امیر، تخلّص صبا۔ ۱۴؍اگست ۱۹۰۸ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ شاعری کا آغاز ۱۹۲۰ء سے ہوا اور اپنے عربی فارسی کے استاد اخضر اکبر آبادی کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۹۳۰ء میں محکمہ تعلیم میں بطور کلرک ملازم ہو گئے۔ بعد ازاں متعدد تجارتی اور کاروباری اداروں سے منسلک رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور کراچی میں بود و باش اختیار کی ۱۹۶۱ء میں تقریباً ایک برس محترمہ فاطمہ جناح کے پرائیوٹ سکریٹری رہے۔ پھر جناح کالج اور دوسرے تعلیمی اداروں میں ۱۹۷۳ء تک کام کرتے رہے۔ غزل، رباعی، نظم، مرثیہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ اُن کے مجموعہ ہائے کلام ''اوراقِ گل'' اور ''چراغِ بہار'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے پورے دیوانِ غالب کی تضمین کے علاوہ عمر خیام کی کوئی بارہ سَو رباعیات کو اردو رباعی میں ترجمہ کیا ہے جس کا ایک مختصر انتخاب ''دستِ زرفشاں'' کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ صبا صاحب کے ترجمے کی دوسری کتاب ''ہم کلام'' ہے جس میں غالب کی رباعیات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی مرثیوں کی تین کتابیں ''سربکف''، ''شہادت'' اور ''خوناب'' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ صبا اکبر آبادی ۲۹؍اکتوبر ۱۹۹۱ء کو اسلام آباد میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ کراچی میں دفن ہوئے۔

منتخب اشعار

مجھ سے بہتر تو بہت آئیں گے — کوئی مجھ سا نہیں پیدا ہوگا

کون ہوگا مری وحشت کا حریف — اپنے ہی آپ سے لڑنا ہوگا

سَو بار جس کو دیکھ کے حیران ہو چکے | جی چاہتا ہے پھر اسے اک بار دیکھنا

میری طرف جو آئے تھے شاید وہ آپ تھے | وہ کون تھا جو دیکھ کے مجھ کو پلٹ گیا

تمام دھوپ کو سر پر گزار لیتا ہوں | زمیں پہ ہوں شجرِ سایہ دار کی صورت

کبھی کبھی وہ ہمارے قریب آ کر بھی | گزر گئے ہیں نسیمِ بہار کی صورت

سر جھکانے سے کچھ نہیں ہوگا | اُٹھ کے قاتل سے چھین لو تلوار

کسی بندے کی خدائی ہو تو اس سے پوچھوں | کتنے دن لگتے ہیں بندے کو خدا ہونے تک

کتنے دن لگتے ہیں اے خانہ خرابی! یہ بتا | اس زمیں پر در و دیوار کو گھر ہونے تک

آپ کے لب پہ اور وفا کی قسم! | کیا قسم کھائی ہے، خدا کی قسم!

سمجھے گا آدمی کو وہاں کون آدمی | بندہ جہاں خدا کو خدا مانتا نہیں

یہ ہمیں ہیں کہ ترا درد چھپا کر دل میں | کام دُنیا کے بدستور کیے جاتے ہیں

اُجالا کر کے ظلمت میں گھرا ہوں | چراغِ رہگذر تھا، بجھ گیا ہوں

تمھیں سَو رُخ نظر آئیں گے اپنے | میں آئینہ ہوں اور ٹوٹا ہوا ہوں

اپنے جلنے میں کسی کو نہیں کرتے ہیں شریک | رات ہو جائے تو ہم شمع بجھا دیتے ہیں

وہ آ رہے ہیں فقیروں کی جھولیاں بھرنے | یہاں پھٹا ہوا داماں ہے، دیکھیے کیا ہو

آغوش مہک رہا ہے اب تک | خوشبو ہے بسی ہوئی کسی کی

بال و پر کی جنبشوں کو کام میں لاتے رہو | اے قفس والو! قفس سے چھوٹنا مشکل سہی

آج تک منجدھار کو ساحل سے ہم دیکھا کیے | اب ذرا منجدھار سے نظّارۂ ساحل سہی

بھیڑ تنہائیوں کا میلا ہے | آدمی آدمی اکیلا ہے

بلندی سے اُسے گرنا پڑے گا | جو چشمہ خاک سے پھوٹا نہیں ہے

بس اتنا واسطہ ہے کاروں سے | لٹا ہوں میں نے کچھ لوٹا نہیں ہے

تنہائی میں خاموشیٔ صحرا ہی صدا دے | لوٹا کے مجھے خود مری آواز سنا دے

جو دَورِ خزاں تھا، ابھی گزرا بھی نہیں ہے | پیڑوں پہ کہاں پھول کہ پتا بھی نہیں ہے

یہ کیسی بھول بھلیوں میں عشق لے آیا | نہ راستہ ہے، نہ منزل ہے کیا کیا جائے

قفس میں آ کے اُجالا ملے کہاں سے مجھے | چراغ لے کے نکلتا تھا آشیاں سے مجھے

تمھیں نمودِ سحر بھی پسند، گل بھی عزیز
ہمارے چاکِ گریباں میں کیا برائی ہے

ابھی تو قافلۂ خاک وخوں سے گزرے گا
ابھی تو صرف چمن سے بہار گزری ہے

اچھا ہوا کہ سب در و دیوار گر پڑے
اب روشنی تو ہے مرے گھر میں، ہوا تو ہے

کسے خبر ہے اندھیرا ہو یا اُجالا ہو
چراغِ شب کو بچا کر رکھو سحر کے لیے

کچھ ہم صفیر باغ میں بے خانماں بھی ہیں
ہم نے قفس پہ ابر جو دیکھا تو ڈر گئے

کیا ختم کر دیا ہے سفر اہلِ شوق نے؟
رستے پڑے ہوئے ہیں، مسافر نہیں رہے

آپ آئے ہیں تو اب گھر میں اُجالا ہے بہت
کہیے جلتی رہے یا شمع بجھا دی جائے؟

شوکت تھانوی

نام محمد عمر، شوکت تخلص۔ ۳؍فروری ۱۹۰۴ء کو بندرابن، ضلع متھرا (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ (۱) وطن تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر تھا۔ بچپن ریاست بھوپال میں گزرا جہاں ان کے والد انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ان کے والد لکھنؤ آ گئے جسے انھوں نے وطن ثانی بنا لیا تھا۔ شوکت تھانوی لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا، لہٰذا ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ زمانہ طالبِ علمی ہی میں شعروسخن سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ مولانا عبدالباری آسی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اخبار نویسی سے ذمہ دارانہ زندگی کی ابتدا ہوئی۔ روزنامہ ''ہمدم'' کے عملہ ادارت میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کا مشہور مزاحیہ افسانہ ''سودیشی ریل'' شائع ہوا۔ روزنامہ ''اودھ اخبار'' کے مدیر اعلا کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اخبار نویسی کے بعد آل انڈیا، لکھنؤ سے وابستہ رہے۔ پھر پنچولی آرٹ پکچرس میں اسٹوری رائٹر کی حیثیت سے لاہور آ گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران گورنمنٹ آف انڈیا نے یوپی کا سانگ پبلی سٹی آفسر مقرر کیا۔ محکمہ کے ختم ہونے کے بعد پھر پنچولی آرٹ پکچرس میں لاہور واپس آ گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ مزاحیہ افسانوں کے مجموعے اور ناول وغیرہ پچاس سے زیادہ شائع ہو چکے ہیں۔ ''گہرستان'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ چھپ گیا ہے۔ ان کے ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انھیں ''تمغۂ امتیاز'' سے نوازا۔ ۴؍مئی ۱۹۶۳ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

(۱) ''وفیاتِ نام وَرانِ پاکستان''، مرتبہ ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ، اردو سائنس بورڈ، لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۴۰۵

''شعرستان'' (تذکرۂ شعرائے پاکستان)، مرتبہ مظہر صدیقی و نعمان تاثیر، مکتبۂ پرچم، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۲۱۰، میں شوکت تھانوی نے اپنی تاریخ پیدائش ۲؍فروری ۱۹۰۹ء لکھی ہے۔

منتخب اشعار

سچ ہے، اُن کو مجھ سے کیا اور میرے افسانے سے کیا | کر دیا دیوانہ تو اَب کام دیوانے سے کیا

رات بھر محفل میں جل کر شمع آخر بجھ گئی | صبح کو دیکھا تو بس پروانہ ہی پروانہ تھا

کچھ یاد ہیں آغازِ محبت کی وہ باتیں؟ | او بھولنے والے! یہی پیمانِ وفا تھا؟

یہی ہم تھے کہ روتے تھے تو اک دریا بہاتے تھے | یہی ہم ہیں کہ اک آنسو نہیں اب دیدۂ تر میں

دھوکا تھا نگاہوں کا، مگر خوب تھا دھوکا | مجھ کو تری نظروں میں محبت نظر آئی

آپ یاد آتے ہیں، جب پیٹ بھرا ہوتا ہے | فاقہ مستی میں، مگر یادِ خدا آتی ہے

جب وصل و جدائی میں تمیز نہیں رہتی | تب جا کے کہیں تیرا جلوہ نظر آتا ہے

باقی صدیقی

محمد افضل قریشی نام، باقی تخلص۔ ۲۰؍ستمبر ۱۹۰۵ء کو موضع سہام، ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، اس لیے میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ شروع میں تقریباً ۵؍سال راولپنڈی کے دیہاتی اسکولوں میں مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ یہ فضا ان کو راس نہ آئی۔ چناں چہ ملازمت سے سبک دوش ہو کر بمبئی چلے گئے۔ وہاں تین سال رہے اور دو ایک فلم کمپنیوں سے وابستہ رہے۔ اس مشغلے سے بھی بیزار ہو کر وطن واپس آ گئے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ حالات سے مجبور ہو کر جناب باقی حوالدار کلرک کے آسامی پر نوکر ہو گئے۔ دو سال بعد آپ فوج سے علاحدہ ہوئے اور آرڈیننس ڈپو میں ملازمت اختیار کر لی۔ پھر آپ ایم ای ایس، ریڈیو پاکستان، پشاور اور راولپنڈی میں ملازم رہے۔ باقی صدیقی کو غزل سے خاص دلچسپی تھی۔ عبدالحمید عدم سے تلمذ حاصل تھا۔ ۸؍جنوری ۱۹۷۲ء کو موضع سہام میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''جامِ جم،'' ''دار و رسن،'' ''زخمِ بہار،'' ''بارِ سفر،'' ''شاخِ تنہا،'' ''کتنی دیر چراغ جلا۔''

منتخب اشعار

آنا تری گلی میں وہ باقیؔ کا بار بار | اور دُور سے ترے در و دیوار دیکھنا

گھر میں تھا دشت نوردی کا خیال | دشت میں آئے تو گھر یاد آیا

ہر بات میں ہم دیتے ہیں غیروں کا حوالہ | اپنا کوئی آہنگ کوئی رنگ نہیں کیا؟

گزر گیا ہے محبت کا مرحلہ شاید | ترے خیال سے بھی دل نہ بے قرار ہوا

کون سے راستے پہ چل نکلے؟ | جس نے دیکھا، اُسی نے سمجھایا

کس نے کھینچی حیات کی تصویر | ہاتھ میں جام، پاؤں میں زنجیر

زندگی کی بساط پر باقیؔ | موت کی ایک چال ہیں ہم لوگ

راس آئی ہے کس کو ہنسی؟ | او غنچے! کچھ سوچ کے کِھل

آئے نہ اِدھر غمِ زمانہ | بیٹھے ہیں ترے خیال میں ہم

بعض اوقات ہوا کے جھونکے | لَو چراغوں کی بڑھا دیتے ہیں

یوں بھی لیا ہے ہم نے زمانے کا امتحاں | اپنے خلاف آپ ہی باتیں اُڑائی ہیں

زندگی دل کا سکوں چاہتی ہے | رونقِ شہرِ صبا کیا دیکھیں

دل سے اک بات کر رہے ہیں ہم | پاس بیٹھا نہ کوئی سنتا ہو

ہر نئے حادثے پہ حیرانی | پہلے ہوتی تھی اب نہیں ہوتی

عشق میں بھی نہ کچھ مِلا باقیؔ | اور دنیا کے کام سے بھی گئے

رفتارِ جہاں نہ پوچھ باقیؔ | ہر موڑ پہ حادثے کا ڈر ہے

آپ کو کارواں سے کیا مطلب | آپ تو میر کارواں ٹھہرے

ہر ایک آدمی اُڑتا ہوا بگولہ تھا | تمھارے شہر میں ہم کس سے گفتگو کرتے

اے بادِ سحر! نہ چھیڑ ہم کو | ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے

یوں موت کے منتظر ہیں باقیؔ | مل جائے گا چین جیسے مر کے

کشتیاں ٹوٹ گئی ہیں ساری | اب لیے پھرتا ہے دریا ہم کو

حسرت ترمذی

نام سیّد احمد اور تخلّص حسرت تھا۔ مارچ ۱۹۰۶ء میں جہاں آباد (کوڑہ) ضلع فتح پور ہسوہ میں پیدا ہوئے۔ حسرت نے سولہ برس کی عمر میں فارسی اور عربی میں اچھی استعداد حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی اور حیدر آباد دکن چلے گئے۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد کے ہوم آفس میں انھوں

نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور ترقّی کر کے اسسٹنٹ ہوم سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

ان کی طبیعت کا رجحان شروع سے غزل گوئی کی طرف مائل تھا۔ پہلی غزل اس وقت کہی تھی جب وہ میٹرک میں زیرِ تعلیم تھے۔ باقاعدہ طور پر یہ کسی کے شاگرد نہیں تھے، لیکن ناطق لکھنوی نے دو تین غزلیں اور جوش ملیح آبادی نے دس بارہ غزلیں دیکھی تھیں۔

جون ۱۹۴۹ء میں حسرت ترمذی کراچی منتقل ہو گئے اور شہری ہوابازی کے محکمے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء کی اسکریننگ میں گھر بٹھا دیے گئے۔ ملیر کالونی میں مکان بنوالیا تھا اور وہیں گوشہ نشیں ہو گئے۔ اسی گوشہ نشینی کے عالم میں ۱۹؍دسمبر ۱۹۷۷ء کو کراچی میں وہاں چلے گئے جہاں سے لوٹ کر دوبارہ کوئی واپس نہیں آتا۔

منتخب اشعار

وہی لمحے نشاطِ زندگی ہیں ۔۔۔ وہی لمحے جو تڑپاتے ہیں اکثر

موجوں کی تڑپ میں لطف تو ہے، موجوں سے کنارا کون کرے ۔۔۔ ساحل پہ خموشی موت کی ہے، ساحل کی تمنّا کون کرے

حسرت ذرا سکون ملا تھا کہ پھر ہمیں ۔۔۔ گزرے ہوئے بہار کے دن یاد آ گئے

یہ بے قرار موجیں، یہ دل فگار موجیں ۔۔۔ افسانہ کہہ رہی ہیں ساحل کی بے حسی کا

جب یہ دنیا بے نیازِ خیر و شر ہو جائے گی ۔۔۔ زندگی دشوار سے دشوار تر ہو جائے گی

موجوں کی یہ تڑپ، یہ تلاطم یہ اضطراب ۔۔۔ اے ناخدا! خموشیِ ساحل تو دیکھنا

مخدوم محی الدّین

نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدّین حذری۔ ۴؍فروری ۱۹۰۸ء کو سنگاریڈی، تعلقہ اندول، ضلع میدک، حیدرآباد، دکن میں پیدا ہوئے۔ مخدوم نے قرآن شریف ختم کرنے کے بعد دینیات کی تعلیم پائی۔ وہ ایک مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۹۲۹ء میں میٹرک کیا۔ اس کے بعد منشی کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور ۱۹۳۶ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں سٹی کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں چند وجوہ کی بنا پر مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں مخدوم کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس طرح ان کی سیاسی مصروفیتیں بہت بڑھ گئیں۔ ۱۹۴۳ء میں انگریزوں کے خلاف تقریر کرنے پر مخدوم کو تین ماہ کی قید ہوئی۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ تشکیل مخدوم کی رہنمائی میں ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں عام

انتخابات کے موقع پر وہ آندھرا پردیش اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اپنی وفات تک وہ اس کے رکن رہے۔ انھوں نے پابند اور آزاد نظمیں بھی لکھیں۔ قطعات، رباعی اور غزلوں میں بھی طبع آزمائی کی۔ زندگی کے آخری ایام میں مخدوم کو سینے اور حلق کی تکلیف تھی۔ وہ ۲۵ راگست ۱۹۶۹ء کو دہلی میں انتقال کر گئے اور حیدرآباد، دکن میں دفن ہوئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''سرخ سویرا''، ''گلِ تر''، ''بساطِ رقص۔''

منتخب اشعار

تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دھڑکتے دل سے
تیرے رُخ سے ترے آنچل کو ہٹانا ہی پڑا

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

بانسری کی سریلی سہانی صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

بات کیا تھی، ذکر کس کا تھا کہ ہنگامِ نشاط
مسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو سات لے کے چلو

تحفۂ برگِ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسّم ہیں ندیم
مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

ہجومِ شوق ترا رہگذار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ابھی نہ رات کے گیسو کھلے نہ دل مہکا
کہو نسیمِ سحر سے ٹھہر ٹھہر کے چلے

نہ کسی آہ کی آواز، نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چُپ ہے

بجا رہا تھا بہت دور کوئی شہنائی
اُٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

اُٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اُڑیں، گل کو ہمکنار کریں

ناشاد کان پوری

نام سریدھر پرشاد نگم، تخلّص ناشاد۔ ۲۸ راپریل ۱۹۰۸ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد اُن دنوں تعینات تھے۔ ان کے جدامجد نے قنوج، ضلع فرخ آباد سے منتقل ہو کر کان پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ناشاد کان پوری نے اپنے والد سے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں میٹرک کا امتحان نظام کالج، حیدرآباد، دکن اور ۱۹۲۷ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ بعدازاں آگرہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کی

سندیں حاصل کیں۔ میرٹھ کالج میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ بحیثیت نائب تحصیل دار تقرر ہو گیا۔ ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر پہنچ کر سبک دوش ہوئے۔ ان کی پرورش ادبی اور شاعرانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ شروع میں انھوں نے گنگا دھر ناتھ فرحت کان پوری کو کلام دکھایا۔ پھر انھیں کے مشورے پر جگر بریلوی کے شاگرد ہوئے۔ ۵؍دسمبر ۱۹۷۰ء کو کان پور میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''سرودِ سرمدی'' اور ''کیفِ سرمدی۔''

منتخب اشعار

جی میں جو آئے تم وہی کرنا	بات سننے میں کیا بُرائی ہے
وہی ہوتی ہے بات کہنے کی	لب تک آ کے جو بات رک جائے
تذکرہ تھا گردشِ ایّام کا	آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے
وقت کی خوبیاں معاذ اللّٰہ	ہم بھی اپنے نظر نہیں آئے
جانے کیا آج ہونے والا ہے	دل دھڑکتا ہے کیوں خدا جانے
بہت جی چاہتا ہے دیکھنے کو	بہت دن سے تمھیں دیکھا نہیں ہے
تم سچے، لو میں ہی جھوٹا	کون بڑھائے تم سے بات

بہار کوٹی

نام محمود الحسن، تخلّص بہار۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں قصبہ کوٹ، ضلع فتح پور ہسوہ (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے جدّ اعلا ملک بہل خاں کو شاہانِ مغلیہ سے بارہ گاؤں ملے تھے، کوٹ انھیں میں سے ایک ہے۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ورنا کیولر فائنل کا امتحان اردو اور ہندی کوٹ کے ٹاؤن اسکول سے پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول، فیروز پور (پنجاب) سے کیا۔ آپ کی زندگی کا زیادہ حصّہ اجمیر میں گزرا جہاں کمشنر اجمیر مارواڑ کے دفتر میں کلرک اور پھر برانچ انچارج کی حیثیت سے تقسیم ملک کے قبل تک مامور رہے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستان آ گئے اور ایک فرم میں ملازم ہو گئے۔ عیش فیروز پوری کے شاگرد تھے۔ کلام کا زیادہ حصّہ ان کی لاپرواہی سے ضائع ہو گیا۔ انھیں اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی سے لگاؤ تھا۔ ۲۱؍فروری ۱۹۷۱ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۹۷۷ء میں ان کا شعری مجموعہ ''ذات و کائنات'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''انتخاب عرش ملسیانی'' (کلام)، ''دیدارِ غالب،'' ''فیضانِ غالب۔''

منتخب اشعار

آسودگی نہیں مری کشتی کو سازگار — ٹکرا کے ٹوٹ جائے گی ساحل اگر ملا

کچھ اپنے اعتبارِ نظر سے بھی کام لے — چل کارواں کے ساتھ، مگر راہبر سے دور

کروٹیں لے رہے ہیں ذرّوں میں — جانے کتنے جہانِ نامعلوم

ہم نے کانٹوں کو بھی نرمی سے چھوا ہے اکثر — لوگ بے درد ہیں پھولوں کو مسل دیتے ہیں

جنوں نے اپنی حقیقت کو پالیا شاید — بہت دنوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں

جنوں پر ہنسنے والو اس جنوں کی — بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے

صحنِ حرم ہی جن کی ہو جولا نگۂ نگاہ — اس ساکنِ حرم کو جہنم میں ڈال دے

یہ انجم و مہ و خورشید و کہکشاں کا حجاب — بہت ہی کم ہیں مری کاوشِ نظر کے لیے

الٰہی اس خلشِ بے اماں کا کیا ہوگا — اب آستیں ہے نہ دامن ہے چشمِ تر کے لیے

کوئی منزل نہ جادۂ منزل — کس کی باتوں میں آ گئے ہم بھی

نذیر بنارسی

نام نذیر احمد اور تخلّص نذیر تھا۔ ۲۵؍نومبر ۱۹۰۹ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بنارس کے مشہور طبیب تھے۔ اس لحاظ سے نذیر بنارسی کا آبائی پیشہ طبابت تھا۔ شعر گوئی کا شوق انھیں اوائل عمر سے تھا۔ پہلی نظم اس وقت کہی جب ان کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ شرف تلمذ جناب بیتاب بنارسی سے تھا۔ نذیر بنارسی غزل کے رسیا تھے۔ ''گنگ وجمن'' ان کے شعری مجموعے کا نام ہے۔ ۲۳مارچ ۱۹۹۶ء کو بنارس (وارانسی) میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

خفا ہوتے ہو کیوں ذکرِ وفا پر — کسی نے کہہ دیا ہے بے وفا کیا؟

آنکھوں کی نیند دونوں طرح سے حرام ہے — اس بے وفا کو یاد کریں یا بھلائیں ہم

ان کا دامن تو مرے ہاتھ سے کچھ دور نہ تھا — میں نے سوچا کہ محبت نہ ہو بدنام کہیں

اور تو کچھ نہ ہوا پی کے بہک جانے سے — بات مے خانے کی باہر گئی مے خانے سے

ہونے والا تھا کوئی بڑا حادثہ — وہ تو کہیے کہ آنسو رواں ہو گئے

ہر گھڑی چُپ بھی رہنا کچھ اچھا نہیں	جانے کتنے یوں ہی بے زباں ہو گئے
میں نے سنا کہ آپ کو مجھ سے ہیں بدگمانیاں	جھوٹ تو نہیں، مگر، سچ بھی نہ ہو خدا کرے

عرش ملسیانی

نام بالمکند، عرش تخلّص۔ ۲۰؍ستمبر ۱۹۰۸ء کو قصبہ ملسیان، ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جوش ملسیانی اردو کے معروف شاعر تھے۔ عرش ملسیانی کی ابتدائی تعلیم ان کے والد کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ بعدازاں میٹرک پاس کیا۔ پھر انجینرنگ کالج رسول سے اورسیری کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں محکمہ نہر میں ملازمت اختیار کی۔ شعر وسخن سے انھیں فطری مناسبت تھی۔ ۱۹۳۰ء میں ملازمت ترک کر کے گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول، لدھیانہ میں بحیثیت معلم مقرر ہوئے اور تقریباً ۱۴۔۱۵ برس تک اس ادارے میں کام کرتے رہے۔ اس دوران آپ نے پرائیوٹ طور پر ایف اے اور بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے بعد دہلی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے رسالہ ''آج کل'' کے عملۂ ادارت میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں جوش ملیح آبادی کے پاکستان آ جانے پر آپ ''آج کل'' کے مدیرِ اعلا ہو گئے۔ ۱۵؍دسمبر ۱۹۷۹ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ آپ کے دو مجموعہ کلام ''ہفت رنگ'' اور ''چنگ و آہنگ'' شائع ہو چکے ہیں۔

منتخب اشعار

کوئی اپنا نہیں یہاں اے عرشؔ!	سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا
بارگاہِ خزاں میں ایک ہیں سب	کوئی کانٹا ہوا کہ پھول ہوا
ہم کو قفس سے حکمِ رہائی تو مل گیا	اُڑنے کے واسطے ہے، مگر بال و پر کہاں
عشقِ بتاں کا لے کے سہارا کبھی کبھی	اپنے خدا کو ہم نے پکارا کبھی کبھی
زمانہ ہنستا ہے مجھ پر، ہزار بار ہنسے	تمھاری آنکھوں میں، لیکن یہ کیوں نمی آئی
چمن میں کون ہے پرسانِ حال شبنم کا	غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی
دیے جلائے امیدوں کے گرد بہت	کسی طرف سے نہ اس گھر میں روشنی آئی
عقل والے تو اُٹھا سکتے نہیں بارِ جنوں	کیا کوئی اہلِ محفل تم میں دیوانہ بھی ہے؟
یہ انساں کی بے چارگی ہائے توبہ	دعاؤں کے باقی ہیں اب تک سہارے
شعبدہ باز ہے تری صورت	دُور رہ کے بھی پاس رہتی ہے
کرنے کو رفو کر ہی لیں گے سب دنیا والے زخم اپنے	جو زخم دلِ انساں پہ لگا اُس زخم کا سینا مشکل ہے

آشیانہ ہی گلستاں میں نہیں   اب خزاں آئے یا بہار آئے
نہ حرم میں ہیں وہ نہ دَیر میں ہیں   ہم تو چاروں طرف پکار آئے

نسیم امروہوی

نام سیّد قائم رضا، تخلّص نسیم۔ ۲۴؍اگست ۱۹۰۸ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد بورڈ اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی، کامل، مولوی، عالم، فاضل ادب (مع انگریزی) فاضل فقہ اور نور اللّٰہ فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ شروع میں انھوں نے قائم تخلّص رکھا۔ ۱۹۲۳ء میں نسیم تخلّص اختیار کیا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے ۱۵؍مئی ۱۹۵۰ء کو لاہور آ گئے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کر کے ۱۹۵۰ء کے آخر میں خیر پور میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں اردو کی سب سے بڑی لغت کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں اپریل ۱۹۶۱ء سے ترقّیِ اردو بورڈ، کراچی سے ان کا تعلّق قائم ہوا۔ یہاں انھوں نے ۱۸ برس تک اردو لغت کی تحقیق و تدوین میں کام کیا۔ یکم ستمبر ۱۹۷۹ء کو اس ادارے سے ریٹائر ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کراچی کی سکونت ترک کر کے کوٹ ڈیجی (سندھ) کا رُخ کیا۔ انھوں نے تمام صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی، لیکن اُن کا اصل میدان مرثیہ ہے۔ وہ سَو سے زیادہ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ انھوں نے متعدّد علمی و ادبی کتابیں تصنیف کیں۔ ۲۸؍فروری ۱۹۸۷ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ’’روحِ انقلاب،‘‘ ’’سازِ حرّیت،‘‘ ’’برق و باراں‘‘ (طویل مسدس)، ’’نسیمِ اردو،‘‘ ’’نسیم اللغات،‘‘ ’’رئیس اللغات،‘‘ ’’مراثیِ نسیم‘‘ (حصہ اوّل، دوم اور سوم)، ’’تاریخِ خیر پور،‘‘ ’’فرہنگ اقبال‘‘ (اردو)، ’’فرہنگ اقبال‘‘ (فارسی)۔

منتخب اشعار

ابتدائے عاشقی میں دل بقدرِ غم نہ تھا   انتہائے عاشقی میں غم بقدرِ دل نہیں
یا یہ عالم تھا کہ منزل تھی، مگر مقصد نہ تھا   یا یہ حالت ہے کہ مقصد ہے، مگر منزل نہیں
یہ انتظار نہ ٹھہرا کوئی بلا ٹھہری   کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری
جو صبح ہو تو بتاؤں میں انتظار کی حد   ابھی تو رات ہے تاروں کو گن رہا ہوں میں

سحر، کنور مہندر سنگھ بیدی

نام کنور مہندر سنگھ بیدی، تخلّص سحر۔ ۹؍مارچ ۱۹۰۹ء کو منٹگمری (ساہیوال) میں پیدا ہوئے۔ پانچویں جماعت تک گورنمنٹ ہائی اسکول، منٹگمری میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد چیفس کالج، لاہور میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک تعلیم

پائی۔ چیفس کالج سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لیا۔ انھوں نے تاریخ اور فارسی کے ساتھ بی اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آئی سی ایس کا امتحان دیا، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ پہلی تقرری لائل پور میں ہوئی۔ وہاں جولائی ۱۹۳۴ء سے دسمبر ۱۹۳۵ء تک رہے۔ اس دوران انھوں نے ریونیو ٹریننگ لی اور محکمانہ امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۳۵ء کے آخر میں ان کا تبادلہ بطور فرسٹ کلاس مجسٹریٹ رہتک ہو گیا۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ ملتان، جالندھر، کانگڑہ، دہلی، سنگرور، کرنال ہوا اور وہ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ یہ گوڑگاؤں میں ڈپٹی کمشنر بھی رہے۔ تقریباً ۳۳ برس ملازمت کرنے کے بعد ڈائرکٹر، محکمہ پنچایت کے عہدے سے ۱۹۶۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی ایک کثیر الجہات شخصیت کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ ان تمام مشغلوں میں شاعری ان کا عزیز ترین مشغلہ رہا ہے۔ وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ ان کی شعر گوئی کی عمر تقریباً ساٹھ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ ان کی شخصیت ہشت پہلو تھی۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ترقی اُردو بورڈ کے نائب صدر تھے۔ وہ ۱۷؍جولائی ۱۹۹۸ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں:

''یادوں کا جشن'' (خود نوشت حالات زندگی)، ''کلام کنور مہندر سنگھ بیدی سحر'' (انتخاب و تلخیص، احمد فراز)۔

منتخب اشعار

دل کی دُنیا جو اُجڑتی ہے اُجڑ جانے دے
گھر یہ آباد ہوا کرتا ہے ویراں ہو کر

کھائے ہیں فریب اتنے کہ اپنوں کا تو کیا ذکر
غیروں سے بھی ہم کو تو شکایت نہیں ہوتی

دَیر و حرم میں چین جو ملتا
کیوں جاتے مے خانے لوگ

ہم خطا وار ہیں یہ تو بجا ہے، لیکن
کام دنیا میں کچھ اچھے بھی کیے ہیں یارب!

تقدیر کے لکھے سے سوا بن گئے ہیں ہم
بندہ نہ بن سکے تو خدا بن گئے ہیں ہم

دلِ برباد میں ایسے ہے تری یاد کا نور
ایک سُنسان سے مندر میں دیا ہو جیسے

اختر انصاری دہلوی

اختر انصاری نام، اختر تخلص۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کو اپنے آبائی وطن بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کئی سال اسسٹنٹ سول سرجن کے عہدے پر دہلی میں مامور رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے دہلی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ اختر انصاری نے دہلی میں ہوش سنبھالا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۳۰ء میں دہلی یونیورسٹی

سے بی اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں ٹریننگ کالج علی گڑھ سے بی ٹی پاس کر کے مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میں انگریزی کے استاد مقرر ہو گئے۔ اِس دوران اردو ادب کا مطالعہ بھی جاری رہا اور تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے علی گڑھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ بعدازاں مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج میں لکچرر کے عہدے پر مامور ہو گئے۔ اختر انصاری قطعہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ شاعر کے علاوہ افسانہ نگار اور نقاد بھی تھے۔ ۶/اکتوبر ۱۹۸۸ء کو علی گڑھ میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''نغمۂ روح''، ''آبگینے''، ''خوناب''، ''تنقیدی شعور''، ''روحِ ادب''، ''روحِ عصر''، ''سرودِ جاں''، ''ٹیڑھی زمین''، ''شہرِ غزل'' اُتر پردیش اُردو اکادمی (لکھنؤ) نے ان کے مجموعی خدمات پر انعام دیا۔

منتخب اشعار

یادِ ماضی عذاب ہے یارب — چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

نہیں معلوم کیا ہونا ہے انجام — بہت رنگیں ہے آغازِ محبت

پرانی شمعیں بجھا دیں ہوا کے جھونکوں نے — نئے چراغ جلاؤ بہار کے دن ہیں

مرے دھڑکتے ہوئے دل پہ ہاتھ رکھ دے کوئی — کہ آج تھوڑی سی تسکین چاہتا ہوں میں

کامیابی محال ہے اختر — ذوق اتنا بلند رکھتا ہوں

چاندنی رات میں قرار کہاں — چوٹ کھائی ہوئی طبیعت کو

چھیڑا جو تُو نے ساز کے پردوں کو سچ کہوں — محسوس یہ ہوا کہ مری جاں نکل گئی

مرے پڑوس میں یہ ذکر ہے کئی دن سے — صدا جو آتی تھی رونے کی اب نہیں آتی

میرے ساقی کی مست آنکھوں سے — گر رہی ہے شراب چھن چھن کے

سننے والے فسانہ تیرا ہے — صرف طرزِ بیان میرا ہے

کون سمجھے گا میرے درد کو آہ — روح کا زخم کس نے دیکھا ہے

اعتبارِ نغمۂ مانوس اِس درجہ بڑھا — جو ہوئے آہنگِ نو سے نغمہ خواں، مارے گئے

وہ فریبِ آرزو ہی کیوں نہ ہو — ہم کو جینے کا سہارا چاہیے

حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو — مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

قدم اُٹھاؤ کہ پیدا کریں نئی راہیں — کہاں تلاش کریں ہم نشاں مٹائے ہوئے

حالِ دل پوچھ کر رُلا دے کوئی — پھر طبیعت میں کچھ گرانی ہے

کلثوم، شہزادی

نام شہزادی کلثوم، تخلّص کلثوم۔ ۱۹۰۸ء میں جے پور میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۴۹ء میں سری نگر میں انتقال کر گئیں۔ غالباً ریاست جموں اور کشمیر کی پہلی اردو شاعرہ ہیں۔ ''حرفِ جنوں'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ چھپ گیا ہے۔

منتخب اشعار

محو تھی تیری یاد میں کلثوم — موت کب آ گئی خدا جانے

کعبے سے بت روٹھ کے آئے صنم خانے میں — اب کہاں روٹھ کے جائیں گے صنم خانے سے

ہر قطرہ ہے تلاطمِ دریا کی یادگار — ہر ذرّہ ہے نمودِ بیاباں لیے ہوئے

نور، نور الصّباح بیگم

نام نور الصّباح بیگم، تخلّص نور۔ ۲ر اپریل ۱۹۰۸ء کو سابق ریاست رام پور کے ایک متموّل پٹھان خاندان میں پیدا ہوئیں۔ رسمِ بسم اللہ کے بعد ان کے والد نے ان کی تعلیم کے لیے ایک ماسٹر مقرر کر دیا۔ یہ بات خاندانی روایت کے خلاف تھی، لیکن والد کی خواہش پر نور الصّباح بیگم نے نہ صرف قرآن شریف پڑھا، بلکہ اردو، فارسی، انگریزی، حساب اور دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ وہ تحریکِ پاکستان کی سرگرم رکن رہیں۔ ۷ار ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان آ گئیں۔ ۱۹۵۱ء میں صوبہ سندھ کی طرف سے آل پاکستان مسلم لیگ کونسل کی ممبر منتخب ہوئیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب نور الصّباح بیگم کراچی آ گئیں تو کئی برس تک مہاجرین کی فلاح و بہبود کے لیے دن رات کام کرتی رہیں۔

سیاست کے علاوہ ان کو ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ان کا پہلا مضمون لاہور کے ایک رسالے میں شائع ہوا۔ انھوں نے ناولیں بھی تصنیف کیں، نام یہ ہیں: ''گریزاں''، ''گردشِ دوراں''، ''یادوں کے چراغ''۔ ''روزنامہ ''جنگ'' اور ''اخبارِ جہاں'' میں سیاسی، ادبی اور معاشرتی موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے ۱۴ر اگست ۱۹۹۲ء کو گولڈ میڈل دیا اور ۲۰۰۲ء میں محکمہ ڈاک نے یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ بیگم نور الصّباح کا انتقال ۱۴ر جولائی ۱۹۷۸ء کو کراچی میں ہوا۔ آپ نے سوز شاہجہاں پوری سے گاہے گاہے اپنے کلام پر اصلاح لی، لیکن زیادہ تر اپنے شعور اور وجدان کو رہبر بنایا۔ آپ کے شعری مجموعے کا نام ''صبح غزل'' ہے۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں: ''گریزاں''، ''گردشِ دوراں''، ''نورِ مشرق'' اور ''تحریکِ پاکستان اور خواتین''۔

منتخب اشعار

اُدھر اُن کا ذرا اٹھنا مریضِ غم کی بالیں سے — یکایک چشمِ غم کا اس طرف بے نور ہو جانا
کیا پوچھتے ہو بزمِ تصور کی رونقیں — فردوس بن گیا ہے بیاباں کبھی کبھی

روش صدیقی

نام شاہد عزیز صدیقی، تخلص روش۔ ۱۰؍جولائی ۱۹۱۱ء کو جوالا پور، ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ ہردوار کی درس گاہ گروکل کانگڑی بھی یہیں ہے جہاں روش نے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ روش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اردو، فارسی، عربی کی تعلیم روش نے اپنے والد طفیل احمد شاہد سے حاصل کی۔ روش کو شاعری میں اپنے والد سے تلمذ حاصل تھا۔ روش سنسکرت، ہندی اور انگریزی بھی جانتے تھے۔ روش نے ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد جوالا پور میں ناخوشگوار حالات کی بنا پر مراد آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ ۵۶۔۱۹۵۵ء میں مراد آباد سے دہلی آئے اور آل انڈیا ریڈیو میں اردو کے چیف پروڈیوسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے بلجیم میں بین الاقوامی ادبی کانفرنس میں حکومت ہند کی نمائندگی کی۔ ۱۹۶۴ء میں وہ میرٹھ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ۲۲؍جنوری ۱۹۷۱ء کو روش صدیقی ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے شاہجہان پور گئے۔ مشاعرے میں کلام سناتے ہوئے دل کا شدید دورہ پڑا۔ ساڑھے چار بجے علی الصبح ۲۳؍جنوری ۱۹۷۱ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ دوسرے روز میرٹھ میں دفن ہوئے۔ ان کا مجموعہ غزلیات ''محرابِ غزل'' ۱۹۵۹ء میں دلّی سے شائع ہوا۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ منتظرِ اشاعت ہے۔

منتخب اشعار

ہوس کو آ گیا ہے گُل کھلانا — ذرا اے زندگی! دامن بچانا
فریبِ آرزو کی انتہا ہے — کسی افسردہ دل کا مسکرانا
حسن خود بیں کو ازل سے تھی کسی کی جستجو — زندگی نے کیوں مری جانب اشارہ کر دیا
حُسن کے رُخ پر تو اے منصور پردہ ہی رہا — عشق کی مجبوریوں کو تُو نے رسوا کر دیا
زندگی کیوں ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے — کبھی آیا ہے، جواب آئے گا پیغام اُن کا
حُسنِ خلوصِ لغزشِ آدم تو دیکھیے — ویرانۂ جہاں کو گلستاں بنا دیا
خوبیِ دولت و دانش پہ نظر ہے سب کی — کوئی اِس دَور میں دلدادۂ انساں نہ مِلا
یہ کون مسندِ عشرت سے مستِ خواب اُٹھا — کہ جھانکتا ہوا مشرق سے آفتاب اُٹھا

نہ دیکھنے دیا کچھ مجھ کو شوقِ بے حد نے — ہزار پڑ گئے پردے جو اک حجاب اُٹھا

نہ اب سکوں ہی مرا ہے نہ اضطرار مرا — عجیب حال ہوا اے نگاہِ یار مرا

خزاں کے ساتھ بہت دور مجھ کو جانا ہے — نہ انتظار کر اے محفلِ بہار مرا

کس کس عنواں سے بھلانا انھیں چاہا تھا روشؔ — کسی عنواں سے، مگر ان کو بھلایا نہ گیا

مرا ذوقِ سفر ہے بے نیازِ جادۂ منزل — نہ کوئی راہبر میرا نہ کوئی راہزن میرا

حرم والوں نے سمجھا زندگی بھر اجنبی مجھ کو — صنم خانے میں اب تک منتظر ہے برہمن میرا

منتظر ہیں ابھی تیرے لیے لاکھوں جلوے — تُو ذرا وسعتِ دامانِ نظر پیدا کر

بہت بلند ہے دل کا مقام خودداری — مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ازل سے حُسن ہے آمادۂ کرم، لیکن — ہنوز عشق کے لب پر کوئی سوال نہیں

وہ کوئی نالۂ غم ہو کہ نغمۂ عشرت — شکستِ دل کی صدا کے سوا کچھ اور نہیں

ہوا نہ تکملۂ حسرتِ دلِ رنگیں — تمام عمر چھلکتا رہا یہ پیمانہ

دلِ حزیں کو تلاشِ خلوص ہے بے سود — کہ اِس دیار میں شاید یہ رسم ہی نہ رہی

اتنا بھی ہوش کس کو تری جستجو میں تھا — کب سر جھکا کے گردشِ دوراں گزر گئی

غمِ پنہاں کی نہ ہو جائے کہیں پردہ دری — آہ رہنے دو یہ اندازِ پشیماں نظری

مدّتوں سے ہے کسی عالمِ خاموش میں عشق — گریۂ نیم شبی ہے نہ دعائے سحری

اہلِ منزل! یہ وقفۂ آرام — اعترافِ شکستہ پائی ہے

محبت اک تپشِ ناتمام ہوتی ہے — نہ صبح ہوتی ہے اس کی نہ شام ہوتی ہے

جو راہ اہلِ خرد کے لیے ہے لامحدود — جنونِ عشق میں وہ چند گام ہوتی ہے

کھینچ لے جائے جو ترے در تک — ایسی دیوانگی کو کیا کہیے

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ امید — ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے

کچھ مرا حال سناتی ہے مری خاموشی — کچھ تری نیم نگاہی سے عیاں ہوتا ہے

جنوں ہر رنگ میں مسرور و شاداں — خرد ہر حال میں چیں بر جبیں ہے

مجھ کو گناہگارِ تمنا کیا روشؔ — معصومیٔ نوازشِ بیگانہ وار نے

وامق جون پوری

نام سیّد احمد مجتبیٰ، تخلّص وامق۔ ۲۳؍اکتوبر ۱۹۰۹ء کج گاؤں، ضلع جون پور میں پیدا ہوئے۔ بی اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد ہندوستان میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ خطاطی، مصوری، اور باغبانی ان کے مشاغل تھے۔ عراق و ایران اور سوویت یونین کا سفر ۱۹۵۰ء اور ۱۹۸۱ء میں کیا۔ ۲۱؍نومبر ۱۹۹۸ء کو کج گاؤں، ضلع جون پور میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں: ''جرس''، ''چیخیں''، ''شب چراغ''، ''سفر ناتمام''، ''شب چراغ'' پر اُتر پردیش اردو اکادمی کا انعام ملا۔ ان کے ادبی خدمات پر آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ کا اعزاز میر بھی ملا۔

منتخب اشعار

جھوٹ سے روشن تھا حسرت کا دیا
سچ نے سولی پر ہمیں لٹکا دیا

سب کے سب واعظ بنے ہیں، بادہ کش کوئی نہیں
مَے کدے میں اب وہ قدرِ لغزشِ پیہم کہاں

یوں جزوِ زندگی ہوئی جاتی ہے تیری یاد
جیسے کوئی شراب ملا دے شراب میں

نہیں ملتے تو اک ادنا شکایت ہے نہ ملنے کی
مگر مِل کر نہ ملنے کی شکایت اور ہوتی ہے

یہ مانا حُسن کی فطرت بہت نازک ہے اے وامق
مزاجِ عشق کی، لیکن نزاکت اور ہوتی ہے

پابندیوں میں تھے تو دکھاتے تھے معجزے
آزادیوں میں شعبدہ گر ہو کے رہ گئے

ضبطِ غم آج بہت کام آیا
ہنس دیے ہم جو ترا نام آیا

قریب تھے تو قیامت کا لطف آتا تھا
ہوئے جو دور تو یادوں کا حشر برپا ہے

آہن نہیں کہ چاہیے جب موڑ دیجیے
شیشہ ہوں مڑ تو سکتا نہیں توڑ دیجیے

خود فریبی سے حسیں تر نہیں کوئی جذبہ
خوش جو رہنا ہے تو یہ دھوکا بھی کھاتے رہنا

پرویز شاہدی

نام سیّد اکرام حسین، پرویز شاہدی قلمی نام۔ ۳۰؍ستمبر ۱۹۱۰ء کو لوری کڑہ، پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ درسِ نظامیہ (عربی اور فارسی) کی تعلیم اساتذہ کی نگرانی میں گھر پر حاصل کی۔ میٹرک کلکتہ سے کیا۔ بعدازاں پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور یہاں سے بی اے اور ایم اے (اردو اور فارسی) اور قانون (ایل ایل بی) کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے وکالت کی جگہ درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ شروع میں کچھ عرصہ اسلامیہ ہائی اسکول کلکتہ اور

دوسرے اسکولوں میں ٹیچر رہے۔ اسی دوران بی ٹی کی سند لی۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک مدنا پور کالج میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں سریندر ناتھ کالج کلکتہ میں فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے، لیکن جلد ہی یہاں کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ۱۹۴۹ء میں وہ کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی پاداش میں ڈیڑھ سال قید و بند میں رہے۔ اس کے بعد دو اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ بعد ازاں رپن کالج، کلکتہ میں لکچرر کے عہدے پر تقرر ہو گیا۔ ماہ نامہ ''جدید اردو'' کلکتہ بارہ سال تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی، لیکن رباعی ان کا محبوب موضوعِ سخن تھا۔ انھیں ثمر آروی اور ثاقب عظیم آبادی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۵ رمئی ۱۹۶۸ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ''رقصِ حیات'' اور ''شکستِ حیات'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔

منتخب اشعار

کتنے اصنامِ ناتراشیدہ ۔۔۔ پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں

بے جلائے ہوئے دیے کتنے ۔۔۔ رات ہوتے ہی جھلملاتے ہیں

راہ گذر ہی راہ گذر ہے راہ گذر سے آگے بھی ۔۔۔ ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے حدِ نظر سے آگے بھی

وقت گزرا جو بے خیالی میں ۔۔۔ وہ ترے ہی خیال میں گزرا

شاید نگاہ پہنچے اب وسعتِ زمیں تک ۔۔۔ پلٹا تو ہے تصور تنگ آ کے آسماں سے

تنظیم اہلِ بزم سے قائم ہے روشنی ۔۔۔ ہم شمعِ انجمن ہیں نہ تم شمعِ انجمن

عدم، عبد الحمید

نام سیّد عبد الحمید، تخلص عدم۔ ۱۰ راپریل ۱۹۱۰ء کو تلونڈی، موسیٰ خاں، ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس کے محکمے میں ملازم ہو گئے اور اکاؤنٹس افسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں ملک سے باہر بھی رہے۔ نظم، غزل، قطعہ میں طبع آزمائی کی، لیکن غزل سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ عدم ایک مقبول عوام غزل گو شاعر تھے۔ ''نقشِ دوام'' عدم کا اولین مجموعہ کلام تھا۔ اس کے بعد ان کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔ چند نام یہ ہیں: ''خرابات،'' ''چارۂ درد،'' ''زلفِ پریشاں،'' ''سرو سمن،'' ''گردشِ جام،'' ''شہرِ خوباں،'' ''گلنار،'' ''عکسِ جام،'' ''رمِ آہو،'' ''بطِ مے،'' ''نگار خانہ،'' ''سازِ صدف،'' ''رنگ و آہنگ۔''
۱۰ رمارچ ۱۹۸۱ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

کوئی یزداں ہے یہاں کوئی فرشتہ ہے یہاں	کیا بُرائی تھی اگر آدمی انساں ہوتا
کہتے ہیں عمرِ رفتہ کبھی لوٹتی نہیں	جا مے کدے سے میری صراحی اُٹھا کے لا
میں مے کدے کی راہ سے ہوکر نکل گیا	ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا
بہت سوال نہ کر مجھ سے داورِ محشر!	کہ میں بھی کوئی ادق سا سوال کردوں گا
کسی نے پوچھا اگر مجھ سے زیست کا مفہوم	بڑے خلوص سے جامِ شراب دے دوں گا
عدمؔ بہت ہی اگر روٹھنے لگی امید	کسی کے وعدے پہ پھر اعتبار کرلوں گا
اُن کو عہدِ شباب میں دیکھا	چاندنی کو شراب میں دیکھا
بہت سخت ہے راستہ زندگی کا	ذرا دو قدم آپ بھی آیئے گا
یہ نازک سا سہارا ٹوٹ ہی جائے تو بہتر ہے	عدمؔ کب تک جئیں ٹوٹے ہوئے دل کے سہارے پر
اے عدمؔ! سب گناہ کر، لیکن	دوستوں سے ریا کی بات نہ کر
کاروانوں کو لوٹنے کے لیے	رہزنوں نے دیے جلائے ہیں
شاید وہ اپنے ہونے کا کوئی ثبوت دے	اس مصلحت سے منکرِ یزداں رہا ہوں میں
سنو فسانۂ عہد بہار کانٹوں سے	یہ باخبر یہاں عمریں گزار بیٹھے ہیں
شام ہے آ وَ لبِ جُو بیٹھ کر باتیں کریں	کچھ پیئیں، کچھ گردشِ ایام کی باتیں کریں
ہم کو شاہوں سے عدالت کی توقع تو نہیں	آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں
جملہ اسبابِ جہاں پر ہے تغیّر حاوی	اک محبت ہے کہ ہر وقت جواں رہتی ہے
مجبوریوں پر اشک بہانا کبھی کبھی	جُز اس کے اور کیا ہے مرے اختیار میں
مے کدہ ہے یہاں سکوں سے بیٹھ	کوئی آفت اِدھر نہیں آتی
سوال کر کے میں خود ہی بہت پشیماں ہوں	جواب دے کے مجھے اور شرمسار نہ کر
شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ	محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں
تخلیق کائنات کے دلچسپ جُرم پر	ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی
گھنے آبادیوں میں رہ کے بھی ہم نے یہ دیکھا ہے	کہ جیسے آدمی گنجان ویرانوں میں رہتا ہے
لوگ یزداں کو بیچ دیتے ہیں	اپنا مطلب نکالنے کے لیے

خدا کا آسرا تم دے گئے تھے — خدا ہی آج تک کام آ رہا ہے

آئیے کوئی نیک کام کریں — آج موسم بڑا گلابی ہے

اُن کو اُداس دیکھ کے ہوتا ہے یہ گماں — جیسے کوئی بہار کا لمحہ اُداس ہے

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ — یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

جب بھی کسی نے ہنس کے مروّت سے بات کی — دل سے تمام عمر کے غم دور ہو گئے

کچھ اس ادا سے نسیمِ بہار گزری ہے — کہ جیسے رحمتِ پروردگار گزری ہے

آ اے غمِ دوراں! درِ مے خانہ ہے نزدیک — آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے

جیسا کہ ہے انسان عجب طرفہ تماشا — ایسا کوئی مجموعۂ اضداد نہیں ہے

یہ اہتمام چراغاں، بجا سہی، لیکن — سحر تو ہو نہیں سکتی دیے جلانے سے

موت نے زندگی کی ٹہنی سے — پھر کوئی تازہ پھول توڑا ہے

رضا ہمدانی

نام مرزا رضا حسین اور رضا تخلص تھا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۱۰ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ کلام مجید کے چھ پارے حفظ کرنے کے بعد ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں منشی فاضل اور پشتو فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ رضا ہمدانی اردو کے علاوہ فارسی، ہندکو اور پشتو میں بھی شعر کہتے تھے۔ کئی رسائل کے مدیر رہے۔ انھوں نے ہندکو فلموں ''قصہ خوانی'' اور ''بدمعاش'' کے لیے گیت بھی لکھے۔ رضا ہمدانی کی تصانیف ایک درجن کے قریب ہیں جو ادبی، ثقافتی اور تاریخی وسوانحی، دینی و مذہبی موضوعات سے متعلق ہیں۔ ان کی بعض تصانیف پر رائٹرز گلڈ، اباسین آرٹ کونسل اور یونیسکو کی جانب سے انعامات مل چکے ہیں۔ ''رگِ مینا'' اور ''صلیبِ فکر'' ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں۔ رضا ہمدانی ۱۰ر جولائی ۱۹۹۴ء کو پشاور میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

دمک اُٹھی ہے یہ رات کی جبیں کیسے — یہ روشنی کہیں بجھتے چراغ کی تو نہیں؟

تمام عمر اُسی کی تلاش میں گزری — وہ ایک عکس جو آئینۂ نظر میں نہ تھا

بھنور سے لڑو، تیز لہروں سے اُلجھو — کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

اس طرح آنکھ سے ٹپکا ہے لہو — شاخ سے پھول گرا ہو جیسے

ہم نے ہر سُو جلا دیے ہیں چراغ	قافلے بے خطر گزر جائیں
ابھی دکھاؤ نہ مجھ کو وفا کا آئینہ	ابھی میں سوچ رہا ہوں، ذرا ٹھہر جاؤ

انجم فوقی بدایونی

نام ظہور محمد، انجم تخلص۔ ۱۱رجنوری ۱۹۱۱ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ سلسلۂ فوقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بعدازاں طبیہ کالج، کلکتہ اور طبیہ کالج، علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۷ء میں کراچی آ گئے۔ انجم فوقی کو حضرت فوق سبزواری سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ کی غزلوں کے دو شعری مجموعے ''اُجالے'' اور ''مہر و ماہ'' شائع ہو چکے ہیں۔ ''مخاطبات''، ''مکاشفات''، ''ملاحظات''، ''معاملات''، ''فکر و فن'' (عروضی اصلاحات) اور ''انکشاف''، (مکتوبات) آپ کی نثری کتابیں ہیں۔ آپ کے کلام اور مکتوبات کا انگریزی ترجمہ 'وژن' (Vision) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کئی ماہ ناموں کے مدیر بھی رہے۔ انجم فوقی بدایونی ۱۱راگست ۱۹۹۵ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

منتخب اشعار

فاصلہ قرب کی آبرو ہے	قرب جب تک نہ ہو فاصلہ کیا
ہزاروں اندھیرے، درِ آشیاں تک	اُجالا کرے ایک بجلی کہاں تک
اچھا ہوں جس حال میں ہوں	لیکن یہ احساس بھی کیوں
اہلِ دل شدّتِ غم سے کبھی گھبراتے ہیں	اوس پڑتی ہے تو پھول اور نکھر جاتے ہیں
یہ کون سا مقامِ طلب ہے کہ تم بغیر	پہلے تو کچھ ملال تھا اب کوئی غم نہیں
پتا پتا سوکھ چکا ہے	شاخیں چھاؤں کہاں سے لائیں
حق گوئی کا دور نہیں ہے	انجم آپ بھی چُپ ہو جائیں
یہ سمجھ لیں مجھے بیگانہ سمجھنے والے	لالہ و گل ہی نہیں خار بھی کام آتے ہیں
بعض کو ٹھوکریں کھا کر ہی سمجھ آتی ہے	کوئی پتھر تو سرِ راہ پڑا رہنے دو
سکونِ عارضی انعامِ فطرت ہی سہی، لیکن	یہیں سے جرأتِ پرواز پر الزام آتا ہے
محبت ایک لامحدود مجبوری سہی، لیکن	یہی مختارِ فطرت بھی بنا دیتی ہے انساں کو
غمِ زندگی کو قیامت نہ کہیے	قیامت تو اک قصہ مختصر ہے

جہانِ خیر وشر میں جانے کس شے کی ضرورت ہو — سکونِ دل سے پہلے اک خلش بھی مانگ لی ہم نے
جہانِ رنگ و بو میں پھول بھی ملتے ہیں کانٹے بھی — سوال اس بات کا ہے کون کس کے کام آتا ہے

نعیمی، عبدالحفیظ

نام عبدالحفیظ اور تخلص نعیمی تھا۔ ۱۵؍جنوری ۱۹۱۱ء کو موضع کرگناں، ضلع پیلی بھیت (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی ابتدا ایک مکتب سے ہوئی جہاں کچھ اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر ایک اسکول تھا۔ اس اسکول سے ساتویں درجے کا امتحان پاس کر کے مزید تعلیم کے لیے ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول، پیلی بھیت میں داخلہ ہوا۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں اول پوزیشن حاصل کر کے ہائی اسکول پاس کیا۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں پرائیویٹ طور پر بی اے پاس کیا۔ ان کے اصرار پر ان کے والد نے ان کو علی گڑھ بھیج دیا جہاں انھوں نے ایم۔ اے اور قانون کے امتحانات پاس کیے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔

زمانۂ طالبِ علمی ہی میں نعیمی نے شاعری شروع کر دی تھی۔ جگر مرادآبادی سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں:

نظم: ''نجمِ درخشاں''، ''مرثیہ اندلس'' (حصہ اوّل)، ''محرابِ گل'' (شعری مجموعہ)، ''روزنِ خواب'' (شعری مجموعہ)۔

نثر: ''سرشارِ محبت''، ''مجاہدِ اسلام''۔

منتخب اشعار

کیوں چڑھاتے ہو مجھ کو سولی پر — میں نے تو سچ کبھی نہیں بولا
میں رکا ہی تھا کہ لے لوں سائے میں دم بھر کو سانس — ایک پتھر دفعتاً سر پر مرے آ کر لگا
لگا جو پیٹھ میں نیزہ تو سمجھے دشمن ہے — مگر پلٹ کے جو دیکھا تو آشنا نکلا
توڑ کر پھینکو نعیمی آگہی کا آئینہ — آگہی کا آئینہ بھی دیتا ہے دھوکا بہت
تم پہ کب الزام تھا، تم کس لیے شرما گئے — لوگ یوں ہی ہنس رہے تھے لے کے دیوانے کا نام
پرستارانِ مے خانہ حرم میں سر بہ سجدہ ہیں — یہ گمراہی نہیں ہے، گردشِ ایام ہے ساقی
میں مڑ کر دور تک یوں دیکھتا ہوں — پکارا ہو مجھے جیسے کسی نے
اب تو آجاؤ کہ سازِ زندگی میں کچھ نہیں — ایک بس تارِ نفس تھا، وہ بھی ٹوٹا جائے ہے

☆☆☆

مؤلّف

محمد شمس الحق یکم مارچ ۱۹۲۰ء کو قصبہ گروار، ضلع بلیا (یو پی)، بھارت میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ آف انڈیا، دہلی سے ملازمت کا آغاز کیا۔ وہ اگست ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے میں دوسرے ملازمین کے ساتھ کراچی آ گئے اور وفاقی وزارتِ صحت، اسلام آباد میں سیکشن افسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے کر ۱۹۸۰ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ اِس وقت کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

انھیں شعر و ادب سے لگاو اسکول کے زمانے سے ہے۔ باغ بانی ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ ہارٹیکلچر سوسائٹی آف پاکستان نے انھیں بہترین باغ (best garden) کا اوّل انعام دو دفعہ دیا۔ انھیں مختلف کھیلوں کے علاوہ موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ سے بھی لگاو رہا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے علاوہ انھوں نے تین جلدوں میں شاعری کا انتخاب موضوعات کے لحاظ سے کیا ہے جو ''گل ہائے رنگ رنگ'' کے نام سے نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ ان تین جلدوں میں لگ بھگ چودہ سَو شعرا کے تقریباً پندرہ ہزار اشعار زمانی ترتیب سے درج ہیں۔ جلدِ دوم اور جلدِ سوم میں تمام مشمولہ شعرا کا مختصر تعارف بھی شامل ہے۔

ان کی ایک اَور کتاب ''اردو کے ضرب المثل اشعار (تحقیق کی روشنی میں)'' ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی نے ۲۰۰۳ء میں طبع کی ہے۔

تاریخی و ادبی لطائف، دل چسپ اور سبق آموز تاریخی واقعات اور عام لطیفوں پر مبنی اُن کی مزید ایک کتاب ''دل چسپ'' کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔

☆☆☆

اشاریہ

ب

ص

ض

ط

ظ

ع

غ

ف

شعرائے جلدِ دوم

نمبر شمار — نام

آ

الف

☆☆☆